گیتا پرَوچن

یعنی

گیتا کی تشریح

ونوبا

مترجمہ

خواجہ ذکریا فیاضی

سرودے پستک بھنڈار - انبالہ چھاؤنی

اکھل بھارت سرو سیوا سنگھ پرکاشن راج گھاٹ کاشی

ناشر

موہن لال چھاچھڑا
سکریٹری گرام سیوا منڈل
گوپوری۔ وردھا

پہلی بار ۲۰۰۰
دوسری بار ۵۰۰۰
تیسری بار ۵۰۰۰
قیمت ڈیڑھ روپے

مطبوعہ
علمی الیکٹرک مشین پریس،
نمیانالہ بنارس
فون نمبر ۵۵۸

دیباچہ

میرے گیتا پر وچنوں کا اردو ترجمہ، اردو جاننے والوں کے لئے شائع ہو رہا ہے، اس سے مجھے خوشی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جب میں دھولیا جیل میں سیاسی قیدی تھا، یہ پروچن کارکنوں کے سامنے دیئے گئے تھے۔ ان میں مفادِ عام کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

ان میں اصولی تخیلات کا سہارا ترک کئے بغیر، کسی "اِزم" میں نہ پڑتے ہوئے، روزمرہ کے کاموں کی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں گیتا کے اشلوکوں کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی فکر نہیں ہے۔ ایک ایک باب کے مقصد کے نچوڑ کا اظہار مدنظر ہے۔ گیتا کا نظریہ قائم رکھتے ہوئے بھی، گیتا کے اصطلاحی الفاظ کا استعمال کم سے کم کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے گاؤں والے مزدور بھائی بہن بھی اس میں اپنی محنت کا پھل پائیں گے۔

میری اس زندگی میں گیتا نے جو جگہ پائی ہے، اسے میں لفظوں میں ادا

نہیں کر سکتا۔ گیتا کا مجھ پر بے انتہا احسان ہے۔ روزانہ میں اس کا سہارا لیتا ہوں اور روز مجھے اس سے مدد ملتی ہے۔ اس کا مطلب، جیسا میں سمجھتا ہوں، ان پروچنوں میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ ترجمہ ہر ایک اردو داں کے گھر میں پہنچے اور پڑھا جائے، سُنا جائے اور اس پر غور کیا جائے۔

پوچم پلّی
۳۰ر جنوری ۱۹۵۶ء

وِنوبا

فہرست مضامین

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

گیارہواں باب

دیدارِ خدا بہ شکلِ کائنات ۱۶۴ تا ۱۷۶

۵۵۔ اسے دیکھنے کی ارجن کی شدید خواہش ۱۶۴، ۵۶۔ چھوٹی شکل میں بھی کامل دیدار ممکن ہے ۱۶۷، ۵۷۔ عظیم کائناتی شکل سمجھ بھی نہ ہوگی۔ ۱۷۱، ۵۸۔ سب کا نچوڑ ۱۷۴

بارہواں باب

سگُن اور نرگُن بھگتی ۱۷۷ تا ۱۹۸

۵۹۔ باب چھ سے گیارہ: یکسوئی سے ہمہ گیری ۱۷۷، ۶۰۔ سگُن عاید اور نرگُن عاید: ماں کے دو بیٹے ۱۷۹، ۶۱۔ سگُن آسان اور محفوظ ۱۸۲، ۶۲۔ نرگُن کے بغیر سگُن بھی ناقص ۱۸۶، ۶۳۔ رام کی زندگی سے مثالیں ۱۸۸، ۶۴۔ کرشن کی زندگی سے مثالیں ۱۹۲، ۶۵۔ دونوں ایک ہی ہیں: ذاتی تجربہ ۱۹۵، ۶۶۔ اس لئے بھگت کے صفات پیدا کریں ۱۹۶

تیرہواں باب

روح اور غیر روح کا امتیاز ۱۹۹ تا ۲۲۱

۶۷۔ روح اور جسم کا امتیاز کرم یوگ میں معاون ۱۹۹، ۶۸۔ سدھا کا سنگھ بنیاد ۲۰۲، ۶۹۔ جسمانی محبت سے زندگی میں رکاوٹ ۲۰۶، ۷۰۔ وہ تو ہی ہے ۲۰۹، ۷۱۔ ظالموں کا اقتدار ختم ۲۱۱، ۷۲۔ پرماتما کی قوت پر یقین ۲۱۳، ۷۳۔ پرماتما کی طاقت کا بتدریج احساس ۲۱۴، ۷۴۔ بنیادی طریقۂ عبادت ۲۱۹

سترہواں باب

اٹھارہواں باب

گیتا پرَوَچن

پہلا باب

تمہید ارجن کی آزردگی

(1) مہابھارت کے بیچ

پیارے بھائیو!

آج سے میں شری مد بھگوت گیتا کے بارے میں کچھ کہنے والا ہوں۔ گیتا سے میرا لگاؤ دلیل اور حجت سے بالاتر ہے۔ میرا جسم ماں کے دودھ سے جتنا پلا ہے، اس سے کہیں زیادہ میرا دِل و دماغ دونوں گیتا کے دودھ سے پروان چڑھے ہیں۔ جہاں دِلی لگاؤ ہوتا ہے، وہاں دلیل اور حجت کی گنجائش نہیں رہتی۔ دلیل سے قطع نظر عقیدت اور ریاضت ان دو بازوؤں سے ہی میں گیتا کے آسمان پر اپنے مقدور بھر پرواز کرتا رہتا ہوں۔ میں اکثر گیتا ہی کے ماحول میں رہتا ہوں۔ گیتا میری زندگی کی روحِ رواں ہے۔ جب میں گیتا کے سلسلہ میں کسی سے بات کرتا ہوں، تو گیتا کے سمندر میں تیرتا ہوں اور جب

اکیلا ہوتا ہوں، تو آب حیات کے اس سمندر میں گہری ڈبکی لگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ طے ہوا ہے کہ میں ہر اتوار کو اس مادرِ گیتا کا کردار آپ لوگوں کو سناؤں۔

گیتا کا ذکر مہا بھارت میں کیا گیا ہے۔ گیتا مہابھارت کے درمیانی حصہ میں ایک اونچے چراغ کی طرح قائم ہے، جس کی روشنی سارے مہابھارت پر پڑ رہی ہے۔ ایک طرف چھ جزو، دوسری طرف بارہ جزو، ان کے درمیانی حصہ میں؛ اسی طرح ایک طرف سات دستے فوج اور دوسری طرف گیارہ دستے، ان کے بھی درمیانی حصے میں گیتا کا وعظ دیا جا رہا ہے۔

مہابھارت اور رامائن ہماری قومی کتابیں ہیں۔ ان میں مذکورہ ہستیاں ہماری زندگی میں یک رنگ ہو گئی ہیں۔ رام، سیتا، دھرم راج، دروپدی، بھیشم، ہنومان وغیرہ رامائن اور مہا بھارت کے کیرکٹروں نے ساری بھارتی زندگی ہزاروں برسوں سے مسحور کر رکھی ہے۔ دنیا کی دوسری چوٹی کی کلاسکی شاعری کے کریکٹروں میں یہ بات نہیں۔ اس لحاظ سے مہا بھارت اور رامائن بلا شبہ انوکھی کتابیں ہیں۔ رامائن اگر اصول و حکمت کا ایک لطیف خزانہ ہے، تو مہا بھارت ایک وسیع اور ہمہ گیر سماجیاتی خزینہ۔ ویاس دیو نے ایک لاکھ اشلوک لکھ کر بے شمار تصویروں، مرقعوں اور کرداروں کی مناسب تصویریں بڑی خوبی سے پیش کی ہیں۔ بالکل بے عیب تو خدا کے سوا کوئی نہیں ہے؛ لیکن اسی طرح صرف خطاوار بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، یہ بات مہابھارت بڑی وضاحت سے بتا رہی ہے۔ اس میں ایک طرف جہاں بھیشم اور یدھشٹھر جیسوں کے عیب دکھائے گئے ہیں، تو دوسری طرف کرن، دریودھن وغیرہ کی خوبیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مہا بھارت بتاتی ہے کہ انسانی زندگی سفید اور سیاہ تاروں کا ایک پردہ ہے۔ غیر جانب دار رہ کر ویاس جی اس عظیم الشان کائنات کی دھوپ چھاؤں کی تصویریں دکھلاتے ہیں۔ ویاس دیو کے اس انتہائی

بے لوث اور عظیم ادبی کمال کے باعث مہابھارت گویا سونے کی ایک بڑی کان بن گئی ہے، جس کو تلاش و تنقیہ کرکے بھرپور سونا لوٹ لیا جائے۔

ویاس دیو نے اتنی بڑی مہابھارت لکھی، لیکن انھوں نے خود اپنی طرف سے کچھ کہا ہے یا نہیں؛ اپنا کوئی خاص پیغام انھوں نے کسی جگہ دیا ہے؟ کس مقام پر ویاس جی کی سمادھی (محویت) لگی ہے؟ جگہ جگہ عرفانِ حق اور نصیحت کے دریا مہابھارت میں بہا دیئے ہیں، مگر اس تمام معرفت و نصیحت کا اور پوری کتاب کا خلاصہ اور راز بھی انھوں نے کہیں لکھا ہے؟ ہاں، ہاں لکھا ہے۔ ساری مہابھارت کا مکھّن ویاس جی نے بھگوت گیتا میں نکال کر رکھ دیا ہے۔ گیتا ویاس دیو کی اہم تعلیم اور ان کے غور و فکر اور ذہنی کاوشوں کا ماحصل ہے۔ اسی دلیل پر "منیوں میں ویاس میں ہوں" یہ قول پوری طرح ثابت ہوتا ہے۔ گیتا کو پرانے زمانے سے اُپ نشد کا درجہ ملا ہوا ہے: گیتا اُپ نشدوں کا بھی اُپ نشد ہے۔ کیونکہ سارے اُپ نشدوں کو دُوہ کر یہ دودھ گیتا کی شکل میں، بھگوان نے ارجن کے واسطے دنیا کو دیا ہے۔ زندگی کی ارتقاء کے لئے تقریباً ہر ضروری خیال گیتا میں آگیا ہے۔ اسی لئے باخبر اشخاص نے درست کہا ہے کہ گیتا دھرم کے گیان کا ایک خزانہ ہے۔ گیتا ہندو دھرم کی گو مختصر سہی، مگر مختصر کتاب ہے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ گیتا شری کرشن نے کہی ہے۔ اس عظیم تعلیم کو حاصل کرنے والا بھگت ارجن اس تعلیم میں اتنا یک رنگ ہوگیا کہ اسے بھی "کرشن" نام مل گیا۔ بھگوان اور بھگت کی یہ دلی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے خود ویاس جی اتنے محو ہو گئے کہ لوگ انھیں بھی "کرشن" نام سے جاننے لگے۔ کہنے والا کرشن، سننے والا کرشن، لکھنے والا کرشن ــــ اس طرح ان تینوں میں گویا وحدت پیدا ہوگئی۔ گیتا کی تقلید کرنے والے کو ایسی ہی محویت چاہیئے۔

۲ ارجن کی تمہید کا تعلق

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گیتا کی ابتدا دوسرے باب سے سمجھنی چاہیئے۔ دوسرے باب کے گیارہویں اشلوک سے اس واضح نصیحت کی ابتدا ہوتی ہے، تو وہیں سے آغاز کیوں نہ سمجھا جائے؟ ایک صاحب نے تو مجھ سے کہا ــ "بھگوان نے حروف میں "اکار" (الف) کو ایشور کا مظہر بتایا ہے۔ اِدھر دوسرے باب کے گیارہویں شلوک "اشوچیان نوشوچ ستوم" (جو بات لائقِ غم نہیں ہے، تو اس پر افسوس مت کر) کے شروع میں اتفاق سے حرفِ اکار (الف) آگیا ہے۔ اس لئے وہیں سے آغاز مان لینا چاہیئے۔" اِس دلیل کو ہم چھوڑ بھی دیں، تو بھی یہاں سے آغاز دوسرے نکات سے ماننا مناسب ہی ہے۔ تاہم اس نے پہلے کے تمہیدی باب کی عظمت برقرار رہتی ہے۔ ارجن کس سطح پر قائم ہے، کس بات کی تشریح کرنے کے لیے گیتا کی تشکیل ہوئی ہے، یہ اہم تمہید کے بغیر اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ارجن کی کمزوری و نامردی دور کرکے اسے لڑائی پر آمادہ کرنے کے لئے ہی گیتا کہی گئی ہے۔ ان کی رائے میں گیتا صرف کرم یوگ (راہِ عمل) ہی نہیں بتاتی ہے، بلکہ طریقِ جنگ کی بھی تشریح کرتی ہے۔ مگر ذرا سوچنے سے اس قول کی خامی ہمیں دکھائی پڑتی ہے۔ اٹھارہ دستے فوج لڑنے کے لئے تیار تھی، تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ ساری گیتا سُنا کر بھگوان نے ارجن کو اس فوج کی برابری کے لائق بنا دیا؟ گھبرایا ہوا تو ارجن تھا، نہ کہ وہ فوج۔ تو کیا ارجن کی لیاقت فوج سے کم تھی؟ یہ بات تو قیاس میں بھی نہیں آسکتی۔ ارجن جو لڑائی سے منحرف ہو رہا تھا، تو خوف کے باعث نہیں۔ سیکڑوں لڑائیوں میں اپنا جوہر دکھانے والا وہ بڑا سورما تھا۔ اتر کی گایوں کے اغوا کے معرکہ میں اس نے اکیلے ہی بھیشم، درونا چاریہ،

اور کرن کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ "ہمیشہ فاتح اور سب مردوں میں ایک ہی سچا مرد" ایسی اُس کی شہرت تھی۔ بہادری اور شجاعت اس کے روئیں روئیں سے ٹپکی پڑتی تھی۔ ارجن کو چھیڑتے اور اشتعال دینے کے لئے نامردی کا طعنہ تو کرشن نے بھی دے کر دیکھ لیا۔ لیکن ان کا وہ تیر بیکار گیا اور دوسرے ہی خیالات سامنے رکھ کر انھیں علم و معرفت سے متعلق کچھ دینے پڑے۔ تب یہ یقینی ہے کہ محض کمزوری و نامردی دور کرنے جیسا سیدھا سادا مقصد گیتا کا نہیں ہے۔

بعض کی رائے ہے کہ ارجن کے انسانی رجحان کو دور کر کے، اسے جنگ پر مائل کرنے کے لئے گیتا کہی گئی ہے۔ میری نگاہ میں ایسا کہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی چھان بین کرنے کے لئے پہلے ہمیں ارجن کے انحراف کا پس منظر دیکھنا چاہئے۔ اس کے لئے پہلے باب اور دوسرے باب کے ابتدائی اشلوکوں پر نظر رکھنے سے ہمیں بہت مدد ملے گی۔

ارجن جو میدانِ جنگ میں کھڑا ہوا، تو کار برآری کے ارادے اور فرض شناسی کے جذبات سے معمور تھا۔ جنگ و جدل اس کی خصلت تھی۔ جنگ کو ٹالنے کی تمام امکانی تدبیریں کی جا چکی تھیں، مگر وہ ٹل نہیں سکی تھی۔ کم سے کم مانگ کی تجویز اور شری کرشن جیسوں کی ثالثی اور صلح جوئی کی کوششیں بے کار جا چکی تھیں۔ ایسی حالت میں متعدد ملکوں کے راجاؤں کو اکٹھا کر کے اور کرشن جی سے اپنی رتھ بانی قبول کرا کر وہ میدان جنگ میں کھڑا ہو کر بہادرانہ حوصلہ اور جوش سے کرشن جی سے کہتا ہے ــــ "دونوں فوجوں کے بیچ میرا رتھ کھڑا کیجئے، جس سے ایک بار میں ان لوگوں کے چہرے تو دیکھ لوں، جو مجھ سے لڑنے کے لئے تیار ہو کر آئے ہیں۔" کرشن جی نے ایسا ہی کیا۔ ارجن چاروں طرف نگاہ دوڑاتا ہے تو اسے کیا دکھائی دیتا ہے؟ دونوں طرف اپنے ہی

ناتے رشتے داروں کا زبردست اجتماع! وہ دیکھتا ہے کہ دادا، باپ، لڑکے، پوتے، حقیقی رشتہ داروں کی چار پشتیں مرنے مارنے کے آخری ارادہ سے وہاں جمع ہوئی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ اس سے پہلے اسے ان باتوں کا اندازہ نہ ہوا ہو، مگر وہ یہ دو منظر کا کچھ دوسرا ہی اثر دماغ پر پڑتا ہے۔ رشتہ داروں کے اس اجتماع کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ اسے بہت بُرا لگتا ہے۔ آج تک اس نے مختلف لڑائیوں میں بے شمار بہادروں کو نیست و نابود کیا تھا۔ اس وقت اس کو بُرا نہیں لگا تھا، اس کا "گانڈیو" اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہیں گیا تھا، جسم میں کپکپی نہیں ہونے لگی تھی، اس کی آنکھیں خیرہ نہیں ہو گئی تھیں، تو پھر اسی وقت ایسا کیوں ہوا؟ کیا اشوک کی طرح اس کے من میں بھی اہنسا کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا؟ نہیں، یہ تو صرف عزیزوں کا موہ تھا۔ اس وقت بھی اگر گرو شاگرد اور حقیقی عزیز سامنے نہ ہوتے، تو اس نے دشمنوں کے سر گیند کی طرح اُڑا دیئے ہوتے۔ لیکن اس دنیاوی لگاؤ کے موہ نے اس کی فرض شناسی کو ہڑپ کر لیا اور اسے فلسفہ یاد آنے لگا۔ فرض شناس انسان مایا موہ میں مبتلا ہو جانے پر بھی، کھلم کھلا فرض ناشناسی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ اس کی کوئی خوب صورت تاویل کرنا چاہتا ہے۔ یہی حال ارجن کا ہوا۔ اب وہ بناوٹی دلیل دینے لگا کہ "جنگ بذاتِ خود ایک گناہ ہے، لڑائی سے خاندان تباہ ہوگا، دھرم کا خاتمہ ہوگا۔ خود رائی زور پکڑے گی، بدکرداری پھیل جائے گی۔ قحط آ پڑے گا، سماج پر طرح طرح کی مصیبتیں آ پڑیں گی۔" — وغیرہ مختلف دلیل دے کر وہ کرشن جی کو ہی اُلٹا سمجھانے لگا۔

یہاں مجھے ایک جج کا قصہ یاد آتا ہے۔ ایک جج تھا۔ اس نے سینکڑوں

مجرموں کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ لیکن ایک دن خود اس کا لڑکا قتل کے جرم میں اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس پر خون ثابت ہوا اور آپ ہی لڑکے کو پھانسی کی سزا دینے کی نوبت آگئی۔ تب وہ ہچکچانے لگا اور فلسفہ بگھارنے لگا ـــ" پھانسی کی سزا بڑی خلافِ انسانیت ہے۔ ایسی سزا دینا انسان کو زیب نہیں دیتا۔ اس سے مجرم کے سدھار کی امید مٹ جاتی ہے۔ خون کرنے والے نے خواہشِ نفس کے ماتحت جوش اور اشتعال میں خون کر ڈالا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے خون کا جنون اتر جانے پر اس شخص کو سنجیدگی کے ساتھ پھانسی کے تختے پر چڑھا کر مار ڈالنا انسانی سماج کے لئے بڑے شرم کی بات ہے ـــ بڑا کلنک ہے۔" وغیرہ دلیلیں وہ دینے لگا۔ اگر اپنا لڑکا سامنے نہ آیا ہوتا، تو جج صاحب بے کھٹکے زندگی بھر پھانسی کی سزا دیتے رہتے۔ مگر اپنے لڑکے کی محبت کے سبب جج صاحب ایسی باتیں کہنے لگے۔ وہ اندرونی آواز نہ تھی۔ محض موہ کا نتیجہ تھی۔" یہ میرا لڑکا ہے۔" اس ممتا کے جذبے سے وہ آواز نکلی تھی۔

ارجن کی حالت بھی اسی جج کی طرح ہوئی۔ اس نے جو دلیلیں دی تھیں، وہ غلط نہیں تھیں۔ پچھلی بڑی لڑائی میں ساری دنیا نے ٹھیک انھیں نتیجوں کو عیاں اور واضح طور پر دیکھا ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ ارجن کا عرفانِ حق نہیں بلکہ عقلی ڈھکوسلہ تھا۔ کرشن اسے جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اس پر دھیان نہ دے کر، براہِ راست اس کے موہ کے دفعیہ کی تدبیر شروع کی۔ ارجن اگر سچ مچ اہنسا کا قائل ہوگیا ہوتا، تو اسے چاہے کسی نے کتنے علم و معرفت کے راز بتائے ہوتے، تو بھی اصلی بات کا جواب ملے بغیر اس کا اطمینان نہ ہوتا۔ مگر ساری گیتا میں اس سوال کا جواب کہیں بھی نہیں دیا گیا۔ تاہم ارجن کی تسلی ہوگئی ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ارجن کا رجحان اہنسا۔

کا نہیں تھا۔ وہ جنگ پر مائل ہی تھا۔ لڑائی اس کی نگاہ میں اس کی فطرت اور فرضِ منصبی کا درجہ رکھتی تھی۔ جسے وہ موہ کے بس میں ہوکر ٹالنا چاہتا تھا۔ گیتا کا مقصدِ خصوصی اس موہ پر ہی ضرب کاری لگانا ہے۔

(۳) گیتا کا مقصد : موہ کو دور کرنا

ارجن اہنسا ہی کی نہیں، سنیاس کی بھی باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ کہتا ہے ــــ "اس خونی چھتری دھرم سے تو سنیاس ہی اچھا ہے۔" لیکن کیا یہ ارجن کے ضمیر کی آواز تھی؟ کیا یہی اس کی فطرت تھی؟ ارجن سنیاسی کا بھیس تو بڑے مزے سے بھر سکتا تھا، مگر ویسی فطرت کیسے بنا سکتا تھا؟ سنیاس کے نام پر اگر وہ جنگل میں جاکر رہتا، تو وہاں ہرن مارنا شروع کر دیتا۔ اس لئے بھگوان نے صاف صاف کہا ــــ "ارجن! تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں لڑوں گا نہیں، تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ آج تک تمہاری جو فطرت بنی ہوئی ہے، وہ تمہیں لڑائے بنا کبھی نہیں ماننے گی۔"

ارجن کو اپنا سودھرم (فرضِ منصبی) غیر مستحسن معلوم ہونے لگا۔ لیکن فرض کتنا ہی غیر مستحسن ہو، اسی دائرے میں رہ کر آدمی کو اپنی نشو و نما مکمل کرلینی چاہئے۔ کیونکہ اس میں رہنے سے ہی اس کا اپنا ارتقاء ہو سکتا ہے۔ اس میں فخر کا کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ تو ارتقاء کی کنجی ہے۔ فرضِ منصبی ایسی چیز نہیں کہ جسے بڑی سمجھ کر اختیار کرلیں اور چھوٹی سمجھ کر چھوڑ دیں۔ دراصل وہ نہ بڑا ہوتا ہے، نہ چھوٹا۔ وہ ہمارے مقدور بھر کا ہوتا ہے ــــ "اپنا دھرم (فرض) غیر مستحسن بھی اچھا ہے" گیتا کے اس قول میں لفظ دھرم کا مطلب ہندو دھرم، اسلام، عیسائی دھرم وغیرہ جیسا نہیں ہے۔ ہر شخص کا اپنا الگ الگ دھرم ہے۔ میرے سامنے یہاں پر جو دو سو اشخاص موجود ہیں، ان کے دو سو

دھرم ہیں۔ میرا دھرم بھی جو دس بارہ برس پہلے تھا، وہ آج نہیں ہے۔ آج کا دھرم دس برس بعد نہیں رہے گا۔ غور اور تجربہ سے جیسے جیسے رجحانات بدلتے جاتے ہیں، ویسے ویسے پہلے کا دھرم چھوٹتا جاتا ہے اور نیا دھرم اس کی جگہ لیتا جاتا ہے۔ ضد اور ہٹ سے کام نہیں چلتا۔

دوسرے کا دھرم چاہے کتنا ہی بہتر معلوم ہو، اسے اختیار کرنے میں میری فلاح نہیں ہے۔ سورج کی روشنی مجھے عزیز ہے۔ اس روشنی سے میں بڑھتا رہتا ہوں۔ سورج میری نگاہ میں قابلِ احترام بھی ہے۔ لیکن اس اسباب کی بنا پر اگر میں زمین پر رہنا چھوڑ کر اس کے پاس جانا چاہوں گا، تو جل کر خاک ہو جاؤں گا۔ اس کے خلاف زمین پر رہنا چاہے کتنا ہی بے کیف ہو، سورج کے سامنے زمین بالکل بے حقیقت ہو، وہ خود روشن نہ ہو، تو بھی جب تک سورج کی تیزی کو برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہ آجائے، تب تک سورج سے دور، زمین پر رہ کر ہی مجھے اپنی ترقی کر لینی ہوگی۔ مچھلیوں سے اگر کوئی کہے کہ "پانی سے دودھ قیمتی ہے، تم دودھ میں رہنے چلو"، تو کیا مچھلیاں اسے منظور کر لیں گی؟ مچھلیاں تو پانی میں ہی جی سکتی ہیں، دودھ میں مر جائیں گی۔

دوسرے کا دھرم آسان معلوم ہو، تو بھی اسے اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ اکثر اسے آسان سمجھ لینا محض قیاس ہی ہوتا ہے۔ گھر گرہستی میں بال بچوں کی ٹھیک دیکھ بھال نہیں ہو سکتی، اس لئے گھبرا کر اگر کوئی شخص سنیاس (فقیری) لے لے تو وہ ڈھونگ ہوگا اور گراں بھی پڑے گا۔ موقعہ پاتے ہی اس کی خواہشیں زور پکڑیں گی۔ دنیا کا بوجھ تو اٹھایا نہیں جاتا، اس لئے جنگل میں جانے والا پہلے وہاں چھوٹی سی کٹیا بنائے گا۔ پھر اس کی حفاظت کے لئے باڑ لگائے گا۔ ایسا کرتے کرتے وہاں بھی سوایا سنسار کھڑا کرنے کی نوبت آجائے گی۔ اگر سچ مچ دل میں ترکِ دنیا کی

خواہش ہو، تو پھر سنیاس بھی کون سی مشکل بات ہے؟ سنیاس کو آسان بتانے والا اسمرتی بچن (منقولات) تو ہے ہی، لیکن خاص بات رجحان کی ہے۔ جس کی جو اصل فطرت ہوگی، اسی کے مطابق اس کا دھرم ہوگا۔ بڑا، چھوٹا، آسان اور مشکل کا یہ سوال نہیں ہے۔ ارتقار صحیح ہونا چاہیئے۔ تبدیلی حقیقی ہونی چاہیئے۔

مگر بعض جذباتی لوگ پوچھتے ہیں ـــ "اگر فریضۂ جنگ سے سچ مچ سنیاس ہی بہتر ہے، تو پھر بھگوان نے ارجن کو سچا سنیاسی کیوں نہ بنا دیا؟ ان کے لئے کیا یہ ناممکن تھا؟" ان کے لئے ناممکن تو کچھ بھی نہ تھا، مگر اس میں ارجن کا جوہر ہی کیا رہ جاتا۔ خدا نے آزادی دے رکھی ہے۔ ہر آدمی اپنے لئے تدبیر کرتا رہے، اسی میں مزہ ہے۔ چھوٹے بچے خود تصویر بنانے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ انھیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ کوئی ہاتھ پکڑ کر ان سے بنوائے۔ استاد اگر بچوں کے سوال حل کر دیا کریں، تو پھر بچوں کی سمجھ بڑھے گی کیسے؟ اس لئے ماں باپ اور استاد کا کام صرف سمجھاؤ دینا ہے۔ بھگوان اندر سے ہمیں سمجھاتا رہتا ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرتا۔ کمہار کی طرح بھگوان ٹھوک پیٹ کر یا تھپ تھپا کر ہر ایک کا مٹکا تیار کرے تو اس میں خوبی ہی کیا رہی؟ ہم مٹی کی ہانڈی تو ہیں نہیں، ہم تو ذی ہوش ہیں۔

اس ساری تفصیل سے ایک بات تو آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ گیتا کا جنم سودھرم (فرض منصبی) میں رکاوٹ ڈالنے والے موہ کو دور کرنے کے لئے ہوا ہے۔ ارجن دھرم کو بھول گیا تھا، سودھرم کے بارے میں اس کے من میں موہ پیدا ہوگیا تھا۔ شری کرشن کے پہلے طعنے کے بعد یہ بات ارجن خود ہی تسلیم کرتا ہے۔ وہ موہ، وہ دنیا کی محبت اور وہ لگاؤ دور کرنا گیتا کا خاص کام ہے۔ اسی لئے ساری گیتا سنا چکنے کے بعد بھگوان نے پوچھا ہے ـــ "ارجن تمہارا موہ چلا گیا نا؟" ارجن جواب دیتا ہے ـــ ہاں بھگوان موہ ختم ہوگیا ہے، مجھے سودھرم کا احساس ہوگیا۔" اس طرح

اگر گیتا کی ابتدا اور انتہا ملا کر دیکھیں، تو موہ کا دفعیہ اس کا ماحصل ہے۔ گیتا کا ہی نہیں، ساری مہا بھارت کا یہی مقصد ہے۔ دیاس جی نے مہا بھارت کی ابتداء میں ہی کہا ہے کہ "قلب انسانی سے مایا موہ کے پردے کو دور کرنے کے لئے میں یہ تاریخی چراغ روشن کر رہا ہوں۔

(۴) عقل سلیم کا مستحق

آگے کی ساری گیتا سمجھنے کے لئے ارجن کی یہ تمہید ہمارے بہت کام آتی ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا احسان ماننا لازمی ہے۔ لیکن اس سے اور بھی ایک فائدہ ہے۔ ارجن کی اس تمہید میں اس کی سادہ لوحی کا پتہ چلتا ہے۔ خود "ارجن" لفظ کا مطلب ہی "رجو" یعنی "سیدھے سوبھاؤ والا" ہے۔ اس کے من میں جو کچھ بھی بگاڑ یا بچار آئے تھے، وہ سب اس نے دل کھول کر بھگوان کے سامنے رکھ دیئے۔ من میں کچھ بھی چھپا نہیں رکھا۔ وہ بالآخر کرشن جی کی پناہ میں گیا۔ سچ پوچھئے تو وہ پہلے ہی سے کرشن کی پناہ میں تھا۔ کرشن کو رتھ بان بنا کر جب سے اس نے اپنے گھوڑوں کی لگام ان کے ہاتھوں میں پکڑائی، تب ہی سے اس نے اپنے رجحان کی لگام بھی ان کے ہاتھوں میں سونپ دینے کی تیاری کر لی تھی۔ آئیے، ہم بھی ایسا ہی کریں۔

"ارجن کے پاس تو کرشن تھے، ہمیں کرشن کہاں ملیں گے؟" ہم ایسا نہ کہیں۔ "کرشن" نام کا کوئی شخص ہے، ایسی تاریخی اور مغالطہ آمیز الجھن میں ہم نہ پڑیں۔ سب کے اندر رہنے اور سب کچھ جاننے والے کے روپ میں ہم سب کے دل میں کرشن موجود ہیں۔ ہمارے سب سے زیادہ نزدیک وہی ہیں۔ تو ہم اپنے دل کے سب چھل بل اس کے سامنے رکھ دیں اور اس سے کہیں ——— "بھگوان میں تیری پناہ میں

ہوں، تو ہی اکیلا میرا گرو ہے۔ مجھے راہِ راست دِکھا۔ جو راستہ تو بتلائے گا، میں اسی پر چلوں گا۔ اگر ہم ایسا کریں گے، تو وہ ارجن کا رتھ بان ہماری بھی گاڑی چلائے گا۔ اپنی مبارک زبان سے وہ ہمیں گیتا سنائے گا اور ہمیں فتح یاب کرا دے گا۔

اتوار، ۲۱-۲-۳۲

دوسرا باب

جملہ نصیحت تھوڑے میں: علمِ روح اور عقلِ سلیم

⑤ گیتا کی تشریح

بھائیو! پچھلے باب میں ہم نے ارجن کے "وشاد یوگ" کو دیکھا۔ جب ارجن جیسی بدھائی اور اشور بیاہی ہو، تو پھر "وشاد" (برگشتگی اور آزردگی) بھی یوگ (فن) ہوجاتا ہے۔ اسی کو تنقیۂ قلبی کہتے ہیں۔ گیتا کی اس تمہید کو میں نے اس کے مُصنّف کے مطابق "ارجن کا وشاد یوگ" جیسا مخصوص نام نہ دیتے ہوئے "وشاد یوگ" جیسا عام نام دیا ہے؛ کیونکہ گیتا کے لئے ارجن محض وسیلہ ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ پنڈھرپور کے پانڈورنگ کا اوتار صرف پنڈلیک کے لئے ہوا ہے؛ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پنڈلیک کا بہانہ لے کر وہ ہم جاہلوں کی نجات کے لئے آج ہزاروں برسوں سے کھڑا ہے۔ اسی طرح گیتا کی دَیا ارجن کے ذریعہ ہی سہی، ہم سب کے لئے ہوئی ہے۔ اس لئے گیتا کے پہلے باب کے لئے "وشاد یوگ" جیسا عام نام ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ گیتا کا یہ پیڑ یہاں سے بڑھتے بڑھتے آخری باب میں "پرسادیوگ" جیسا پھل بن جاتا ہے۔ بھگوان کی مرضی ہوگی، تو ہم بھی اپنی اس قید کی مدت میں وہاں تک پہنچ جائیں گے۔

دوسرے باب سے گیتا کی تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے اور شروع میں ہی بھگوان زندگی کے بڑے اصول بتا دیتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر شروع ہی میں زندگی کے وہ خاص اصول ذہن نشین ہوجائیں، جن کے سہارے زندگی کی

عمارت کھڑی کرنی ہے، تو آگے کا راستہ سہل ہو جائے گا۔ دوسرے باب میں آنے والے "سانکھ بدھی" لفظ کا مطلب میں یہ لیتا ہوں ـــ "زندگی کے بنیادی اصول"۔ ان بنیادی اصولوں کو اب ہمیں دیکھنا ہے۔ مگر اس کے پہلے اگر ہم "سانکھ" لفظ کے سلسلہ سے گیتا کے اصطلاحی لفظوں کی تھوڑی وضاحت کر دیں تو بہتر ہوگا۔

گیتا پرانے علمی اور شرعی لفظوں کو نئے معنوں میں لکھنے کی عادی ہے۔ پرانے لفظوں پر نئے معنی کی قلم لگانا، ذہنی انقلاب کا غیر متشدد طریقہ ہے اور ویاس دیو اس فن میں ماہر ہیں۔ اس سے گیتا کے لفظوں کا مطلب وسیع ہو گیا اور وہ تر و تازہ بنی رہی اور مختلف مفکر اپنی اپنی ضرورت اور تجربے کے مطابق مختلف مفہوم لے سکے۔ اپنے اپنے مقام پر سب مطلب صحیح ہو سکتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تردید کئے بغیر ہم آزادانہ معنی بھی لے سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں "اپ نشد" میں ایک دلچسپ کہانی آئی ہے۔ ایک بار دیوتا، راکشش اور آدم زاد تینوں برہما کے پاس نصیحت کے لئے پہنچے۔ انھوں نے سب کو ایک ہی حرف "د" بتا دیا۔ دیوتاؤں نے کہا "ہم دیوتا لوگ شہوت زدہ ہیں، ہمیں عیش و عشرت کا چسکا لگ گیا ہے۔ اس لئے ہمیں برہما نے "د" کے ذریعہ دَمَن (ختم) کرنے کی نصیحت دی ہے۔" راکششوں نے کہا "ہم راکشش بڑے غصہ ور اور بے رحم ہو گئے ہیں۔ ہمیں "د" حرف کے ذریعہ برہما نے تعلیم دی ہے کہ "دیا کرو"۔ آدم زاد نے کہا ـــ "ہم انسان بڑے لالچی ہیں اور دولت جمع کرنے کے پیچھے پاگل ہو گئے ہیں۔ "د" کے ذریعہ "دان" کرنے کی نصیحت برہما نے کی ہے۔ برہما جی نے سبھی کے مطلب کو ٹھیک مانا، کیونکہ سب نے ان کو اپنے تجربات کے ذریعہ سے حاصل کیا تھا۔ گیتا کی تشریح کرتے وقت اپ نشد کی یہ کہانی ہمیں دھیان میں رکھنی چاہیئے۔

(۶) اصولِ زندگی : ۱۔ سودھرم کے لئے جسم کا استعمال

دوسرے باب میں زندگی کے تین بڑے اصول پیش کئے گئے ہیں (۱) روح امر اور غیر منقسم ہے۔ (۲) جسم حقیر اور بے ثبات ہے (۳) سودھرم لازمی ہے۔ ان میں سودھرم کا تعلق عمل سے ہے اور باقی دو کا تعلق علم سے ہے۔ پچھلے باب میں میں نے سودھرم کے بارے میں کچھ بتایا ہے۔ یہ ہمیں قدرتی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اسے کہیں ڈھونڈنے جانا نہیں پڑتا۔ یہ بات نہیں کہ ہم آسمان سے گرے اور دھرتی پر چلنے لگے۔ ہماری پیدائش سے پہلے یہ سماج موجود تھا۔ ہمارے ماں باپ تھے، اڑوسی پڑوسی تھے۔ اس تسلسل سے ہمارا جنم ہوتا ہے۔ اس لئے جن ماں باپ کے ہاں میں پیدا ہوا ہوں، ان کی سیوا کرنے کا دھرم (فرض) مجھے پیدا ہوتے ہی حاصل ہوگیا ہے۔ اور جس سماج میں میں پیدا ہوا ہوں، اس کی خدمت کرنے کا فرض بھی مجھے اسی طریقے سے اپنے آپ ہی حاصل ہوگیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے جنم کے ساتھ ہی ہمارا سودھرم بھی پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ تو ہماری پیدائش کے پہلے ہی سے ہمارے لئے تیار رہتا ہے؛ کیونکہ وہ ہمارے جنم کا سبب ہے۔ ہمارا جنم اس کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے۔ بعض لوگ سودھرم کو بیوی کی مثال دیتے ہیں کہ جیسے بیوی کا تعلق ناقابلِ انقطاع ہوتا ہے، ویسے ہی سودھرم کا تعلق بھی ناقابلِ انقطاع ہے۔ لیکن مجھے یہ تشبیہ مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ میں سودھرم کے لئے ماں کی مثال دیتا ہوں۔ مجھے اپنی ماں کا انتخاب اس زندگی میں کرنا باقی نہیں رہا۔ وہ پہلے ہی سے متعین ہوچکی ہے۔ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، اب ٹالی نہیں جاسکتی۔ یہی بات سودھرم کی ہے۔ اس دنیا میں ہمارے لئے سودھرم کے علاوہ دوسرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ سودھرم کو ٹالتے جانا گویا خود کو ہی ٹالنے جیسی خودکشی ہے۔ سودھرم کے سہارے ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں، اس لئے یہ سودھرم کا سہارا کبھی کسی کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ یہ زندگی کا ایک بنیادی اصول قائم ہوتا ہے۔

سودھرم اتنا سہل الحصول ہے کہ وہ ہم سے خود بخود انجام پانا چاہیئے۔ لیکن مختلف قسم کے دُنیاوی موہ کے باعث ایسا نہیں ہوتا۔ یا بڑی مشکل سے ہوتا ہے اور ہوا بھی تو اس میں زہر یعنی مختلف قسم کے عیب مِل جاتے ہیں۔ سودھرم کے راستے میں کانٹے بکھیرنے والے ان دنیاوی موہ کی ظاہری شکلوں کی تو کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔ تاہم جب ہم اس کی چھان بین کرتے ہیں، تو ان سب کی تہہ میں ایک ہی بات دکھائی دیتی ہے ۔۔ تنگ، چھچھلی اور جسم ہی کا طواف کرنے والی عقل۔ میں اور میرے جسم سے تعلق رکھنے والے لوگ، بس اتنی ہی میری وسعت کی حد ہے۔ اس دائرے کے باہر جو ہیں، وہ سب میرے لئے غیر یا دشمن ہیں۔ ایسے امتیازات کی دیواریں یہ متناقص عقل کھڑی کر دیتی ہے اور تعریف یہ کہ جنھیں میں نے "میں" یا "میرے" مان لیا ہے، ان کے بھی صرف جسم ہی وہ دیکھتی ہے۔ عقل کے اس تناقص کے نتیجہ میں ہم طرح طرح کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بنانے لگتے ہیں۔ اکثر سب لوگ اسی دوڑ دھوپ میں لگے رہتے ہیں۔ ان میں کسی کا گھیرا بڑا، تو کسی کا چھوٹا؛ لیکن ہیں بالآخر وہ گھروندے ہی۔ اس جسم کی کھال جتنی ہی ان کی گہرائی بھی ہے! کوئی خاندانی تفاخر کا گھروندا بنا کر رہتا ہے، تو کوئی ملکی فخر و مباہات کا۔ برہمن غیر برہمن نامی ایک، ہندو مسلمان نامی دوسرا۔ ایسے ایک دو نہیں بلکہ ہزاہا گھروندے بنے ہوئے ہیں۔ جدھر دیکھیئے اُدھر گھروندے ہی گھروندے ہیں! ہمارے اس جیل میں تو سیاسی قیدی اور دوسرے قیدی، اس طرح کے گھروندے بنے ہوئے ہیں۔ گویا ان کے بغیر ہم جی ہی نہیں سکتے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ ذلیل خیالات کے جراثیم کا سیلاب اور سودھرمی صحت کی بربادی۔

(۷) اصولِ زندگی: ۲۔ روح کا احساس

ایسی حالت میں تنہا سودھرم پر عقیدت ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے دوسرے دو اور اصول بیدار رکھنے پڑتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں یہ فانی جسم نہیں ہوں۔ جسم تو

صرف اوپر کی حقیر پیڑی ہے۔ دوسرا یہ کہ میں کبھی نہ مرنے والی غیر منقسم، وسیع روح ہوں۔ ان دونوں کو ملا کر مکمل تتو گیان (عرفان) حاصل ہوتا ہے۔

یہ تتو گیان گیتا کو اتنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ گیتا پہلے اسی کی دعوت دیتی ہے اور سودھرم کی بعد میں۔ کچھ لوگ پوچھتے ہیں کہ تتو گیان سے متعلق یہ اشلوک شروع ہی میں کیوں ہیں؟ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گیتا میں اگر کچھ اشلوک ایسے ہیں، جن کی جگہ بالکل نہیں بدلی جا سکتی، تو وہ یہی اشلوک ہیں۔

اتنا تتو گیان اگر من میں بیٹھ جائے، تو پھر سودھرم بالکل بھاری معلوم نہیں پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ سودھرم کے علاوہ اور کچھ کرنا بھاری معلوم دے گا۔ روح کی سالمیت اور جسم کی حقارت، ان دو باتوں کو سمجھ لینا کوئی مشکل بات نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں امور حقیقی ہیں۔ لیکن ہمیں ان پر غور کرنا ہوگا۔ بار بار من میں ان کا خیال کرنا ہوگا۔ اس چمڑے کے وقار کو گھٹا کر ہمیں روح کی عظمت کرنا سیکھنا ہوگا۔

دیکھئے یہ جسم تو پل پل بدلتا رہتا ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا—— اس تغیر کا احساس کسے نہیں ہے؟ آج کل کے سائنس والوں کا کہنا ہے کہ سات سال میں جسم بالکل بدل جاتا ہے اور پرانے خون کی ایک بوند بھی باقی نہیں رہتی۔ ہمارے پیشرو مانتے تھے کہ بارہ برس میں پرانا جسم مر جاتا ہے اور اس لئے کفارہ، ریاضت، مطالعہ وغیرہ کی میعاد بھی بارہ بارہ برس کی رکھتے تھے۔ بہت برسوں کی جدائی کے بعد جب کوئی بیٹا اپنی ماں سے ملا، تو ماں اسے پہچان نہ سکی، ایسے قصے ہم سنتے ہیں۔ تو کیا یہی ہر لمحہ بدلنے والا اور ہر لمحہ مرنے والا جسم ہی تیرا روپ ہے؟ رات دن جہاں نجاست اور غلاظت کی نالیاں بہتی ہیں اور تجھ جیسا زبردست دھونے والا مل جانے پر بھی جس کی گندگی کا تار ٹوٹتا ہی نہیں، کیا وہی تو ہے؟ وہ گندہ، تو اسے صاف کرنے والا، وہ بیمار، تو اسے دوا پانی دینے والا؛ وہ ساڑھے تین ہاتھ کی جگہ

گھیرے ہوئے، تو دونوں جگ کا سیاح؛ وہ ہمیشہ تغیر پذیر، تو اس کے انقلاب کو دیکھنے والا؛ وہ مرنے والا اور تو اس کی موت کا انتظام کرنے والا! تیرا اور اُس کا فرق اتنا نمایاں ہوتے ہوئے بھی تو اتنا تنگ اور محدود کیوں بنتا ہے؟ یہ کیا کہتا ہے کہ اس جسم سے جتنے تعلق رکھتے ہیں وہی میرے ہیں اور جسم کی موت کے لئے اتنا افسوس بھی کیوں کرتا ہے؟ شری کرشن پوچھتے ہیں۔ "ارے جسم کی فنا بھی کیا افسوس کرنے کی بات ہے۔۔۔؟"

جسم تو کپڑے کی طرح ہے۔ پرانے پھٹ جاتے ہیں، تو نئے پہنے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی ایک ہی جسم سدا کے لئے روح سے چپٹا رہتا، تو روح کی بُری حالت ہوتی۔ سارا ارتقاء رُک جاتا۔ لطف و سرور کافور ہو جاتا اور معرفت کی روشنی کم زور پڑ جاتی۔ اس لئے جسم کا فنا ہونا قابلِ افسوس نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر روح فنا ہوتی، تو بیشک وہ قابلِ افسوس بات ہوتی۔ مگر وہ تو غیر فانی ہے، وہ گویا ایک مسلسل رواں جھرنا ہے۔ اس پر مختلف چولے اور قالب آتے جاتے ہیں۔ اس لئے جسم کے ناتے رشتے کے چکر میں پڑ کر افسوس کرنا اور "یہ میرے ہیں اور یہ پرائے ہیں۔" ایسے بھید یا ٹکڑے کرنا بالکل غیر مناسب ہے۔ دیکھو یہ سارا عالم ایک خوب صورت بُنی ہوئی چادر ہے۔ کوئی چھوٹا بچہ ہاتھ میں قینچی لے کر جیسے چادر کے ٹکڑے کر دیتا ہے، ویسے ہی اس جسم کی قینچی سے عالم گیر روحانی ارتباط کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا کتنا لڑکپن اور ظلم ہے۔

سچ مچ یہ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ جس سرزمینِ ہند میں برہم وِدیا (الہیات) نے جنم پایا، اُسی میں ان چھوٹے بڑے طبقوں، فرقوں اور ذاتوں کی چاروں طرف بھرمار دکھائی دیتی ہے اور مرنے کا تو اتنا ڈر ہمارے من میں گھسا بیٹھا ہے کہ دنیا شاید ہی کہیں جگہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طویل عرصہ کی غلامی کا ہی نتیجہ ہے،

لیکن اس بات کے بھول جانے سے بھی کام نہیں چلے گا کہ غلامی کا ایک سبب یہی ہے۔
موت کا لفظ بھی ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ موت کا نام ہی ہمیں منحوس معلوم ہوتا ہے۔ گیان دیو کو بڑے دکھ کے ساتھ لکھنا پڑا ہے کہ

"موت کے لفظ کو برداشت نہیں کر سکتے، جب کوئی مرجاتا ہے، تو وہ روتے ہیں۔" پھر جب کوئی مرجاتا ہے، تو کتنا روتے چلاتے ہیں؟ گویا یہ ہمارا ایک فرض ہی ہے! یہاں تک کہ کرایہ کے رونے والے بلانے تک بات پہنچ جاتی ہے۔ موت پاس آجانے پر بھی بیمار سے نہیں کہیں گے۔ اگر ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ یہ نہیں بچے گا، تو بھی مریض کو اندھیرے میں رکھیں گے۔ خود ڈاکٹر بھی صاف صاف نہیں بتائے گا۔ آخری دم تک گلے میں دوا کی شیشیاں انڈیلتا رہے گا۔ اس کے بجائے اگر سچی بات بتا کر، تسلی دلاسا دے کر، اسے خدا کی یاد کی طرف لگایا جائے، تو کتنا احسان ہو! مگر انھیں یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس دھکے سے یہ بھانڈا پہلے ہی نہ پھوٹ جائے۔ لیکن کیا مقررہ وقت سے پہلے یہ بھانڈا پھوٹنے والا ہے؟ اور پھر جو بھانڈا دو گھنٹے بعد پھوٹنے والا ہے، وہ ذرا پہلے ہی پھوٹ گیا، تو اس سے بگڑا کیا؟ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم سنگدل بنے اور پریم سے دور ہوجائیں۔ لیکن جسمانی موہ سچی محبت نہیں ہے۔ برخلاف اس کے، جسمانی موہ کو دور کئے بغیر سچی محبت کا آغاز ہی نہیں ہوتا۔

جب جسم کا موہ چلا جائے گا، تو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ جسم تو خدمت کا ایک ذریعہ ہے اور تب ہی جسم کو اس کے لائق عزت بھی حاصل ہوگی، لیکن آج تو ہم جسم کی پوجا ہی کو اپنا مقصد مان بیٹھے ہیں۔ ہم یہ بات بھی بھول ہی جاتے ہیں کہ مقصد تو سودھرم کی تکمیل ہے۔ جسم کو سنبھالنے اور اسے کھلانے پلانے کی اگر ضرورت ہے، تو وہ سودھرم کو انجام دینے ہی کے لئے صرف زبان کے چٹخارے پورا

کرنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں۔ چمچے سے چاہے حلوہ پیش کیجئے، چاہے دال بھات،
اس چمچے کو اس کا سکھ دُکھ نہیں۔ ایسی ہی حالت زبان کی ہونی چاہئیے۔ اسے لذت
کا احساس تو ہونا چاہئیے، لیکن دُکھ سکھ کا نہیں۔ جسم کا کرایہ جسم کو چکا دیا، بس ختم۔
چرخے سے سوت کات لینا ہے، اسی لئے اس میں تیل دینے کی ضرورت ہے۔ اسی
طرح جسم سے کام لینا ہے، اس لئے اس میں کوئلہ ڈالنا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر ہم جسم
کا استعمال کریں، تو حقیقتاً حقیر اور کم قیمت ہونے پر بھی اس کی قیمت بڑھ سکتی ہے
اور اسے عظمت حاصل ہو سکتی ہے۔

لیکن ہم جسم کو بطور آلۂ کار کام میں نہ لاکر، اسی میں ڈوب جاتے ہیں اور
خود کو تنگ اور محدود کر لیتے ہیں، اس سے یہ جسم، جو پہلے ہی سے کچھ نہیں ہے اور
بھی زیادہ حقیر بن جاتا ہے۔ اس لئے سنت لوگوں نے زور دے کر کہا ہے کہ "جسم اور
اس کے متعلقین قابلِ مذمت ہیں۔ کتا، سوّر وغیرہ قابلِ تعریف ہیں۔" ارے تو اس جسم
کی اور اس جسم سے جن کا تعلق ہوا ہے، انھیں کی دن رات پوجا مت کر۔ دوسروں کو
بھی پہچاننا سیکھ ــــ سنت اس طرح ہمیں وسیع الخیال ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیا
ہم اپنے اعزا، دوست، احباب کے علاوہ دوسروں سے اپنی روح قریب کرتے ہیں؟
"جیو میں جیو سمائے۔ آتما میں آتما ملائے ــ" کیا ہم ایسا کرتے ہیں؟ کیا ہم اپنے طائرِ
روح کو اس جسمانی پنجرے کے باہر کی ہوا کھلاتے ہیں؟ کیا کبھی تیرے دل میں ایسا
خیال آتا ہے کہ اپنے بنائے ہوئے دائرے سے نکل کر کل میں نے دس نئے دوست
بنائے، آج پندرہ بناؤں گا اور کل پچاس۔ اور ایسا کرتے کرتے ایک دن سارا عالم
ہی میرا اور میں سارے عالم کا ایسا احساس کرنے لگوں گا؟ ہم جیل سے ملتے رشتے
والوں کو خط لکھتے ہیں، اس میں کیا خصوصیت ہے؟ مگر کیا جیل سے چھوٹتے ہوئے
کسی نئے دوست، سیاسی قیدی نہیں، چور قیدی کو خط لکھیں گے؟

ہماری روح وسیع ہونے کے لئے بیتاب رہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ساری کائنات کو گلے لگالے۔ لیکن ہم اسے کوٹھری میں بند کر دیتے ہیں۔ روح کو ہم نے قیدی بنا ڈالا ہے۔ اس کی یاد تک ہمیں نہیں آتی۔ صبح سے لے کر شام تک ہم جسم ہی کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ دِن رات یہی خیال کہ میرا یہ جسم کتنا موٹا تازہ ہوا یا کتنا دُبلا ہو گیا، گویا دنیا میں کوئی دوسرا لطف ہی نہیں ہے۔ کھانے اور ذائقہ کا لطف تو جانور بھی لیتے ہیں، اب تیاگ اور ترکِ لذّت کا لطف بھی دیکھیے گا یا نہیں؟ خود بھوک سے بیقرار ہوتے ہوئے بھی بھری تھالی دوسرے آدمی کو دے دینے میں کیا لطف ہے، اس کا احساس کیجیے۔ اس کے ذائقہ کو چکھیے۔ ماں جب بچے کے لئے دُکھ اُٹھاتی ہے، تب اُسے اس ذائقہ کا تھوڑا سا لطف ملتا ہے۔ آدمی اپنا کہہ کر جو تنگ دائرہ بناتا رہتا ہے، اس میں بھی اس کا مقصد ان جانے یہ رہتا ہے کہ روحانی ترقی کا مزہ چکھے، کیونکہ اس کی وجہ سے جسم میں قید رہنے والی روح تھوڑی دیر کے لئے باہر نکلتی ہے، لیکن یہ باہر آنا کس طرح کا ہے؟ جس طرح کہ جیل کی کوٹھری کے قیدی کا کام کے حیلے سے جیل کے احاطہ میں آنا ہو۔ لیکن روح کا کام اتنے سے نہیں چلتا، اسے تو غیر محدود آزادی کی مسرت چاہیئے۔

خلاصہ یہ کہ (۱) سادھک (عارف) کو چاہیئے کہ وہ اَدھرم (مکروہات و ممنوعات) اور پَردھرم (دوسروں کا فرض) کے ٹیڑھے راستے کو چھوڑ کر سودھرم (اپنے فرض منصبی) کا آسان اور سیدھا راستہ پکڑے اور اس کا دامن کبھی نہ چھوڑے۔ (۲) جسم فانی ہے، یہ سمجھ کر اس کا استعمال سودھرم کے لئے ہی کرے۔ جب ضرورت ہو تو سودھرم کے لئے اسے ختم بھی کر دے۔ (۳) روح کی سالمیت اور وسعت کا احساس ہمیشہ بیدار رکھے اور دِل سے "اپنا اور پرایا" کے بھید کو نکال ڈالے۔ بھگوان زندگی کے یہ خاص اصول بتاتے ہیں۔ جو آدمی ان کے مطابق عمل کرے گا، وہ بلاشبہ ایک دن اس اِنسانی جسم کے ذریعہ ہی فنا فی اللہ کی منزل تک پہنچ جائے گا۔

⑧ دونوں کی یگانگت کا طریقہ: ترکِ مکافات

بھگوان نے زندگی کے اصول بتائے تو، مگر محض اصول بتا دینے سے کام پورا نہیں ہو سکتا۔ گیتا میں بتائے ہوئے اصول تو اُپنشدوں اور اسمرتیوں میں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ گیتا نے انھیں کو پھر سے دُہرا دیا، تو اس میں گیتا کی کوئی جدّت نہیں ہے۔ اس کی جدت تو یہ بتانے میں ہے کہ ان اصولوں کو عمل میں کیسے لائیں؟ اس بڑے سوال کو بھی حل کرنے میں گیتا کی عظمت ہے۔

زندگی کے اصولوں کو روز مرّہ کے کاروبار میں لانے کی جو ترکیب یا فن ہے، اسی کو "یوگ" کہتے ہیں۔ "سانکھ" کا مطلب ہے "اصول" یا "فلسفہ" اور "یوگ" کا مطلب ہے "فن" یا "ترکیبِ عمل"۔ گیان دیو کہتے ہیں — "یوگیوں نے جیون کی کلا سادھ لی ہے۔" گیتا سانکھ اور یوگ — علم اور فن — دونوں سے لبریز ہے۔ علم اور فن دونوں کے امتزاج سے حسنِ زندگی کھلتا ہے۔ کورا علم ہوائی قلعہ ہے۔ علمِ موسیقی کو سمجھ تو لیا، لیکن اگر گلے سے راگ ظاہر کرنے کا فن نہ سیکھا، تو موسیقار کا فن ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بھگوان نے اصول کے ساتھ ان پر عمل کی ترکیب بھی بتلا دی ہے۔ تو وہ کون سی ترکیب ہے؟ جسم کو حقیر مان کر روح کی لافانیت اور سالمیت پر نگاہ رکھ کر فرائضِ منصبی کو برتنے کا فن کون سا ہے؟

ہم جو کام کرتے ہیں، ان کے پسِ پشت دُہرا منشا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم اپنے کام کا پھل ضرور چکھیں گے۔ یہ ہمارا حق ہے اور اس کے برعکس دوسرا یہ کہ اگر ہمیں پھل چکھنے کو نہیں ملتا ہے، تو ہم کام ہی نہ کریں گے۔ گیتا ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا خیال یا رجحان بتاتی ہے۔ وہ کہتی ہے — "کام تو ضرور کرو، مگر پھل میں اپنا حق مت مانو۔" جو کام کرتا ہے، اسے پھل کا حق ضرور ہے، لیکن تم اس پھل کو خود ہی چھوڑ دو۔ رجوگن کہتا ہے — "لوں گا تو پھل کے ساتھ ہی" اور "تموگن کہتا ہے — "چھوڑ دوں گا تو کام کے ساتھ ہی۔" یہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہی ہیں۔ اس لئے تم ان دونوں سے آگے

بڑھ کر سیدھے سچے "ستوگنی" بنو[1]۔ مطلب یہ کہ کام تو کرو، پر پھل کو چھوڑ دو اور پھل چھوڑ کر کام کرو، پہلے اور پیچھے کہیں بھی پھل کی تمنا مت رکھو۔

گیتا جب یہ کہتی ہے کہ پھل کی تمنّا مت رکھو، تو ساتھ ہی وہ یہ جتا کر کہتی ہے کہ عمل کو خوبی اور قابلیت سے انجام دینا چاہیئے۔ پھل کی چاہ رکھنے والے آدمی کے کام کی بہ نسبت، بے لوث آدمی کا کام زیادہ اچھا ہونا چاہیئے۔ یہ مناسب ہی ہے۔ کیونکہ غرض مند اِنسان تو پھل کا امیدوار ہے، اس لئے پھل کے خیالی پلاؤ میں اس کا تھوڑا بہت وقت اور طاقت ضرور صرف ہوگی۔ لیکن خواہش سے مبّرا اِنسان کا تو ہر لمحہ اور ساری طاقت کام میں ہی لگی رہے گی۔ ندی کو چھٹی نہیں، ہوا کو آرام نہیں، سورج ہمیشہ چلتا ہی جاتا ہے۔ اسی طرح بے لوث کام کرنے والا ہمیشہ سیوا کرتا ہی جاتا ہے۔ اب اگر اس طرح مسلسل کام میں لگے اِنسان کا کام ممتاز نہ ہوگا، تو کس کا ہوگا؟ پھر ذہنی یکسوئی ایک بڑا عمدہ وصف ہے اور وہ بے لوث اِنسان کی میراث ہے ہی۔ کسی مادّی کاریگری میں اگر ہاتھ کی مہارت کے ساتھ قلب کی یکسوئی کی آمیزش ہو جاتی ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ کام اور بھی خوبصورت بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ غرض مند اور بے لوث اِنسان کے عملی نقطۂ نظر میں جو فرق ہے، وہ بھی پھل نہ چاہنے

---

[1] ہندو فلسفہ کے مطابق مادۂ مطلق یعنی مجرد ہیولیٰ میں بالقویٰ تین قوتیں ہیں۔ ستّ، رَج اور تَم۔ (ستو، رجس اور تمس یا ستوگن، رجوگن اور تموگن) ان تینوں کی خاصیتیں یہ ہیں:—

۱۔ ستوگن:— پاک صاف اور روشن ہے۔ روح کو سکھ اور گیان کے ساتھ باندھتا ہے۔

۲۔ رجوگن:— موہ روپ ہے۔ یہ لوبھ اور خواہش سے پیدا ہوتا ہے اور روح کو خواہشات اور افعال کے ساتھ باندھتا ہے۔

۳۔ تموگن:— جہالت اور تاریکی سے پیدا ہوتا ہے۔ فتور اور تذبذب، غفلت، کاہلی اور نیند میں پھنسانا اس کا فعل ہے۔

پہلی قوت فرشتوں (دیوتاؤں) کی طرف منسوب ہے۔ دوسری اِنسانوں اور تیسری حیوانوں کی طرف۔

والے اِنسان کے عمل کے زیادہ حسب حال ہے۔ پھل چاہنے والا انسان عمل کی طرف خود غرضی سے دیکھتا ہے۔ "میرا ہی کام اور مجھے ہی پھل" اس لحاظ سے اگر عمل کی طرف سے اس کا تھوڑا سا بھی دھیان ہٹ گیا، تو اس میں اسے اخلاقی نقص محسوس نہیں ہوتا۔ بہت ہوا تو عملی نقص جان پڑتا ہے، لیکن پھل نہ چاہنے والے اِنسان کو اپنے عمل کے بارے میں اخلاقی فرض کا احساس رہتا ہے۔ اس لئے وہ مستعدی سے اس بات کی احتیاط کرتا ہے کہ اپنے عمل میں تھوڑی بھی خامی نہ رہ جائے؛ اس لئے بھی اس کا عمل زیادہ بے خطا ہوگا۔ کسی بھی طرح دیکھئے ترکِ مکافات نہایت عمدہ اور باعثِ برکت ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ترکِ ثمر کو "یوگ" یعنی اصولِ زندگی کہنا چاہیئے۔

اگر بے لوث کام کی بات چھوڑ دیں، تو بھی خود کام میں جو لطف ہے، وہ اس کے پھل میں نہیں ہے۔ اپنا کام کرتے ہوئے جو ایک قسم کی لگن اور دُھن ہوتی ہے، وہ مسرّت کا ایک چشمہ ہے۔ مصوّر سے کہیئے۔ "تصویر نہ بناؤ، اس کے لئے تم چاہو جتنے پیسے لے لو" تو وہ نہیں مانے گا۔ کسان سے کہیئے۔ "کھیت پر نہ جاؤ، گائیں نہ چراؤ، موٹ مت چلاؤ، تم جتنا اناج چاہو گے، اُتنا اناج تمہیں دے دیں گے۔" اگر وہ سچا کسان ہے، تو ہرگز یہ سودا پسند نہ کرے گا۔ کسان سویرے کھیت پر جاتا ہے۔ سورج اس کا استقبال کرتا ہے۔ پرند اس کے لئے گانا گاتے ہیں۔ گائے بیل اس کے اِرد گرد رہتے ہیں۔ وہ محبت سے انھیں سہلاتا ہے۔ جو جھاڑ جھنکاڑ لگائے ہیں، انھیں نظر بھر کر دیکھتا ہے۔ ان سب کاموں میں ایک روحانی مسرت ہے۔ یہ مسرت ہی اس عمل کا خاص اور سچا پھل ہے، اس کے مقابلہ میں اس کا بیرونی ثمرہ بالکل معمولی اور بے حقیقت ہے۔

گیتا جب آدمی کی نگاہ مکافاتِ عمل سے ہٹا لیتی ہے، تو وہ اس ترکیب سے عمل میں اس لگن سو گنا بڑھا دیتی ہے۔ بے لوث اِنسان کے عمل کی یکسوئی محویت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے اس کا لطف اوروں سے سوگنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس طرح دیکھنے پر یہ بات فوراً

سمجھ میں آجاتی ہے کہ بے لوث کام بذات خود ایک ثمرہ ہے۔ گیان دیو نے صحیح کہا ہے ــــ "پیڑ میں پھل لگتے ہیں، اب پھل میں اور کیا پھل لگیں گے۔" اِس جسمانی پیڑ میں بے لوث اولئے فرض جیسا خوبصورت پھل لگنے کے بعد اور کسی پھل کی امید کیوں رکھیں؟ کسان کھیت میں گیہوں بوئے اور گیہوں بیچ کر جوار کی روٹی کیوں کھائے؟ ذائقہ دار کیلے اگائے، انھیں بیچ کر مرچ کیوں کھائے؟ ارے بھائی، کیلے ہی کھاؤ نا! مگر لوگوں کو یہ قبول نہیں۔ کیلے کھانے کی قسمت لے کر بھی لوگ مرچ پر ہی ٹوٹتے ہیں۔ گیتا کہتی ہے ــ "تم ایسا ست کرو، عمل کو ہی کھاؤ، عمل کو ہی پیو، اور عمل کو ہی ہضم کرو۔" بس عمل کرنے میں ہی سب کچھ آجاتا ہے۔ بچہ کھیل کے مزہ کے لئے کھیلتا ہے، اس سے اس کو ورزش کا پھل اپنے آپ ہی مل جاتا ہے۔ لیکن اس کا دھیان اس پھل کی طرف بالکل نہیں ہوتا۔ اس کا سارا لطف اس کھیل ہی میں رہتا ہے۔

⑨ ترکِ مکافات کی دو مثالیں

سنتوں نے اپنی عملی زندگی سے یہ بات ثابت کر دی ہے۔ تکارام کے زہد و تقویٰ کو دیکھ کر شیواجی کے من میں ان کے لئے بہت عزت ہو جاتی ہے۔ ایک بار انھوں نے تکارام کے گھر پالکی بھیج کر ان کے خیر مقدم کا اہتمام کیا۔ لیکن تکارام کو اپنے استقبال کی یہ تیاری دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ انھوں نے اپنے دِل میں کہا ــ "میری عبادت کا یہ پھل؟ کیا میں اسی کے لئے عبادت کرتا ہوں؟" ان کو ایسا محسوس ہوا کہ بھگوان عزت و توقیر کا یہ پھل ان کے ہاتھ میں رکھ کر انھیں اپنے سے دور ہٹا رہا ہے۔ انھوں نے کہا ــــ "میرے باطن کو جانتے ہوئے تم میری جھنجھٹ ٹالنا چاہتے ہو؟ اے "پانڈرنگ"! تمہاری یہ عادت بہت بُری ہے ــ بھگوان! تمہاری یہ عادت اچھی نہیں ہے۔ تم مجھے جھنجھٹ کے یہ ولنے دے کر ٹالنا چاہتے ہو۔ دل میں سوچتے ہو گے کہ اس آفت کو ٹال ہی دوں۔ لیکن میں بھی کچے گرو کا چیلا نہیں ہوں۔ میں تمہارے پاؤں زور سے پکڑ کر بیٹھ جاؤں گا۔ بھگتی ہی بھگت کا سودھرم ہے اور بھگتی میں

دوسرے تیسرے پھلوں کی خواہش نہ پیدا ہونے دینا ہی زندگی کا فن ہے۔"

پنڈلیک کا کریکٹر ترکِ ثمر کا اس سے بھی اعلیٰ نمونہ سامنے رکھتا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی سیوا کر رہا تھا۔ اس کی خدمت سے خوش ہو کر "پانڈورنگ" اس کی ملاقات کے لئے دوڑے آئے۔ لیکن پنڈلیک نے ان کے چکر میں پڑ کر اپنی اس خدمت کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اپنے ماں باپ کی خدمت اس کی نگاہ میں سچی عبادت تھی۔ کوئی لڑکا اگر دوسروں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنے ماں باپ کو سُکھ پہنچاتا ہے، یا کوئی دیس سیوک دوسرے ملک سے دشمنی کر کے اپنے دیس کا بھلا چاہتا ہے، تو ان دونوں کا یہ فعل عبادت نہیں کہلائے گا۔ وہ موہ ہوا۔ پنڈلیک ایسے موہ میں نہیں پھنسا۔ اس نے سوچا، پرماتما جس شکل کو اختیار کر کے میرے سامنے کھڑا ہوا ہے، کیا وہ اتنا ہی ہے؟ اس کا یہ روپ دکھائی دینے سے پہلے کیا دنیا ویران تھی؟

وہ بھگوان سے بولا۔ "بھگوان! مجھے خود آپ درشن دینے کے لئے آ گئے ہیں، مگر میں "بھی" اصول کو ماننے والا ہوں، آپ ہی اکیلے بھگوان ہیں، میں ایسا نہیں مانتا۔ میرے لئے تو آپ بھی بھگوان ہیں اور میرے ماں باپ بھی۔ ان کی خدمت میں لگے رہنے کے باعث میں آپ کی طرف دھیان نہیں دے سکتا۔ اس لئے آپ مجھے معاف کیجئے۔" اتنا کہہ کر اس نے بھگوان کے کھڑے رہنے کے لئے ایک اینٹ سرکا دی اور خود اسی خدمت میں مشغول ہو گیا۔ تکارام اس واقعہ کو بڑے مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

"تو کیسا پاگل پریمی ہے کہ تو نے وِٹھل کو کھڑا رکھا؟ تو کیسا ڈھیٹ ہے کہ تو نے وِٹھل کے لئے اینٹ سرکا دی ہے۔"

پنڈلیک نے جو یہ "بھی" لفظ کا استعمال کیا ہے، وہ ترکِ ثمر کی تدبیر کا ایک جزو ہے۔ تارکِ ثمر کے کام کی محویت جیسی گہری ہوتی ہے، ویسی ہی اس کی فطرت وسیع اور متوازن ہو جاتی ہے۔ اسی باعث وہ طرح طرح کے فلسفے کے جنجال میں نہیں پڑتا اور نہ اپنا اصول چھوڑتا۔ "یہی ہے، دوسرا بالکل نہیں ہے۔" ایسی بحث میں وہ بالکل نہیں پڑتا۔ "یہ بھی صحیح ہے اور

وہ بھی صحیح ہے، لیکن میرے لئے تو یہی صحیح ہے۔" ایسی اس کی انکساری اور مستقل مزاجی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ایک گرہست شخص ایک سادھو کے پاس گیا اور اس نے پوچھا ــ نجات پانے کے لئے کیا گھر بار چھوڑنا ضروری ہے؟" سادھو نے کہا ــ "نہیں تو، دیکھو جنک جیسوں نے جب راج محل میں رہ کر نجات حاصل کر لی، تو پھر تم کو گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟" پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے سادھو سے پوچھا "حضرت! گھر بار چھوڑے بغیر کیا نجات مل سکتی ہے؟" سادھو نے کہا ــ "کون کہتا ہے؟ گھر میں رہ کر اگر مفت میں نجات ملتی ہوتی، تو شاکیہ جیسوں نے جو گھر بار چھوڑا، تو کیا وہ مورکھ تھے؟" بعد میں جب اُن دونوں آدمیوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی، تو اُن میں جھگڑا ہوا۔ ایک کہنے لگا ــ سادھو نے گھر بار چھوڑنے کے لئے کہا ہے۔" دوسرے نے کہا ــ "نہیں، انھوں نے کہا ہے کہ گھر بار چھوڑنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔" تب وہ دونوں سادھو کے پاس پہنچے۔ سادھو نے کہا ــ "دونوں کا کہنا ٹھیک ہے۔ جیسا جس کا جذبہ، ویسی اس کی راہ اور جیسا جس کا سوال، ویسا ہی اس کا جواب۔ گھر چھوڑنے کی ضرورت ہے، یہ بھی سچ ہے اور گھر چھوڑنے کی ضرورت نہیں، یہ بھی سچ ہے۔" اسی کو کہتے ہیں "بھی" نظریہ۔

پنڈلیک کی مثال سے یہ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ ترک تم کس منزل تک پہنچنے والا ہے۔ تُکارام کو جو لالچ بھگوان دینا چاہتے تھے، اس سے پنڈلیک والا لالچ کہیں دلکش تھا لیکن وہ اس پر بھی مائل نہیں ہوا۔ اگر ہو جاتا، تو پھنس جاتا۔ اس لئے ایک بار طریق عمل متعین ہو جانے پر پھر آخر تک اس پر عمل کرتے رہنا چاہیئے۔ پھر بیچ میں مجسم بھگوان کے درشن جیسی رکاوٹ کھڑی ہو جائے، تو بھی اس کے لئے اس طریق عمل کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے۔ جسم بچا ہے، تو وہ ذریعہ کے لئے ہی ہے۔ بھگوان کا درشن تو ہاتھ میں ہی ہے، وہ بھاگا کہاں ہے؟ ــ

"جب میرا من تیری بھگتی میں رنگا ہوا ہے، تو پھر "ہمہ اوست" کا جذبہ مجھ سے کون

چھین سکتا ہے۔" اس بھگتی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں یہ جنم ملا ہے۔ " تجھے عمل نہ کرنے کی بھی آرزو نہ ہو۔" گیتا کے اس قول کا مطلب یہاں تک جاتا ہے کہ بے لوث کرم کرتے ہوئے انقطاعِ عمل یعنی نجات کی بھی آرزو مت رکھ، خواہشات سے چھٹکارا ہی تو نجات ہے، نجات کو خواہشات سے کیا لینا دینا؟ جب ترکِ مکافات اس منزل تک پہنچ جاتا ہے، تب سمجھو کہ زندگی کی معراج آپہونچی۔

(۱۰) مثالی گرو

عمل سکھا دیا، طریقِ عمل بھی بتلا دیا، لیکن اتنے سے ساری تصویر آنکھوں کے سامنے نہیں آجاتی۔ علم نرگن ہے، طریقِ عمل سگن ہے۔ لیکن سگن بھی متشکل ہوئے بغیر ظاہر نہیں ہوتا۔ نرگن جیسے محض ہوا میں رہتا ہے، اسی طرح غیر متشکل سگن کی حالت بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی تدبیر ہے، جس گنی میں گن اجاگر ہوا ہے، اس کا دیدار۔ اسی لئے ارجن کہتا ہے۔" آپ نے زندگی کے خاص اصول بتلا دیئے، انھیں عمل میں لانے کی ترکیب بھی بتلا دی، تو بھی اس کی صاف اور نمایاں تصویر میرے سامنے کھڑی نہیں ہوتی۔ اس لئے مجھے مثال دے کر سمجھائیے۔ ایسے انسانوں کی پہچان بتائیے، جن کے ذہن میں سانکھ کی عظمت قائم ہو گئی اور ترکِ ثمر کا یوگ جن کی رگ رگ میں سما گیا ہے۔ جنھیں ہم "استھت پرگیہ" (قائم العقل) کہتے ہیں۔ جو ترکِ ثمر کی پوری گہرائی دکھلاتے ہیں۔ جو عمل کی موت میں مگن ہیں۔ جو استقلال کے بلند پہاڑ ہیں۔ وہ بولتے کیسے ہیں، بیٹھتے کس طرح ہیں اور چلتے کس طرح ہیں، یہ سب مجھے بتائیے۔ وہ شکل کیسی ہوتی ہے؟ اسے کیسے پہچانیں؟ بھگوان! یہ سب کچھ بتائیے۔"

اس کے لئے کرشن جی نے دوسرے باب کے آخری اٹھارہ اشلوکوں میں "استھت پرگیہ" (قائم العقل) کا سنجیدہ اور بلند کیرکٹر پیش کیا ہے۔ گویا ان اٹھارہ اشلوکوں میں گیتا کے اٹھارہ بابوں کا نچوڑ جمع کر دیا ہے۔ "استھت پرگیہ" گیتا کی مثالی تصویر ہے۔ یہ لفظ بھی گیتا کا

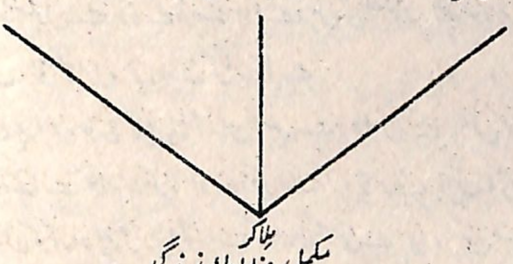
اپنا ہے۔ آگے پانچویں باب میں نجات کا، بارہویں میں بھگت کا، چودھویں میں تینوں گنوں سے غیر ملوث رہنے کا اور اٹھارہویں میں گیان پر عقیدت کا ایسا ہی بیان آیا ہے، لیکن ان سب میں "استھت پرگیہ" وضاحت سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اور مکمل کر لی گئی ہے۔ اس میں بدھو (سالک) کی علامت کے ساتھ ساتھ سادھک (عارف) کی علامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہزاروں ستیاگرہی عورت، مرد شام کی پرارتھنا میں انھیں علامتوں کو دہراتے ہیں۔ اگر ہر گاؤں اور ہر گھر میں وہ پہنچائی جا سکیں، تو کتنا لطف ہو، لیکن پہلے جب وہ ہمارے دل میں جڑ پکڑیں تو وہ خود بخود باہر پہنچ جائیں گی۔ روزمرہ پڑھنے کی چیزیں اگر مشین جیسی ہو گئیں، تو پھر دل میں نقش ہونے کے بجائے اُلٹے مٹ جائیں گی۔ عیب روزانہ پاٹھ کا نہیں، بلکہ غور و فکر نہ کرنے کا ہے۔ روزمرّہ کے پاٹھ کے ساتھ ہی ساتھ، غور و فکر اور اپنے ضمیر کی جانچ پڑتال کی بھی ضرورت ہے۔

"استھت پرگیہ" یعنی قائم العقل، یہ تو اس کا نام ہی بتلا رہا ہے کہ اس کی صفت کیا ہے۔ لیکن ضبط نفس کے بغیر عقل قائم ہو گی کیسے؟ اس لئے قائم العقل کو ضبط و تقویٰ کا مرقع بنایا ہے۔ عقل روح کے تابع ہو اور حواس عقل کے ماتحت ہوں؛ یہ ہی تقویٰ کا مفہوم۔ "استھت پرگیہ" سارے حواس کو لگام چڑھا کر انھیں کرم یوگ میں جوتتا ہے۔ اور حواس نما بیلوں سے وہ بے غرضانہ ادائے فرض کی کھیتی اچھے طور پر کرا لیتا ہے۔ اپنی ہر سانس اعلیٰ کاموں میں صرف کرتا رہتا ہے۔

حواس پر اس طرح قابو پانا آسان نہیں ہے۔ حواس سے بالکل کام نہ لینا ایک بار آسان ہو سکتا ہے۔ کلام نہ کرنا اور غذا کو ترک کر دینا وغیرہ باتیں اتنی مشکل نہیں ہے۔ اور حواس کو آزاد چھوڑ دینا تو سب کے لئے سہل ہے ہی، لیکن جس طرح کچھوا خطرہ کی جگہ اپنے تمام اعضاء کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے اور خطرہ سے خالی مقام پر ان سے کام لیتا ہے، اسی طرح عیش و عشرت سے حواس کو سمیٹ لینا اور بھلائی کے

کام میں ان کا جائز استعمال بڑا کٹھن تقریباً ہے۔ اس کے لئے بڑی کوشش کی ضرورت ہے۔ گیان (علم) بھی چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ یقینی نہیں ہے کہ ہمیشہ کامیاب ہی ہوجائیں گے۔ تو کیا ہم مایوس ہو جائیں؟ نہیں سادھک کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ جملہ تدبیریں کام میں لائے، پھر بھی اگر کمی رہ جائے، تو اس میں بھگتی کو جوڑ دے۔ یہ بڑا قیمتی نسخہ ہے، جیسے بھگوان نے "استھت پرگیہ کی علامت میں دیا ہے، مگر دیا ہی گنے گنائے لفظوں میں ہی۔ تاہم گاڑی بھر لیکچروں کی بہ نسبت وہ زیادہ قیمتی ہے؛ کیونکہ جہاں بھگتی کی ناگزیر ضرورت ہے، وہیں وہ پیش کی گئی ہے۔" استھت پرگیہ کی علامتوں کا بیان آج ہمیں یہاں تفصیل سے نہیں کرنا ہے، مگر کہیں ہم اپنی کوششوں میں بھٹکتی کا مقررہ مقام نہ بھول جائیں، اس لئے اس طرف دھیان دلا دیا۔ پورا "استھت پرگیہ" اس عالم میں کون ہو گیا ہے، یہ تو بھگوان ہی جانے لیکن سیوا، خدمت میں سرشار "استھت پرگیہ" کی مثالی شکل میں پنڈت لیک کی مورت ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے آتی رہتی ہے اور وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اچھا اب استھت پرگیہ کی علامتیں پوری ہوئیں اور دوسرا باب بھی ختم ہوا۔

(نرگن) سانکھ بُدھی + (سگن) یوگ بُدھی + (ساکار) استھت پرگیہ



ملا کر
مکمل ضابطۂ زندگی

اس میں سے برہم نروان (وصل الٰہی) یعنی نجات کے سوا دوسرا کون ثمرہ نکل سکتا ہے؟

انوار ۲۸-۲-۳۲

تیسرا باب

کرم یوگ

(۱۱) تارک ثمر کو بے انتہا جزا ملتی ہے

بھائیو! دوسرے باب میں ہم نے سارے اصولِ زندگی پر ایک نگاہ ڈالی، اب اس تیسرے باب میں اسی اصولِ زندگی کی وضاحت کرنی ہے۔ پہلے ہم نے بنیادی اصولوں پر غور کیا، اب اس کی تفصیل میں جائیں گے۔ پچھلے باب میں کرم یوگ سے متعلق بحث کی تھی۔ کرم یوگ میں اہم چیز ہے ترکِ ثمر۔ کرم یوگ میں ترکِ ثمر اچھا تو ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ثمرہ ملتا بھی ہے یا نہیں؟ اس لئے تیسرے باب میں کہتے ہیں کہ کرم کے پھلوں کو چھوڑنے سے عامل الٹا بے انتہا پھل حاصل کرتا ہے۔

یہاں مجھے لکشمی کی کہانی یاد آتی ہے۔ اس کا تھا سوئمبر۔ سارے دیوتا اور سبھی راکشش بڑی امیدیں باندھ کر آئے تھے۔ لکشمی نے اپنا عہد ظاہر نہیں کیا تھا۔ جلسہ گاہ میں آکر وہ بولی ــ "میں اس کے گلے میں ور مالا ڈالوں گی، جسے میری چاہ نہ ہو گی"۔ وہ تو سب تھے لالچی۔ لکشمی ایسا بے لوث ور تلاش کرنے لگی۔ اتنے میں شیش ناگ پر بڑے سکون سے لیٹے ہوئے بھگوان وشنو کی مورت اسے دکھائی دی۔ ان کے گلے میں مالا ڈال کر وہ آج تک ان کے پیر دباتی ہوئی بیٹھی ہے۔ "جو نہ چاہے، لکشمی اسی کی داسی بنتی ہے۔" یہی تو خوبی ہے۔

معمولی آدمی اپنے پھل کے آس پاس کانٹے کی باڑ لگاتا ہے، مگر اس طرح وہ مختلف شکلوں سے ملنے والا پھل کھو بیٹھتا ہے۔ دُنیا دار شخص بے انتہا عمل کر کے

تھوڑا ثمرہ حاصل کرتا ہے، مگر یوگی تھوڑا سا عمل کر کے بھی لاانتہا فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ فرق صرف ایک جذبۂ باطنی کے باعث ہوتا ہے۔ ٹالسٹائے نے ایک جگہ کہا ہے۔

"لوگ عیسیٰ مسیح کی قربانی کی بہت تعریف کرتے ہیں، لیکن دنیادار تو روزانہ اپنا نہ جانے کتنا خون سکھاتے ہیں، دوڑ دھوپ کرتے ہیں! پورے دو گدھوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر چکر کاٹنے والے یہ دنیادار لوگ! انھیں عیسیٰؑ سے کتنا زیادہ دُکھ کتنی زیادہ ان کی بُری حالت! اگر یہ ان کے آدھے دُکھ بھگوان کے لئے اٹھائیں، تو سچ مچ عیسیٰؑ سے بھی بڑھ جائیں گے۔"

دنیادار کی ریاضت دراصل بڑی ہوتی ہے، مگر وہ ہوتی ہے حقیر پھلوں کی خاطر۔ جیسی نیت ویسے ہی پھل۔ اپنی چیز کی جو قیمت ہم آنکتے ہیں، اس سے زیادہ قیمت سنسار میں نہیں ہوتی۔ سُداما چاول لے کر کرشن جی کے پاس گئے۔ اس مٹھی بھر چاول کی قیمت ایک دھیلا بھی شائد نہ ہو۔ لیکن سُداما کو وہ بیش قیمت معلوم ہوئے تھے، کیونکہ ان میں جذبۂ عقیدت بھرا تھا۔ ان کے ایک ایک چاول میں عقیدت بھری ہوئی تھی۔ چیز کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، عقیدت سے اس کا مول، اس کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ نوٹ کا وزن دیکھو، کتنا ہوگا؟ اسے جلائیں تو ایک بوند پانی بھی شائد ہی گرم ہو، مگر اس پر ایک مہر لگی رہتی ہے، اسی سے اس کی قیمت ہوتی ہے۔

کرم یوگ میں بھی سارا کی خوبی یہی ہے۔ کرم کو نوٹ ہی سمجھو۔ مہر عقیدت ہی کی قیمت ہے۔ کرم کے کاغذ کے ٹکڑے کی قیمت نہیں۔ ایک طرح سے میں یہ مورتی پوجا کا راز بتا رہا ہوں۔ مورتی پوجا کے تصور میں بڑا لطف ہے۔ اس مورت کو کون توڑ پھوڑ سکتا ہے؟ یہ مورت شروع میں ایک پتھر ہی تو تھی۔ میں نے اس میں جان ڈالی۔ اپنی عقیدت ڈالی۔ بھلا اس جذبۂ عقیدت کے کوئی ٹکڑے کر سکتا ہے؟ ٹوٹ پھوٹ پتھر کی ہو سکتی ہے، عقیدت کی نہیں۔ جب میں اپنی عقیدت مورت

میں سے نکال لوں گا، تو وہاں پتھر ہی بچ رہے گا اور تب ہی اس کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔

کرم کا مطلب ہوا پتھر یا کاغذ کا ٹکڑا۔ میری ماں نے کاغذ کی ایک چٹ پر دو چار ٹیڑھی میڑھی سطریں لکھ کر بھیج دیں اور دوسرے کسی شخص نے پچاس صفحوں میں اوٹ پٹانگ تحریر لکھ کر بھیج دی، اب وزن کس کا زیادہ ہے؟ لیکن ماں کی ان چار سطروں میں جو جذبہ ہے، وہ بیش قیمت ہے، پاک ہے۔ اس کی برابری وہ ردّی نہیں کر سکتی۔ عمل میں تر و تازگی چاہیئے۔ عقیدت چاہیئے۔ ہم مزدور کے کام کی ایک قیمت لگاتے ہیں اور اسے مزدوری دے دیتے ہیں، لیکن دان (عندقہ) کی بات ایسی نہیں ہے۔ دَچھنا (صدقہ) بھگو کر دی جاتی ہے۔ اس کے متعلق یہ سوال نہیں اٹھتا کہ کتنی دی؛ معرکہ کی بات جو دیکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تری ہے یا نہیں؛ "منوسمرتی" میں ایک بڑی پُر لطف بات کہی گئی ہے۔ ایک شاگرد بارہ سال گرو کے گھر رہ کر جانور سے آدمی بنا۔ اب وہ گرو کو دَچھنا کیا دے؛ پرانے زمانے میں پہلے ہی فیس نہیں لے لی جاتی تھی۔ بارہ سال پڑھ چکنے کے بعد گرو کو جو کچھ دینا ہو، دیا جاتا تھا۔ منو کہتے ہیں — "چڑھا دو گرو جی کو ایک آدھ پھول پتا۔ دے دو ایک پنکھا یا کھڑاؤں یا پانی کا گھڑا —" اسے آپ مذاق نہ جانیے۔ کیونکہ جو کچھ دینا ہے احترام کی نشانی سمجھ کر دینا ہے۔ پھول میں بھلا کیا وزن ہے؟ لیکن اس جذبۂ عقیدت میں کائنات کے برابر وزن ہے ؎

"رُکمنی نے تلسی کی ایک ہی پتی سے بھگوان کو تول لیا —"

ستیہ بھاما کے من بھر زیورات سے کام نہیں چلا۔ لیکن عقیدت سے بھرپور تلسی کا ایک پتّہ جب رُکمنی ماتا نے پلڑے میں ڈالا تو سارا کام بن گیا۔ اس تلسی کے پتے میں عقیدت کی تر و تازگی تھی، اس لئے وہ معمولی نہیں رہ گیا تھا۔ کرم یوگی

کے عمل کی بھی یہی بات ہے۔

ایسا خیال کرو کہ دو اشخاص گنگا اشنان کرنے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے ——" لوگ گنگا گنگا جو کہتے ہیں، سو اس میں ہے کیا؟ دو حصہ ہائیڈروجن ایک حصہ آکسیجن، یہ دونوں گیسیں ملا دیجیئے، تو یہی گنگا ہو گئی۔ اس سے زیادہ اس میں کیا ہے؟" دوسرا کہتا ہے —— بھگوان وشنو کے چرن کملوں سے یہ نکلی ہے، شنکر کی جٹاؤں میں اس نے قیام کیا ہے۔ ہزاروں عابدوں اور زاہدوں نے اس کے کنارے عبادت کی ہے۔ بے شمار نیک کام اس کے کنارے ہوئے ہیں۔ ایسی یہ پاک گنگا مائی ہے۔" اس جذبے سے متاثر ہو کر وہ اس میں نہاتا ہے۔ وہ آکسیجن اور ہائیڈروجن والا بھی نہاتا ہے۔ اب جسمانی صفائی کا پھل تو دونوں کو ملا ہی، لیکن اس بھگت کو جسمانی صفائی کے ساتھ ساتھ من کی صفائی کا بھی پھل ملا۔ یوں تو گنگا میں بیل بھی نہائے، تو اسے جسمانی صفائی حاصل ہوگی۔ جسم کی گندگی نکل جائے گی، لیکن من کا میل کیسے دُھلے گا؟ ایک کو جسمانی صفائی کا حقیر پھل ملا۔ دوسرے کو اس کے علاوہ من کی صفائی کا بیش قیمت پھل بھی ملا۔

اشنان کر کے "سورج نمسکار" کرنے والے کو ورزش کا پھل تو ملے گا ہی، لیکن وہ صحت کے لئے نمسکار نہیں کرتا، پوجا کے لئے کرتا ہے، اس لئے اس کے جسم کو صحت کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے، لیکن عقل کی چمک اور تیزی بھی بڑھتی ہے۔ صحت کے ساتھ ہی پھرتی اور روشنی بھی اسے سورج سے ملے گی۔

فعل تو وہی ہے، مگر جذبات سے اس میں فرق پڑ جاتا ہے۔ "پرمارتھی" (آخرت کی خواہش رکھنے والا) کا کیا ہوا کام روحانی ترقی کا سبب ہوتا ہے، تو دنیادار کا کام روح کو بندھن میں ڈالنے والا ہوتا ہے۔ کرم یوگی اگر کسان ہوگا، تو وہ سودھرم سمجھ کر کھیتی کرے گا۔ اس سے اس کا پیٹ ضرور بھرے گا؛ لیکن وہ اس لئے فعل

نہیں کرتا کہ اس کا پیٹ بھرے۔ بلکہ وہ غذا کو ایک ذریعہ مانے گا، جس سے اس کا جسم کھیتی کرنے کے قابل رہتا ہے۔ سودھرم اس کا مقصد اور غذا اس کا ذریعہ ہوگی۔ لیکن جو دوسرا کسان ہوگا، اس کے لئے شکم پری مقصد اور کھیتی کا سودھرم ذریعہ ہوگا۔ ایسی یہ ایک دوسرے سے متضاد حالت ہے۔

دوسرے باب میں استھت پرگیہ کی علامتیں بتاتے ہوئے، یہ بات لطیف پیرایہ میں کہی گئی ہے۔ جہاں دوسرے لوگ بیدار رہتے ہیں، وہاں کرم یوگی سوتا رہتا ہے اور جہاں دوسرے لوگ سوتے رہتے ہیں، وہاں کرم یوگی بیدار رہتا ہے۔ ہم شکم پری کے لئے بیدار رہیں گے، تو کرم یوگی اس لئے بیدار رہے گا کہ اس کا ایک لمحہ بھی بغیر کرم کے نہ رہ جائے۔ وہ کھاتا بھی ہے، تو مجبور ہوکر۔ اس پیٹ کی ہانڈی میں اس لئے کچھ ڈالنا ہے کہ ڈالنا ضروری ہے۔ دنیا دار انسان کو کھانے میں مزہ آتا ہے۔ یوگی کو کھاتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ذائقہ لے لے کر کھانا نہیں کھائے گا۔ ضبط سے کام لے گا۔ ایک کی جو رات وہی دوسرے کا دن۔ ایک کا جو دن وہی دوسرے کی رات۔ خلاصہ یہ کہ جو ایک کا سکھ وہی دوسرے کا دکھ اور جو ایک کا دکھ وہی دوسرے کا دکھ ہو جاتا ہے۔ دنیا دار اور کرم یوگی، دونوں کے فعل تو ایک ہی ہیں، لیکن کرم یوگی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پھل کی آرزو چھوڑکر کام میں محو رہتا ہے۔ دنیا دار کی طرح یوگی بھی کھائیگا، پیئے گا، سوئے گا، لیکن اس کے بارے میں اس کے جذبات جداگانہ ہوں گے۔ اسی لئے تو شروع ہی میں استھت پرگیہ کے ضبط و تقویٰ کی مورت کھڑی کر دی گئی ہے، جب کہ گیتا کے ابھی سولہ باب باقی ہیں۔

دنیا دار اور کرم یوگی دونوں کے کاموں کی مساوات اور عدم مساوات کا فرق فوراً دکھائی دے جاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کرم یوگی گئو رکشا (گایوں کی حفاظت)

کا کام کر رہا ہے، تو وہ کس نظریہ سے کرے گا؟ اس کی یہ خواہش رہے گی کہ گایوں کی خدمت کرنے سے سماج کو بھرپور دودھ ملے گا، گائے کے بہانے انسان سے نچلی حیوانی خلقت سے رشتۂ الفت جڑے گا۔ یہ نہیں کہ مجھے تنخواہ ملے گی ۔ معاوضہ ملے گا۔ معاوضہ تو کہیں گیا ہی نہیں ہے، لیکن اصلی مسرت، سچا سکھ اس پاک جذبہ میں ہے۔

کرم یوگی کا کام اسے کائنات کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ تُلسی کو پانی دیئے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے، اِس طرح نباتاتی دنیا کے ساتھ ہم نے رشتۂ الفت جوڑا ہے۔ اس طرح گائے کے ساتھ، نباتات کے ساتھ ہم رنگ ہوتے ہوتے ہمیں سارے عالم سے یک رنگ ہونا ہے۔ مہابھارت کی لڑائی میں شام ہوتے ہی اور سب لوگ سندھیا (شام کی عبادت) کرنے چلے جاتے ہیں۔ لیکن بھگوان کرشن رتھ کے گھوڑے کھول کر انھیں پانی دکھاتے ہیں، کھرا کرتے ہیں۔ ان کے جسم سے تیر نکال لیتے ہیں۔ اس خدمت میں انھیں کتنا لطف آتا تھا! یہ بیان کرتے ہوئے شاعر تھکتے ہی نہیں۔ انچر پیتامبر (پیلی پوشاک) میں دانہ لے کر گھوڑوں کو دینے والے ارجن کے اس رتھ بان کا مرقع اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا کیجئے اور کرم یوگ کے لطف کا تصور کیجئے۔ ہر عمل گویا روحانی اور عظیم ترین کارِ خیر کا عمل ہے۔ کھادی کے ہی کام کو لیجئے۔ کندھے پر کھادی کی گانٹھ رکھ کر پھیری کرنے والا کیا اُکتا نہیں جاتا؟ نہیں، کیونکہ وہ اس خیال میں مست رہتا ہے کہ دیس میں جو میرے کروڑوں ننگے بھوکے بھائی ہیں، انھیں مجھے دو روٹی کھلانی ہے۔ اس کے ایک ایک گز کھادی بیچنے کا تعلق تمام غریب اور نادار لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے۔

(۱۲) کرم یوگ کی مختلف ضرورتیں

نِش کام کرم یوگ (بے لوث کام) میں انوکھی طاقت ہے۔ ایسے کرم سے

خود اپنا اور سماج دونوں کا بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ فرض کو پورا کرنے والے کرم یوگی کا جسمانی سفر تو ہوتا ہی رہتا ہے، مگر کام میں ہر وقت لگے رہنے سے اس کا جسم بے روگ اور تندرست بھی رہتا ہے۔ اس کے اس عمل کی بدولت اس سماج کی بھی، جس میں وہ رہتا ہے، فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ کرم یوگی کسان، اس لئے کہ پیسے زیادہ ملیں گے، افیون اور تمباکو نہیں بوئے گا، کیونکہ وہ اپنے عمل کا تعلق سماج کی بھلائی کے ساتھ جوڑے ہوئے ہے۔ سودھرم مان کر کیا ہوا کرم سماج کے لئے فائدہ مند ہی ہوگا۔ جو بیوپاری یہ مانتا ہے کہ میرا یہ بیوپار سماج کے فائدہ کے لئے ہے، وہ کبھی بدیسی کپڑا نہیں بیچے گا۔ اس کا بیوپار سماج کی بھلائی کے لئے ہوگا۔ خود کو بھول کر اپنے آس پاس کے سماج سے ہم آہنگ ہونے والے کرم یوگی جس سماج میں پیدا ہوتے ہیں، اس میں خوش نظمی، خوش حالی، لطف و مرافات رہتے ہیں۔

کرم یوگی کے کام کا پھل یہ ہوتا ہے کہ اس کے جسمانی سفر سے اس کے جسم اور عقل میں تیزی رہتی ہے اور سماج کا بھی فائدہ ہوتا ہے۔ ان دو پھلوں کے علاوہ صفائی قلب کا بڑا پھل بھی اسے ملتا ہے۔ "عمل سے پاکیزگی آتی ہے۔" ایسا کہا گیا ہے۔ یعنی عمل صفائی قلب کا ذریعہ ہے، لیکن عام طور پر انسان جو عمل کرتا ہے، وہ نہیں۔ عامل جو کام بھگتی بھاؤ (عقیدت کے جذبہ) سے کرتا ہے، اس سے صفائی قلب ہوتی ہے۔ مہابھارت میں ایک تُلادھر ویش کی کہانی ہے۔ جاجلی نامی ایک برہمن اس تُلادھر ویش کے پاس گیان حاصل کرنے کے لئے جاتا ہے۔ تُلادھر اس سے کہتا ہے " بھیّا اس ترازو کی ڈنڈی کو سدا سیدھا رکھنا پڑتا ہے۔" اس بیرونی عمل کو کرتے کرتے تُلادھر کا من سیدھا اور سچّا ہو گیا۔ چھوٹا بچہ دکان میں آجائے یا جوان آدمی، اس کی ڈنڈی سب کے لئے ایک سی رہتی ہے۔ نہ اونچی نہ نیچی۔ کام کا قلب پر ہی اثر پڑتا ہے۔ کرم یوگی کے عمل کو ایک طرح کی عبادت ہی سمجھو۔ اس سے اس کی

صفائی قلب ہوتی ہے اور صاف قلب میں گیان (عرفان) کا عکس پڑتا ہے۔ اپنے طرح طرح کے کاموں سے کرم یوگی بالآخر گیان (معرفت) حاصل کرتے ہیں۔ ترازو کی ڈنڈی سے تُلادھر کو متوازن فطرت ملی۔ سینا نائی بال بنایا کرتا تھا۔ دوسروں کے سر کا میل نکالتے نکالتے اسے گیان ہوا (معرفت حاصل ہوگئی)۔ "دیکھو! میں دوسروں کے سروں کا تو میل نکالتا ہوں، مگر کیا خود اپنے سر کا یعنی اپنی عقل کا بھی میل میں نے کبھی نکالا ہے؟" ایسی روحانی بات اسے اس عمل سے سوجھنے لگی۔ کھیت کا کچرا نکالتے نکالتے کرم یوگی کو خود اپنے دِل کی بری خواہشوں کا کچرا نکالنے کی سمجھ پیدا ہو جاتی ہے۔ کچی مٹی کو روند روند کر سماج کو پکی ہانڈی دینے والا گورا کمہار اس سے یہ سبق لیتا ہے کہ مجھے اپنی زلیست کی ہانڈی بھی پکّی بنا لینی چاہیئے۔ اس طرح وہ ہاتھ میں تھپکی لے کر "ہانڈی پکّی ہے یا کچّی" یوں عارفوں اور کاملوں کی آزمائش کرنے والا ممتحن بن جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کرم یوگی جن افعال یا دھندوں کو کرتا ہے، ان کے ذریعہ سے ہی اسے اعلیٰ معرفت حاصل ہوتی ہے۔ وہ افعال کیا تھے، اس کی روحانی درسگاہ ہی تھے! اس کے وہ افعال عبادت اور خدمت سے لبریز تھے۔ دیکھنے میں تو وہ مادی ہی معلوم ہوتے تھے، لیکن اندر سے فی الحقیقت وہ روحانی تھے۔

کرم یوگی کے افعال سے ایک اور بھی عمدہ پھل ملتا ہے اور وہ ہے سماج کو ایک نمونہ کا ملنا۔ سماج میں یہ فرق تو ہے ہی کہ یہ پہلے پیدا ہوا ہے اور یہ بعد کو۔ جن کا جنم پہلے ہوا ہے، ان کے ذمہ بعد میں پیدا ہونے والوں کے لئے مثال بن جانے کا کام رہتا ہے۔ بڑے بھائی پر چھوٹے بھائی کو، ماں باپ پر بیٹا بیٹی کو، نیتا پر پیروکار کو، استاد پر شاگردوں کو، اپنے اعمال کے ذریعہ عمدہ مثال پیش کرنے کی ذمہ داری ہے۔ ایسی مثال کرم یوگی کے سوا اور کون پیش کر سکتا ہے؟

کرم یوگی ہمیشہ کام میں لگا رہتا ہے، کیونکہ کام ہی میں اس کو لطف آتا ہے۔ اس سے سماج میں ڈھونگ نہیں بڑھتا۔ کرم یوگی خود اگرچہ مطمئن ہوتا ہے، تو بھی کام کئے بغیر اس سے رہا نہیں جاتا۔ تکارام کہتے ہیں ـــ "بھجن سے بھگوان مل گیا، تو کیا اس لئے میں بھجن کو چھوڑ دوں؟ بھجن تو اب میری فطرت ثانیہ بن گیا ہے" ـــ "پہلے سنت کا ساتھ ہوا، جس کی وجہ سے تکارام 'پانڈورنگ' بن گیا۔ اس کی عبادت کا تار اب ٹوٹتا ہی نہیں۔ بھلا فطرت بھی کہیں بدلتی ہے۔"

کرم کی سیڑھی سے چڑھ کر چوٹی تک پہنچ گئے، تو بھی کرم یوگی سیڑھی نہیں چھوڑتا۔ وہ اس سے چھوٹ ہی نہیں سکتی؛ اس کی اِندریاں (حواس و آلات) کو کام کرنے کی فطری عادت پڑ جاتی ہے۔ اس طرح وہ سَودھرم (فرضِ منصبی) اور کرم (عمل) نما سیڑھی کی عظمت سماج کی نظروں میں قائم رکھتا ہے اور اس کی افادیت سماج کو جتاتا رہتا ہے۔

سماج سے ڈھونگ کا مٹنا بہت ہی بڑی چیز ہے۔ ڈھونگ اور ریاکاری سے سماج ڈوب جاتا ہے۔ عارف اگر خاموش بیٹھ جائے، تو اسے دیکھ کر دوسرے بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے لگیں گے۔ گیانی (عارف) تو مطمئن ہونے کے باعث سکونِ قلب میں محو رہ کر خاموش رہے گا، لیکن دوسرا آدمی اندر سے روتے ہوئے بھی بے عمل ہو جائے گا۔ ایک دل میں مطمئن ہو کر خاموش ہے، تو دوسرا اپنے من میں کڑھتا ہوا بھی خاموش۔ ایسی حالت بڑی بھیانک ہے۔ اس سے غرور اور ریاکاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے سارے سنت چوٹی پہ پہنچ کر بھی عمل کا دامن بڑی ہوشیاری سے پکڑے رہے ہیں۔ آخری دم تک اپنا کام کرتے رہے ہیں۔ ماں بچوں کے گڈے گڑیے کے کھیل میں لطف لیتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ یہ بناوٹی ہیں، ان کے کھیلوں میں شریک ہو کر

ان میں ذوق پیدا کرتی ہے۔ ماں اگر ان کھیلوں میں شریک نہ ہو، تو بچوں کو اس میں مزہ ہی نہیں آئے گا۔ کرم یوگی مطمئن ہو کر کام کرنا چھوڑ دے گا، تو دوسرے غیر مطمئن رہتے ہوئے بھی عمل کو ترک کر دیں گے۔ حالانکہ من کے بھوکے اور بے کیف بنے رہیں گے۔

اس لئے کرم یوگی معمولی آدمی کی طرح ہی کام کرتا رہتا ہے۔ وہ یہ نہیں مانتا کہ اس میں خود کوئی خصوصیت ہے۔ اوروں کی بہ نسبت وہ بہت زیادہ محنت کرتا ہے۔ فلاں کام اعلیٰ ہے، ایسی چھاپ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ عمل کی تشہیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم اچھے برہم چاری ہو تو اپنے کام میں اوروں کی بہ نسبت سوگنا جوش دکھاؤ۔ کم کھانا ملنے پر بھی دگنا کام ہونے دو۔ سماج کی سیوا اپنے ذریعہ زیادہ ہونے دو۔ اپنا برہمچاری پن اپنے طور طریقے میں نمایاں ہونے دو۔ چندن کی خوشبو باہر پھیلنے دو۔

خلاصہ یہ کہ کرم یوگی (عامل) پھل کی خواہش چھوڑ دینے سے بے اندازہ پھل حاصل کرے گا۔ اس کی جسمانی مسافت ہوتی رہے گی۔ جسم اور عقل میں تیزی رہے گی۔ جس سماج میں وہ حرکت کرے گا، وہ سماج سکھی ہوگا۔ اس کی صفائی قلب ہو کر اسے معرفت حاصل ہوگی اور سماج سے ڈھونگ اور اور ریاکاری مٹ کر زندگی کا پاک نمونہ ہاتھ لگے گا۔ کرم یوگ کی یہ خوبی تجربہ سے ثابت ہے۔

(۱۳) کرم یوگ کی راہ میں رکاوٹیں

کرم یوگی اپنا کام اوروں کی بہ نسبت بہتر طریقے سے کرے گا، کیونکہ اس کے لئے کرم ہی عبادت ہے۔ کام ہی پوجا ہے۔ میں نے بھگوان کی پوجا کی اور پوجا کا چڑھاوا تبرک کی شکل میں پایا! لیکن کیا یہ تبرک اس پوجا کا پھل ہے؟

جو چڑھاوے کے لئے پوجا کرے گا، اسے پرساد (تبرک) کا حصہ تو فوراً ملے گا ہی۔ لیکن جو کرم یوگی ہے، وہ اپنی عبادت کے عمل کے ذریعہ خدائی دیدار کا پھل چاہتا ہے۔ اپنے اس عمل کی قیمت اتنی تھوڑی نہیں سمجھتا کہ صرف پرساد (تبرک) ہی مل جائے۔ وہ اپنے عمل کی قیمت کم آنکنے کو تیار نہیں ہے۔ موٹے پیمانے سے وہ اپنے اعمال نہیں ناپتا۔ جس کی نگاہ موٹی ہے، اسے پھل بھی موٹا ملے گا۔ کھیتی کی مشہور کہاوت ہے ــــ گہرا بو، پر گیلا بو۔" محض گہرا جوتنے سے کام نہیں چلے گا۔ نیچے تری بھی ہونی چاہیئے۔ گہرائی اور تری دونوں ہونگی تو دانہ بڑا اور موٹا پڑے گا۔ اس لئے عمل گہرا یعنی عمدہ ہونا چاہیئے۔ پھر اس میں ایشور بھگتی اور عبودیت نما تری بھی ہونی چاہیئے۔ کرم یوگی گہرا عمل کر کے اسے خدا کی نذر کر دیتا ہے۔

روحانیت کے سلسلہ میں کچھ واہیات خیالات ہمارے اندر پھیل گئے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جسے روحانیت حاصل ہو گئی، اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں۔ کہتے ہیں کہ جو کھیتی کرتا ہے اور کھادی بنتا ہے، اسے روحانیت سے کیا واسطہ؟ لیکن یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ جو کھانا کھاتا ہے، اسے روحانیت سے کیا واسطہ؟ کرم یوگیوں کا ایشور تو کہیں گھوڑوں کو کھرّا کرتا ہے۔ راج سویگ کے وقت جوٹھی پتلیں اٹھاتا ہے۔ جنگل میں گائیں چرانے جاتا ہے۔ وہ دوارکا کا راجہ اگر پھر کبھی گوکل جائے گا، تو بنسی بجاتے ہوئے گائیں چرائے گا۔ اس لئے سنتوں نے گھوڑوں کو کھرّا کرنے والا، رتھ ہانکنے والا، پتل اٹھانے والا، لیپنے والا، کرم یوگی پرمیشور کھڑا کیا ہے اور خود بھی کوئی درزی کا، تو کوئی کمہار کا، کوئی نائی کا، تو کوئی مالی کا، تو کوئی مرے ہوئے ڈھور گھسیٹنے کا کام کرتے کرتے نجات کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔

اس ملکوتی کرم یوگ کے عزم سے آدمی دو اسباب سے ڈگمگاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں اندریوں (حواس) کی خصوصیات کو دھیان میں رکھنا چاہیئے۔ ہماری اندریاں ہمیشہ "یہ چاہیئے اور وہ نہیں چاہیئے۔" ایسے متضادے گھری رہتی ہیں۔ جو چاہیئے اس کے لئے "راگ" یعنی چاہ اور جو نہ چاہیئے اس کے لئے من میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ایسے یہ "راگ" اور "دویش" (چاہ و نفرت) آدمی کو نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ کرم یوگ ویسے کتنا بڑھیا، کتنا دلکش اور کتنا زیادہ پھل دینے والا ہے! لیکن یہ کام، کرودھ (شہوت اور غصہ، چاہ اور نفرت) "اسے لے اور اسے چھوڑ" ایسا جھگڑا ہمارے گلے باندھ کر، دن رات ہمارے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اس لئے بھگوان اس باب کے آخر میں خطرے کی گھنٹی بجاتے ہیں کہ ان کا ساتھ چھوڑ دو اور ان سے بچو۔ استقامت پر گیبہ جس طرح تقوے کی مورت ہوتا ہے، اسی طرح کرم یوگی کو بننا چاہیئے۔

اتوار ۶-۳-۳۲

چوتھا باب

کرم یوگ کی کنجی : وِکرم (اخلاص)

(۱۴) کرم کو وِکرم کا ساتھ چاہیئے

بھائیو! پچھلے باب میں ہم نے بے لوث کرم یوگ کی چھان بین کی ہے۔ سودھرم کو ٹال کر ہم اگر دوسرے کے فرض کو قبول کریں گے، تو بے لوث کام کے پھل کا حصول ناممکن ہے۔ سودیسی مال بیچنا بیوپاری کا سودھرم ہے۔ لیکن اس فرض کو چھوڑ کر جب کوئی سات سمندر پار کا بدیسی مال بیچنے لگتا ہے، تب اس کے سامنے یہی مقصد رہتا ہے کہ زیادہ نفع ملے، تو اس کام میں بے لوثی کہاں سے آئے گی؟ اس لئے عمل کو بے لوث بنانے کے لئے سودھرم کی بڑی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سودھرم بھی غرض مندانہ ہوسکتا ہے۔ اہنسا کی ہی بات ہم لیں۔ جو اہنسا کا پجاری ہے، اس کے لئے ہنسا (تشدد) تو ممنوع ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ اوپر سے اہنسک (غیر متشدد) ہوتے ہوئے بھی وہ حقیقت میں متشدد ہو؛ کیونکہ ہنسا (تشدد) من کی ایک صفت ہے۔ محض باہر سے تشدد ترک کر دینے سے ہی من کا تشدد دور ہو جائے گا، ایسی بات نہیں ہے۔ تلوار ہاتھ میں لینے سے تشدد کا رجحان ضرور ظاہر ہوتا ہے، لیکن تلوار چھوڑ دینے سے یہ ضروری نہیں کہ آدمی غیر متشدد ہو گیا۔ ٹھیک یہی بات ادائے فرض میں ہے۔ بے لوثی حاصل کرنے کے لئے پرائے دھرم سے تو بچنا ہی ہوگا، لیکن یہ بے لوثی

کی محض ابتدا ہے ۔ اس سے ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ گئے۔

اخلاص من کا وصف ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے محض فرائض سے سبکدوشی ہی کافی نہیں ہے۔ دوسرے ذریعوں کا بھی سہارا لینا پڑے گا۔ صرف تیل بتّی سے ہی چراغ نہیں جل جاتا۔ اس کے لئے لَو کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لَو ہوگی تب ہی اندھیرا دور ہوگا۔ یہ لَو کیسے پیدا کریں؟ اس کے لئے صفائی قلب کی ضرورت ہے۔ باطنی تحقیق کے ذریعہ ــ قلبی نجاست اور کوڑا کرکٹ نکال ڈالنا چاہیئے ــ تیسرے باب کے آخر میں یہی معرکہ کی بات بھگوان نے بتائی تھی، اسی میں سے چوتھے باب کا جنم ہوا ہے۔

گیتا میں لفظ "کرم" سودھرم (فرضِ منصبی) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہمارا کھانا، پینا، سونا یہ سب کرم ہی ہیں۔ لیکن گیتا کے لفظِ کرم کا مطلب ان سب افعال سے نہیں ہے، بلکہ فرضِ منصبی کی ادائیگی سے ہے۔ لیکن فرائضِ منصبی کی انجام دہی کے ذریعہ اخلاص حاصل کرنے کے لئے ایک اور چیز کی مدد بھی ضروری ہے اور وہ ہے "کام" اور "کرودھ" (شہوت اور غصہ) کو زیر کرنا۔ دِل جب تک گنگا جل کی طرح صاف اور پُرسکون نہ ہوجائے، تب تک خلوص پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح من کی صفائی کے لئے جو عمل کئے جائیں، انھیں گیتا "وِکرم" کہتی ہے۔ کرم، وِکرم اور اکرم یہ تینوں الفاظ چوتھے باب میں بڑی اہمیت کے ہیں۔ کرم کا مطلب ہے فرض کی ادائیگی کی باہری شکل۔ اس خارجی عمل میں دِل کی شمولیت ہی "وِکرم" ہے۔ باہر سے ہم کسی کو سلام کرتے ہیں۔ لیکن سر جھکانے کے اس باہری عمل کے ساتھ ہی اگر اندر سے من نہ جھکے، تو بیرونی عمل بے کار ہے۔ اندر باہر دونوں ایک ہونا چاہیئے۔ باہر سے میں شیو جی پر ہمیشہ پانی ڈالتا ہوں۔ اگر پانی کی اس دھار کے ساتھ قلبی تصور کی دھار کا تسلسل نہ رہے، تو پانی کی اس دھار کی کیا قیمت ہوگی؟ ایسی صورت میں وہ شیو بھی پتھر اور

میں بھی پتھر! پتھر کے سامنے پتھر بیٹھا — یہی اس کا مطلب ہوا۔ یہ لوٹ کرم یوگ تب ہی حاصل ہوتا ہے، جب ہمارے خارجی عمل کے ساتھ ساتھ اندر سے اِخلاصِ قلب کے جذبہ کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔

"نِش کام کرم" ان الفاظ کے استعمال میں لفظ "کرم" کی بہ نسبت لفظ "نِش کام" کو ہی زیادہ اہمیت ہے۔ جس طرح "اہنسک اسہیوگ" یعنی "غیر متشدد عدم تعاون" کے الفاظ کے استعمال میں "اسہیوگ" یعنی "عدم تعاون" کے مقابلہ میں "اہنسک" یعنی "عدم تشدد" کی صفت کو ہی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اہنسا (عدم تشدد) کو دور ہٹا کر اگر صرف "عدم تعاون" کا سہارا لیں گے، تو وہ ایک خوفناک چیز بن سکتی ہے۔ اسی طرح فرضِ منصبی کی ادائیگی کے ساتھ من کا "وِکرم" نہیں جُڑا، تو اسے دھوکہ سمجھنا چاہیئے۔

آج جو لوگ عوام کی خدمت کرتے ہیں، وہ سودھرم ہی بجا لاتے ہیں۔ جب لوگ غریب، دُکھی اور مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں، اس وقت ان کی خدمت کر کے اُنھیں خوش و خرم بنانا عمومی فرض ہے۔ لیکن اس سے یہ قیاس نہیں کر لینا چاہیئے کہ جتنے لوگ بھی عوام کی خدمت کرتے ہیں، وہ سب کرم یوگی ہو گئے ہیں۔ خدمتِ خلق کرتے ہوئے اگر من میں پاک جذبہ نہ ہو، تو اس خدمت کے بھیانک ہونے کا قوی امکان ہے۔ اپنے خاندان کی خدمت کرتے ہوئے جتنا فخر، جتنی حسد اور نفرت اور جتنی خود غرضی وغیرہ جیسی خرابیاں ممکن ہیں، وہ سب خدمتِ خلق میں بھی پیدا ہو سکتی ہیں اور ان کا عیاں نظارہ ہمیں عوام کی خدمت کرنے والی آج کل کی جماعتوں کے جھگڑے میں دکھائی دیتا ہے۔

(۱۵) کرم + وِکرم = اکرم

کرم کے ساتھ قلبی آمیزش ہونی چاہیئے۔ اس قلبی شرکت کو ہی گیتا "وِکرم" کہتی ہے۔ بیرونی فعل یعنی معمولی اور عام کام اور یہ اندرونی عمل یعنی مخصوص عمل اپنی اپنی ذہنی ضرورت کے مطابق جُدا جُدا ہوتا ہے۔ وِکرم کی مختلف قسمیں بطور نمونہ

چوتھے باب میں بتائی گئی ہیں۔ اسی کی تشریح آگے چھٹے باب سے کی گئی ہے۔ اس مخصوص عمل کی، اس قلبی تحقیق کی آمیزش جب ہم کریں گے، تب ہی اس میں بے لوثی کی روشن ہو گی۔ کرم کے ساتھ جب وکرم ملتا ہے، تو پھر دھیرے دھیرے بے غرضی اور خلوص ہمارے اندر آتے رہتے ہیں۔ اگر جسم اور قلب یہ جُدا جُدا چیزیں ہیں، تو طریقے بھی دونوں کے جُدا جُدا ہوں گے۔ جب ان دونوں میں مطابقت ہو جاتی ہے، تو مقصد ہمارے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ من ایک طرف اور جسم دوسری طرف، ایسا نہ ہو جائے، اس لئے عالموں نے دُہرا راستہ بتایا ہے۔ بھگتی یوگ (تصوف) میں باہر سے تپ (ریاضت) اور اندر سے جپ (ذکرِ قلبی) بتایا ہے۔ اپواس (روزہ) وغیرہ بیرونی تپ کے جاری رہتے ہوئے، اگر اندر سے جپ نہ ہو، تو سارا تپ فضول چلا جاتا ہے۔ ریاضت کے متعلق میرا جذبہ ہمیشہ سُلگتا اور جگمگاتا رہنا چاہیئے۔ لفظ "اُپ واس" کا مطلب یہی ہے — "بھگوان کے پاس بیٹھنا۔" اس لئے کہ ہمارا قلب پرماتما کے نزدیک رہے، دنیاوی عیش و عشرت کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن عیش و عشرت کو چھوڑنے کے بعد اگر من کے اندر بھگوان کا خیال نہ ہو، تو اس باہری اُپ واس کی کیا قیمت رہی؟ ایشور کا دھیان نہ کرتے ہوئے، اگر اس وقت کھانے پینے کی چیزوں کی فکر کریں، تو پھر جب کھانے پینے کو ہم نے ترک کیا ہے، کھانے پینے کا یہ تصور اس سے زیادہ خوفناک کھانا ہو جائے گا۔ یہ جو من میں چیزوں کے خیالات رہے، یعنی ذہنی بھوجن ہوتا رہا، اس سے بڑھ کر خوفناک چیز دوسری نہیں۔ تنتر (عمل) کے ساتھ منتر (وظیفہ) ہونا چاہیئے۔ محض باہری تنتر کی کوئی قیمت نہیں ہے اور نہ صرف بے عمل منتر کی ہی کوئی قیمت ہے۔ ہاتھ میں بھی سیوا ہو اور دِل میں بھی سیوا۔ تب ہی سچّی سیوا ہمارے ہاتھوں بن پڑے گی۔

اگر خارجی فعل میں دِل کی نرمی نہ ہوئی، تو وہ ادائے فرض روکھا سوکھا دہ

جائے گا۔ اس میں خلوص کے پھل پھول نہیں لگیں گے۔ فرض کیجئے کہ ہم نے کسی بیمار کی تیمار داری شروع کی۔ لیکن اگر اس خدمت کے ساتھ اگر من میں لطیف جذبۂ ہمدردی نہ ہوا، تو وہ تیمارداری بے کیف معلوم ہوگی اور اس سے جی اکتا جائے گا۔ وہ ایک بوجھ معلوم دے گی۔ مریض کو بھی وہ خدمت بوجھ معلوم ہوگی۔ اس میں اگر قلبی تعاون نہ ہو، تو اس سے گھمنڈ پیدا ہوگا۔ "میں نے آج فلاں کا کام کیا ہے، اسے ضرورت کے وقت میری امداد کرنی چاہیئے۔ میری تعریف کرنی چاہیئے۔ لوگوں میں میرا احترام کرنا چاہیئے۔" وغیرہ خواہشات من میں پیدا ہوں گی اور ہم مایوس ہوکر کہیں گے ــــ "ہم اس کی اتنی سیوا کرتے ہیں پھر بھی یہ بڑبڑایا کرتا ہے۔" بیمار ویسے ہی چڑچڑا رہتا ہے۔ اس کے اس طرزِ عمل سے، ایسا تیماردار جس کے من میں پُرخلوص جذبۂ خدمت نہ ہو، اُکتا جاتا ہے۔

عمل کے ساتھ جب اندرونی جذبہ کا میل ہو جاتا ہے، تو وہ عمل کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ تیل اور بتّی کے ساتھ جب لَو کا ملاپ ہوتا ہے، تو روشنی ظاہر ہوتی ہے۔ کرم کے ساتھ وِکرم کا میل ہو تو بے لوثی آتی ہے۔ بارود کے فلیتہ میں آگ لگنے سے دھماکہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک طاقت پیدا ہوتی ہے۔ کرم کو بارود کی طرح سمجھو۔ اس میں وِکرم کی بتی یا آگ لگی کہ کام ہوا۔ جب تک وِکرم آکر نہیں ملتا، اس وقت تک کرم مردہ رہتا ہے۔ اس میں جان نہیں رہتی۔ ایک بار جہاں وِکرم کی چنگاری پڑی کہ اس میں وہ طاقت پیدا ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ چٹکی بھر بارود جیب میں پڑی رہتی ہے، ہاتھ میں اچھلتی رہتی ہے، مگر جہاں اس میں بتی لگی کہ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ ادائے فرض کی بے انتہا طاقت اسی طرح پوشیدہ رہتی ہے۔ اس میں وِکرم جوڑئیے، تو پھر دیکھئے کہ کیا کیا بناؤ بگاڑ ہوتے ہیں۔ اس کے پھوٹنے سے اہنکار (خودی) کام (نفسانیت اور شہوت) اور کرودھ (غصّہ) کے پرخچے اُڑ

جائیں گے اور اس میں سے "پرم گیان" (اعلیٰ معرفت) کی بالیدگی ظاہر ہوگی۔

کرم (عمل) گیان (علم) کا فلیتہ ہے۔ ایک لکڑی کا بڑا سا ٹکڑا کہیں پڑا ہے، اسے آپ جلا دیجئے۔ وہ جگ مگ انگارہ ہو جائے گا۔ اس لکڑی اور اس آگ میں کتنا فرق ہے، لیکن اس لکڑی کی ہی وہ آگ ہوتی ہے۔ کرم میں وِکرم ڈال دینے سے کرم ملکوتی دکھائی دینے لگتا ہے۔ ماں بچے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ ایک پیٹھ ہے، جس پر ایک ہاتھ یونہی اِدھر اُدھر پھر گیا۔ لیکن اس ایک معمولی عمل سے اس ماں اور بچے کے من میں جو جذبات اُٹھے، انھیں کون بیان کر سکتا ہے؟ اگر کوئی ایسا حساب لگانے لگے کہ اتنی لمبی چوڑی پیٹھ پر اتنے وزن کا ایک ملائم ہاتھ پھیرا جائے، تو اس سے وہی لطف اور آنند پیدا ہوگا، تو یہ دل لگی ہوگی۔ ہاتھ پھیرانے کا یہ عمل بالکل چھوٹا ہے، لیکن اس میں ماں کا دِل اُنڈیلا ہوا ہے۔ اسی سے وہ بے انداز لطف حاصل ہوتا ہے۔ تلسی رامائن میں ایک لطیفہ آیا ہے— راکششوں سے لڑکر بندر آئے ہیں۔ وہ زخمی ہو گئے ہیں۔ جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ لیکن رام چندر جی کی ایک مہر آمیز نگاہ پڑنے سے ان بندروں کی تکلیف کافور ہو گئی۔ اب اگر دوسرے آدمی نے رام کی اُس وقت کی آنکھ اور نظر کا فوٹو لے کر کسی کی طرف اتنی ہی اور اسی طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ہوتا، تو کیا اس کا ویسا ہی اثر پڑتا؟ ایسا کرنے کی کوشش بھی مضحکہ خیز ہے۔

کرم کے ساتھ وِکرم کا جوڑ مل جاتا ہے، تو طاقت کا ظہور ہوتا ہے۔ اور اس میں سے اکرم (فعل کا عدم احساس) پیدا ہوتا ہے۔ لکڑی جلنے پر راکھ ہو جاتی ہے۔ پہلے کا وہ اتنا بڑا لکڑی کا ٹکڑا آخرکار چٹکی بھر راکھ بن جاتا ہے۔ اسے خوشی سے ہاتھ میں لیجئے اور سارے بدن پر مل لیجئے۔ اس طرح کرم میں وِکرم کی لَو لگا دینے سے آخر میں اکرم ہو جاتا ہے۔ کہاں لکڑی اور کہاں راکھ! کس سے

کس کا جوڑ! ان کے نیچر میں اب بالکل یکسانی نہیں رہ گئی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ راکھ اس لکڑی کے ٹکڑے ہی کی ہے۔

کرم میں وِکرم ملنے سے اکرم ہو جاتا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی کرم کیا ہے۔ اس کرم کا بوجھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ کرکے بھی اکرتا (نہ کرنے والے) رہتے ہیں۔ گیتا کہتی ہے کہ مار کر بھی تم مارتے نہیں۔ ماں بچے کو پیٹتی ہے، اس لئے تم تو اسے پیٹ کر دیکھو۔ تمہاری مار بچہ نہیں سہے گا۔ ماں مارتی ہے، پھر بھی وہ اس کے دامن میں منہ چھپاتا ہے؛ کیونکہ ماں کے اس باہری کرم میں صفائی قلب کی آمیزش ہے۔ اس کا یہ مارنا پیٹنا ایک بے لوث جذبہ کے تحت ہے۔ اس کرم میں اس کی کوئی اپنی غرض نہیں ہے۔ وِکرم کے ذریعہ سے قلبی پاکیزگی کے باعث کرم کی باہری شکل اڑ جاتی ہے۔ رام کی وہ نظر اندرونی وِکرم کی وجہ سے پریم کے امرت کا سمندر بن گئی تھی؛ لیکن رام کو اس کرم میں کوئی تکلیف نہیں کرنی پڑی تھی۔ صفائی قلب سے کیا ہوا کرم بے لوث رہتا ہے۔ اس کا خیر و شر کچھ باقی نہیں رہتا؛ ورنہ کرم کا کتنا زور، کتنا بوجھ ہمارے ذہن اور قلب پر پڑتا ہے۔ اگر یہ خبر آج ۲ بجے اڑے کہ کل ہی سارے سیاسی قیدی چھوٹ جانے والے ہیں، تو پھر دیکھو کیسی بھیڑ چاروں طرف ہو جاتی ہے۔ چاروں سمت ہلچل اور گڑبڑ مچ جاتی ہے۔ ہم کرم کے اچھے بُرے ہونے کی وجہ سے گویا مضطرب رہتے ہیں۔ کرم ہم کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ گویا کرم نے ہماری گردن دھر دبائی ہے۔ جس طرح سمندر کا بہاؤ زور سے زمین میں دھنس کر کھاڑیاں بنا دیتا ہے، اسی طرح کرم کا یہ جنجال قلب میں گھس کر غم کی خلیج پیدا کرتا ہے۔ دکھ سکھ کی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ سارا امن چین ختم ہو جاتا ہے۔ کرم ہوا اور ہو کر چلا بھی گیا، لیکن اس کا زور باقی بچ

رہتا ہے ۔ کرم دل پر حاوی ہو جاتا ہے ، پھر اس کی نیند حرام ہو جاتی ہے ۔

لیکن اگر ایسے کرم میں وِکرم کو ملا دیں ، تو پھر آپ چاہے جس قدم کام کریں اس کی تکان نہیں معلوم ہو گی ۔ دل قطب ستارہ کی طرح ساکن ، قائم اور روشن بنا رہے گا ۔ کرم میں وِکرم مِلا دینے سے وہ اکرم ہو جاتا ہے ۔ گویا کرم کو کر کے پھر اسے مٹا دیا ہو ۔

(۱۶) اکرم کا فن سنتوں سے سیکھو

یہ کرم کا اکرم کیسے ہوتا ہے ؟ یہ فن کس کے پاس ملے گا ؟ سنتوں (عارفوں) کے پاس ۔ اس باب آخر میں بھگوان کہتے ہیں :۔ " سنتوں کے پاس جا کر بیٹھو اور ان کی نصیحت سنو ۔" کرم کا اکرم کیسے ہو جاتا ہے ، اس کے بیان سے زبان عاجز اور قاصر ہے ۔ اس کا صحیح تصور قائم کرنا ہو ، تو سنتوں کے پاس جانا چاہیئے ۔ پرمیشور کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پرمیشور ہزار پھنوں والے شیش ناگ پر سوتے ہوئے پُر سکون ہیں ۔ اسی طرح سنت ہزاروں عمل کرتے ہوئے بھی ، رتّی بھر پریشانی کی لہر اپنے من کے تالاب میں اٹھنے نہیں دیتے ۔ یہ خوبی بلا سنتوں کے دروازے گئے سمجھ میں نہیں آ سکتی ۔

موجودہ زمانے میں کتابیں بہت سستی ہو گئی ہیں ۔ ایک ایک دو دو آنے میں " گیتا " اور " مناچے اشلوک " ، جس میں سوامی رام داس جی نے دل کو نصیحت کی ہے ، وغیرہ مل جاتی ہیں ۔ استادوں کی بھی کمی نہیں ۔ تعلیم سہل الحصول اور سستی ہے ۔ مدرسوں اور اسکولوں میں تو گویا علم کی خیرات ہی بٹتی ہے ۔ لیکن علم نما امرت کی غذا کی ڈکار کسی کو نہیں آتی ۔ کتابوں کے اس پہاڑ کو دیکھ کر سنتوں کی خدمت کی ضرورت دن بہ دن زیادہ دکھائی دینے لگی ہے ۔ کتابوں کی مضبوط کپڑے کی جلد کے باہر علم نہیں آتا ۔ ایسے موقعہ پر مجھے ہمیشہ ایک شعر

یاد آجاتا ہے ؎

• خواہش نفسانی اور غصہ کے پہاڑ راستے میں کھڑے ہیں، اننت (خدا) ان کے اُس پار ہے۔" نفسانیت اور غصہ کے پہاڑوں کے اُس پار ایشور رہتا ہے۔ اسی طرح ان کتابوں کے ڈھیر کے پیچھے گیان کا راجا چھپا بیٹھا ہے۔ کتب خانوں اور لائبریریوں کے چاروں طرف چھپا جانے پر بھی آدمی ابھی تک ناشائستہ اور جاہل بندر ہی دکھائی دیتا ہے۔ بڑودا میں ایک بہت بڑی لائبریری ہے۔ ایک بار ایک بزرگ ایک بڑی سی کتاب لے کر جا رہے تھے۔ اس میں تصویریں تھیں۔ وہ یہ سمجھ کر لئے جا رہے تھے کہ انگریزی کی کتاب ہے۔ میں نے پوچھا "کون سی کتاب ہے؟" انھوں نے کتاب آگے بڑھا دی۔ میں نے کہا "یہ تو فرنچ ہے۔" تو انھوں نے کہا "اچھا، فرنچ آگئی ہے" بڑی صاف روشن چھپائی، بڑھیا تصویریں، خوبصورت جلدیں، پھر علم کی کیا کمی رہی!

انگریزی زبان میں ہر سال کوئی دس ہزار نئی کتابیں تیار ہوتی ہیں اور یہی حال دوسری زبانوں کا سمجھئے۔ علم کی اتنی وسعت اور ترقی ہوتے ہوتے ہوئے بھی آدمی کا دماغ اب تک کھوکھلا کیسے بنا ہوا ہے؟ کوئی کہتا ہے "قوتِ حافظہ کمزور ہوگئی" کوئی کہتا ہے "یکسوئی نہیں ہوتی" کوئی جواب دیتا ہے "جو کچھ پڑھتے ہیں، سب ہی سچ معلوم ہوتا ہے" اور کسی کا کہنا ہے کہ "غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔" شری کرشن کہتے ہیں۔ "ارجن! بہت کچھ سُن سُنا کر تمہاری عقل چکر میں پڑ گئی ہے۔ وہ جب تک قائم اور مطمئن نہ ہوگی تمہیں یوگ حاصل نہیں ہوسکتا۔ سُننا اور پڑھنا بند کر کے اب سنتوں کی پناہ لے لو۔ وہاں کتاب زلیست پڑھنے کو ملے گی۔ وہاں کا خاموش وعظ سُن کر تیرے شکوک رفع ہو جائیں گے۔ وہاں جانے سے تجھے معلوم ہو جائے گا کہ مسلسل کارِ خدمت انجام دیتے ہوئے بھی انتہائی قلبی سکون کیسے رہ سکتا ہے اور باہر سے کرم کا زور بڑھتے ہوئے بھی قلب میں کیسے اٹوٹ موسیقی کی ستار بجائی جا سکتی ہے۔"

اتوار۔ ۱۳-۳-۳۲

پانچواں باب

اکرم کے دو پہلو : یوگ اور سنیاس

(۱۷) باہری فعل، دل کا آئینہ

دُنیا بڑی بھیانک چیز ہے۔ اکثر اسے سمندر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ سمندر میں جہاں دیکھیے پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے۔ یہی حال دنیا کا ہے۔ جدھر دیکھیے اُدھر دنیا بھری ہی بھری نظر آتی ہے۔ اگر کوئی گھر بار چھوڑ کر مخلوق کی خدمت میں لگ جاتا ہے، تو وہاں بھی اس کے من میں سنسار اپنا پڑاؤ ڈالے بیٹھا ہی ملتا ہے۔ کوئی غار میں جاکر بیٹھ جائے، تو بھی اس کی بالشت بھر لنگوٹی میں دُنیا بھری رہتی ہے۔ وہ لنگوٹی اس کی ممتا اور موہ کا ماحصل بن بیٹھتی ہے۔ جیسے چھوٹے سے نوٹ میں ہزار روپے بھرے رہتے ہیں، ویسے ہی اس چھوٹی سی لنگوٹی میں بھی بے انتہا طمع بھری رہتی ہے۔ گھر کا جنجال توڑ دیا، ضرورتیں کم کر دیں، تو اتنے سے دنیا کم نہیں ہو جاتی۔ $\frac{۱۰}{۲۵}$ کہو یا $\frac{۲}{۵}$، دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ چاہے گھر میں رہو یا جنگل میں، طمع بدستور قائم رہتی ہے۔ دُنیا ذرہ برابر کم نہیں ہوتی۔ دو یوگی بھلے ہی ہمالیہ کی کھوہ میں جاکر بیٹھ جائیں، وہاں بھی اگر ایک، دوسرے کی شہرت ان کے کانوں میں جا پڑے، تو وہ جل بھن جائیں گے۔ عوام کی خدمت کے میدانوں میں بھی ایسے ہی منظر دکھائی دے جاتے ہیں۔

اس طرح یہ دنیاوی بکھیڑے ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہیں، جن کی وجہ سے

سودھرم کی حد میں رہتے ہوئے بھی دُنیا سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔ بہتیرا اگھاڑ پچھاڑ کرنا چھوڑ دیا اور جھنجھٹیں بھی کم کردیں، اپنے دنیاوی معاملات بھی برائے نام رہنے دئیے، تو بھی موہ اور لالچ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ راکشش جیسے کبھی چھوٹے ہوجاتے ہیں اور کبھی بڑے، وہی حال اس دنیا کا ہے۔ چھوٹے ہوں یا بڑے، بہرحال ہیں وہ راکشش ہی۔ ایسے ہی نہ ٹالے جاسکنے والے معاملات، محلوں میں ہوں یا جھونپڑوں میں، ہیں ایک ہی۔ سودھرم کی قید لگا کر اگرچہ سنسار کو متوازن رکھا، تو بھی وہاں مختلف قسم کے جھگڑے پیدا ہوجائیں گے اور تمہارا جی گھبرا اٹھے گا۔ وہاں بھی مختلف جماعتوں اور مختلف اشخاص سے تمہارا واسطہ پڑے گا اور تم اُکتا جاؤ گے۔ تم کہنے لگو گے —— کہاں آ پھنسا اس آفت میں! لیکن تمہارا من کسوٹی پر بھی تب ہی چڑھے گا۔ صرف سودھرم کو اپنانے سے ہی بے لوثی نہیں آجاتی۔ کرم کی وسعت کو کم کرنا بے لوث ہوجانا نہیں ہے۔

تو پھر بے لوثی حاصل کیسے ہو؟ اس کے لئے دلی کوشش ہونی چاہیئے۔ من کا تعاون جب تک نہ ہو، اس وقت تک کوئی بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ ماں باپ کسی ادارے میں اپنا لڑکا بھیج دیتے ہیں۔ وہ وہاں سویرے اٹھتا ہے۔ سورج کو نمسکار کرتا ہے۔ چائے نہیں پیتا۔ لیکن گھر آتے ہی دو چار دن میں وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ایسے تجربات اکثر ہوتے ہیں۔ آدمی مٹی کا پُتلا تو ہے نہیں۔ اس کے من کو جس شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں، وہ اس کے من میں بیٹھنی چاہیئے۔ من اگر متاثر نہیں ہوا، تو باہر کی یہ ساری تعلیم بے کار رہے گی! اس لئے طریق عمل میں قلبی تعاون کی بہت ضرورت ہے۔

ذریعہ کی شکل میں باہر سے فرائض منصبی کی انجام دہی اور اندر سے من کا وِکرم دونوں باتیں ہونی چاہئیں۔ باہری کرم کی بھی ضرورت ہے۔ کرم کئے بغیر من کی جانچ

نہیں ہوتی۔ صبح کے پُر سکون لمحات میں ہمیں اپنا من نہایت پُر سکون معلوم ہوتا ہے، مگر جہاں ذرا بچّہ رویا کہ ہمارے اس سکون کی اصلی قیمت معلوم ہوگئی۔ اس لئے کرم کو ٹالنے سے کام نہیں چلے گا۔ باہری کرموں سے ہمارے من کی اصلی شکل ظاہر ہوجاتی ہے۔ پانی اوپر سے صاف دکھائی دیتا ہے، مگر اس میں ذرا پتھر ڈالئے، فوراً اندر کی گندگی اوپر تیر آئے گی۔ ایسی ہی حالت ہمارے من کی ہے۔ من کے بھیتری تالاب میں نیچے گھٹنے برابر گندگی جمع رہتی ہے۔ باہری چیز کے چھو جاتے ہی وہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہم کہتے ہیں، اسے غصہ آگیا، تو کیا یہ غصہ کہیں باہر سے آگیا؟ وہ اندر ہی تھا۔ من میں اگر نہ ہوتا تو باہر دکھائی ہی نہ دیتا۔

لوگ کہتے ہیں "سفید کھادی نہیں چاہیئے، وہ میلی ہوجاتی ہے۔ رنگین کھادی میلی نہیں ہوتی"۔ لیکن میلی تو وہ بھی ہوجاتی ہے، البتہ میلی دِکھائی نہیں دیتی۔ سفید کھادی کا میل دکھائی دے جاتا ہے۔ وہ کہتی ہے۔ "میں میلی ہوں، مجھے دھو ڈالو" یہ منھ سے بولنے والی کھادی لوگوں کو پسند نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارا کرم بھی بولتا ہے۔ کرم یہ تبلا دیتا ہے کہ آپ غصہ ور ہیں، خود غرض ہیں یا اور کچھ ہیں۔ کرم وہ آئینہ ہے، جو ہماری اصلی شکل ہمیں دِکھا دیتا ہے۔ اس لئے ہمیں کرم کا احسان مند ہونا چاہیئے۔ آئینہ میں اگر ہمارا چہرہ میلا کچیلا دکھائی دے، تو کیا ہم آئینہ توڑ ڈالیں گے؟ نہیں الٹا اس کا احسان مانیں گے۔ منھ دھو دھا کر پھر اس میں چہرہ دیکھیں گے۔ اِسی طرح اگر کرم کی بدولت ہمارے باطنی عیوب ظاہر ہوجاتے ہیں، تو کیا اس لئے ہم کرم سے بچنا چاہیں گے؟ کرم سے ہی اگر ہم بچتے رہیں، تو کیا اس سے ہمارا من صاف ہوجائے گا؟ اس لئے ضروری ہے کہ کرم کرتے رہیں اور اس من کی صفائی کی تیدرتی کوشش کرتے رہیں۔

ایک شخص غار میں جاکر بیٹھ گیا، وہاں اس کا کسی سے واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب اسے سکون حاصل ہوگیا۔ لیکن غار چھوڑ کر اسے کسی کے یہاں بھیک مانگنے

جانے دیجئے۔ وہاں کوئی کھلاڑی لڑکا دروازہ کی زنجیر کھٹکھٹاتا ہے۔ وہ لڑکا تو اس کھٹکھٹاہٹ کے نغمۂ ایزدی میں محو ہو جاتا ہے، مگر اس بھولے بھالے بچے کا زنجیر بجانا اس فقیر کو گوارہ نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے ـــ "بچّے نے کیا کھٹ کھٹ مچا رکھی ہے!" غار میں رہ کر اس نے اپنے من کو اتنا کمزور بنا لیا ہے کہ ذرا سا دھکّا بھی اسے برداشت نہیں ہوتا۔ ذرا کھٹ کھٹ کی آواز آئی کہ اس کا سکون رفو چکّر ہونے لگا۔ من کی ایسی کمزور حالت اچھی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اپنے قلب کی اصلی شکل سمجھنے کے لئے کرم بڑے کام کی چیز ہے۔ جب عیب دکھائی دیں گے، تو وہ دور بھی کئے جا سکیں گے۔ اگر عیب معلوم ہی نہ ہوں، تو آگے کی رفتار رک جائے گی اور ترقی ختم ہو جائے گی۔ کرم کریں گے، تو عیب دکھائی دیں گے۔ انھیں دور کرنے کے لئے وِکرم کی تجویز کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے اندر جب ایسی وِکرم کی کوششیں رات دن جاری رہنے لگیں گی، تو پھر فرض منصبی کی ادائیگی کرتے ہوئے بھی بے لوث کیسے رہیں؟ شہوت، غصہ، حرص اور طمع سے دور کیسے رہیں، یہ بات وقت آنے پر سمجھ میں آ جائے گی۔ کرم کی پاکی کی سلسل جدو جہد ہوتی رہے، تو پھر آگے چل کر پاکیزہ کرم اپنے آپ ہونے لگے گا۔ بے عیب کرم جب یکے بعد دیگرے فطری طور سے ہونے لگتے ہیں، تو پھر یکایک یہ پتہ نہیں چلتا کہ کرم کب ہو گیا۔ جب کرم فطری ہو جاتا ہے، تو وہ اکرم ہو جاتا ہے۔ فطری کرم کو ہی اکرم کہتے ہیں، یہ ہم نے چوتھے باب میں جان لیا ہے۔ کرم کا اکرم کیسے ہوتا ہے، یہ سنتوں کے قدموں کی خیر و برکت سے معلوم ہوگا، یہ بھی بھگوان نے چوتھے باب کے آخر میں بتلا دیا ہے۔ اس اکرمی حالت کو بیان کرنے سے زبان قاصر ہے۔

(۱۸) اکرم کی کیفیت

فطری کرم کو سمجھنے کے لئے ہم روزمرہ کی ایک مثال لیں۔ چھوٹا بچہ پہلے چلنا

سیکھتا ہے۔ اس وقت اسے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر ہمیں اس کے اس کھیل میں لطف آتا ہے۔ ہم کہتے ہیں ــ "دیکھو للّا چلنے لگا۔" لیکن بعد میں وہی چلنا فطری ہوجاتا ہے۔ وہ چلتا بھی رہتا ہے اور بات چیت بھی کرتا رہتا ہے۔ چلنے کی طرف دھیان بھی نہیں رہتا۔ یہی بات کھانے کے متعلق بھی ہے۔ ہم چھوٹے بچے کو "اَن پراشن" (بچے کو پہلی بار کھِلانے کی رسم) کراتے ہیں۔ گویا کھانا کھانا کوئی بڑا کام ہے۔ لیکن بعد میں وہی کھانا ایک فطری کام ہوجاتا ہے۔ آدمی جب تیرنا سیکھتا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے! پہلے دم پھول جاتا ہے، مگر بعد میں جب دوسری محنت سے تھک جاتا ہے، تو کہتا ہے ــ "چلو ذرا تیر آئیں، تو تکان دور ہوجائے۔" اب وہ تیرنا تکلیف دہ معلوم نہیں ہوتا۔ جسم یوں ہی آسانی سے پانی پر تیرتا رہتا ہے۔ تکان محسوس کرنا مَن کا فطری تقاضہ ہے۔ مَن جب کاموں میں مشغول رہتا ہے، تو تکان معلوم ہوتی ہے، لیکن جب کام فطری ہونے لگتا ہے، تو پھر اس کا بوجھ نہیں معلوم ہوتا۔ کرم گویا اکرم ہوجاتا ہے۔ کرم مسرت آمیز ہوجاتا ہے۔

کرم کو اکرم کردینا ہمارا مقصد ہے، اس کے لئے سودھرم کو عمل میں لاتا ہے۔ انھیں کرتے ہوئے عیب نظر آئیں گے، انھیں دور کرنے کے لئے وِکرم کا پلّہ پکڑنا ہوگا۔ ایسی مشق کرتے رہنے سے، مَن کی پھر ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ کرم میں تکلیف یا مشقت بالکل معلوم نہیں ہوتی۔ ہزاروں کرم ہاتھوں سے ہوتے ہوئے بھی، مَن صاف اور پرسکون بنا رہتا ہے۔ آپ آسمان سے پوچھئے ــ "بھائی آسمان! کیا تم گرمی سے جھلس نہیں جاتے؟ پانی سے بھیگ نہیں جاتے؟ سردی سے ٹھٹھر نہیں جاتے؟" تو وہ کیا جواب دے گا؟ وہ کہے گا ــ "مجھے کیا کچھ ہوتا ہے، اس کا فیصلہ تم کرو، میں کچھ نہیں جانتا۔" ــ

"پاگل ننگا ہے یا کپڑا پہنے ہے، اس کا فیصلہ لوگ خود کریں۔ پاگل کو

اس کا کچھ پتہ نہیں رہتا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ سودھرم سے تعلق رکھنے والے اعمال وِکرم کی مدد سے بے عیب بنانے کی عادت ہوتے ہوتے فطری ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے سنگین موقعے بھی مشکل معلوم نہیں ہوتے۔ کرم یوگ کی یہ ایسی کنجی ہے۔ کنجی نہ ہو، تو تالے کو توڑتے توڑتے ہاتھوں میں چھالے پڑ جائیں۔ لیکن کنجی ہاتھ لگ جانے پر پل بھر میں سب کچھ کھل جائے گا۔ کرم یوگ کی اس چابی کے باعث سب کرم آسان معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کنجی من پر قابو پا لینے سے ملتی ہے۔ اس لئے من کو قابو میں لانے کی لگاتار کوشش کرنی چاہیئے۔ کرم کرتے ہوئے جو گندگیاں دکھائی دیں، انھیں دھو ڈالنے کی تدبیر کرنی چاہیئے۔ تو پھر باہری کرموں کی جھنجھٹ معلوم نہیں ہوتی۔ کرم کا غرور ہی مٹ جاتا ہے۔ شہوت اور غصہ کی تیزی فنا ہو جاتی ہے۔ تکلیفوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ کرم کا بھی احساس باقی نہیں رہتا۔

ایک بار مجھے ایک بھلے آدمی نے خط لکھا ــ "اتنی تعداد میں رام نام کا جپ کرنا ہے، تم بھی اس میں شریک ہو اور بتاؤ کہ روز کتنا جپ کرو گے؟" وہ شخص اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کر رہا تھا۔ اسے بُرا کہنے کی میری غرض نہیں ہے۔ لیکن رام نام کچھ گننے یا ناپنے کی چیز نہیں ہے۔ ماں بچے کی سیوا کرتی ہے، تو کیا وہ اس کی رپورٹ چھپوانے جاتی ہے؟ اگر وہ رپورٹ چھپوانے لگے، تو کیا "شکریہ جناب" کہہ کر اس فرض سے سبکدوش ہو سکیں گے؟ مگر ماں رپورٹ نہیں لکھواتی۔ وہ تو کہتی ہے ــ "میں نے کیا کیا؟ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ کیا میرے لئے کوئی بوجھ ہے؟"

وِکرم کی مدد سے، صدق دلی سے، من لگا کر جب انسان کرم کرتا ہے، تب وہ کرم نہ بنا ہی نہیں، اکرم ہو جاتا ہے۔ وہاں پریشانی، تکلیف، اٹ پٹا پن جیسا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

اس حالت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دھندلا سا تصور کرایا جا سکتا ہے۔ سورج نکلتا ہے، کیا اس کے من میں کبھی یہ آتا ہے کہ میں اندھیرا ہٹاؤں گا، چڑیوں کو اُڑنے کی ترغیب دوں گا، لوگوں کو کرم کرنے پر آمادہ کروں گا؟ وہ جہاں دکھائی پڑتا ہے، وہیں کھڑا رہتا ہے۔ اس کا وجود ہی کائناتِ عالم کو حرکت دیتا ہے۔ مگر سورج کو اس کا پتہ نہیں۔ آپ اگر سورج سے کہیں گے ــــ سورج مہاراج! آپ کے بے شمار احسانات ہیں، آپ نے کتنا اندھیرا دور کیا" تو وہ چکر میں پڑ جائے گا۔ کہے گا " ذرا سا اندھیرا لا کر مجھے دکھا دو۔ اگر اسے میں دور کر سکا، تو سمجھوں گا کہ یہ میرا فعل ہے۔" کیا اندھیرا سورج کے پاس لے جایا جا سکے گا؟ سورج کے وجود سے اندھیرا دور ہوتا ہوگا، اس کی روشنی میں کوئی عمدہ کتاب پڑھتا ہوگا، تو کوئی بُری کتاب بھی پڑھ لے گا۔ کوئی آگ لگا دے گا، تو کوئی کسی کا بھلا بھی کر رہا ہوگا، لیکن اس نیکی بدی کا ذمہ دار سورج نہیں ہے۔ سورج کہتا ہے ــ " روشنی دینا میرا فطری عمل ہے۔ میرے پاس اگر روشنی نہ ہوگی، تو پھر ہوگا کیا؟ میں جانتا ہی نہیں کہ میں روشنی دے رہا ہوں۔ میرا ہونا ہی روشنی ہے۔ روشنی دینے کے کام کی تکلیف میں نہیں جانتا۔ مجھے محسوس بھی نہیں ہوتا کہ میں کچھ کر رہا ہوں۔"

جیسے سورج کا روشنی دینا فطری بات ہے، وہی حال سنتوں کا ہے۔ ان کا زندہ رہنا ہی گویا روشنی دینا ہے۔ آپ کسی گیانی سے کہیں ـ" آپ حق پرست ہیں"، تو وہ کہے گا ــ "میں اگر سچائی پر نہ چلوں تو کروں کیا، اس میں میری کیا خصوصیت ہے؟" کسی سنت میں ناحق پرستی ہو ہی نہیں سکتی۔

اکرم کا یہ ایسا پس منظر ہے۔ ذرائع اتنے سہل اور فطری ہو جاتے ہیں کہ ان کا آنا جانا معلوم ہی نہیں پڑتا۔ اندریاں ان کی عادی ہو جاتی ہیں ــ "سبک کلامی، تلقین نکوی" والی کیفیت ہو جاتی ہے۔ جب ایسی حالت ہو جاتی ہے، تو

کرم اکرم ہوجاتا ہے۔ گیانی کے لئے نیک کام فطری ہوجاتے ہیں۔ چہچہانے رہنا پرندوں کی فطرت ہے۔ ماں کی یاد آنا بچوں کی فطرت ہے۔ اسی طرح ایشور کی یاد سنتوں کی فطرت ہوجاتی ہے۔ صبح ہوتے ہوئے "ککڑوں کوں" کرنا مرغ کی فطرت ہے۔ موسیقی کے سُروں کی تعلیم دیتے ہوئے پانینی نے مرغے کی بانگ کی مثال دی ہے۔ پانینی کے وقت سے آج تک مرغ صبح بانگ دیتا ہے۔ کیا اس کے لئے کسی نے اسے سپاس نامہ پیش کیا ہے؟ مرغ کی وہ فطرت ہے۔ اسی طرح سچ بولنا، جانداروں پر رحم کرنا، کسی کی عیب جوئی نہ کرنا، سب کی سیوا اور خدمت کرنا وغیرہ اعمال نیک آدمیوں سے فطری طور پر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ کسی نے کھانا کھایا، تو کیا ہم اس کا احترام کرتے ہیں؟ کھانا، پینا، سونا جیسے جاندار دوں کی فطرت ہے، ویسے ہی خدمتی کام گیانیوں کی فطرت ہے۔ بھلائی کرنا ان کی سرشت بن جاتی ہے۔ وہ اگر کہیں کہ "میں بھلا نہیں کروں گا۔" تو ناممکن ہے۔ ایسے گیانی کا وہ عمل اکرمی حالت کو پہنچ گیا ہے، ایسا سمجھنا چاہیئے۔ اس حالت کو سنیاس نامی نہایت پاک درجہ دیا گیا ہے۔ سنیاس ہی نہایت قابل تعریف اکرمی حالت ہے۔ ایسی حالت کو کرم یوگ بھی کہنا چاہیئے۔ کرم کرتا رہتا ہے، اس لئے وہ "یوگ" ہے۔ لیکن کرتے ہوئے بھی کرتا ہے، ایسا معلوم نہیں ہوتا، اس لئے وہی "سنیاس" ہے۔ وہ کچھ ایسی ترکیب سے کرتا ہے کہ اس میں ملوث نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ "یوگ" ہے اور کر کے بھی کچھ نہیں کیا اس لئے وہ "سنیاس" ہے۔

(۱۹) اکرم کا ایک بازو: یوگ

"سنیاس" کا آخر تصور کیا ہے؟ کچھ فعل چھوڑنا اور کچھ کرنا، کیا ایسا تصور ہے؟ نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ سنیاس کی تعریف ہی ایسی ہے — "سب کرموں کو

چھوڑنا" سب کرموں سے نجات پانا، کرم ذرا بھی نہ کرنا سنیاس ہے۔ لیکن کرم نہ کرنے کا مطلب کیا؟ کرم بڑی عجیب چیز ہے۔ سارے کرموں کا سنیاس ہوگا کیسے؟ کرم تو آگے پیچھے دائیں بائیں سب طرف گھیرے ہوئے ہیں۔ بیٹھنا بھی تو ایک کرم ہی ہے نا؟ صرف علم قواعد کی نظر سے ہی "فعل" نہیں ہے، بلکہ علم الطبیعیات کے اصول سے بھی "بیٹھنا" "فعل" ہے۔ مسلسل بیٹھے رہنے سے پاؤں دُکھنے لگتے ہیں۔ بیٹھنے میں بھی محنت تو ہے ہی۔ جہاں نہ کرنا بھی کرم ثابت ہوتا ہے، وہاں "کرم سنیاس" ہوگا بھی کیسے؟ بھگوان نے ارجن کو سارے عالم کو ایک اجتماعی شکل میں دِکھایا۔ ہر طرف پھیلا ہوا وہ روپ دیکھ کر ارجن ڈر گیا اور گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آنکھیں بند کر کے دیکھا، تو اندر بھی وہی دکھائی دینے لگا۔ اب آنکھیں بند کر لینے پر بھی جو دِکھائی دیتا ہے، اس سے کیسے بچا جائے؟ نہ کرنے سے بھی جو ہوتا ہے، اسے کیسے ٹالا جائے؟

ایک شخص کی بات ہے۔ اس کے پاس سونے کے بہت بیش قیمت زیورات تھے۔ وہ انھیں ایک بڑے صندوق میں بند کرنا چاہتا تھا۔ نوکر ایک اچھا بڑا لوہے کا صندوق بنوا لایا۔ اسے دیکھ کر وہ شخص کہنے لگا۔ "تو کیسا بے وقوف ہے، گنوار کہیں کا! ارے خوب صورتی بھی تیری نگاہ میں کوئی چیز ہے کہ نہیں؟ ایسے بیش قیمت زیور رکھنا ہیں کیا یوہی کے منحوس کھدّ صندوق میں رکھے جائیں گے؟ جا، سونے کا ایک اچھا صندوق بنوا کر لا!" نوکر سونے کا صندوق بنوا کر لایا۔ "اب تالا بھی سونے کا ہی لاؤ۔ سونے کے صندوق میں سونے کا ہی تالا جچے گا۔" وہ شخص چلا تھا زیور کو چھپانے، اسے ڈھنک کر رکھنے، مگر وہ سونا چھپایا کہ کھلا؟ چوروں کو زیور ڈھونڈھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی، صندوق اڑایا اور کام بن گیا۔ مطلب یہ کہ کرم نہ کرنا بھی کرم نہ کرنے کا

ایک طریقہ ہو جاتا ہے۔ کرم جو اس قدر پھیلا ہوا ہے، اس کا سنیاس کیسے کیا جائے؟ ایسے کاموں کے سنیاس کرنے کا ڈھنگ یہی ہے کہ ایسی ترکیب کی جائے کہ جس سے دنیا بھر کے کرم کرتے ہوئے بھی وہ سب گل کر بہ جائیں۔ جب ایسا ہو سکے گا، تو کہہ سکیں گے کہ "سنیاس" حاصل ہو گیا۔ کرم کر کے بھی ان سب کا گل جانا، یہ بات آخر ہے کیسی؟ اس کی مثال بالکل سورج کی سی ہے۔ سورج رات دن کرم رہا ہے۔ رات کو بھی وہ کرم کرتا ہی ہے۔ اس کی روشنی دوسرے نصف کرہ میں کام کرتی رہتی ہے۔ لیکن اتنا کرم کرتے ہوئے بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ اس لئے چوتھے باب میں بھگوان کہتے ہیں — "میں نے یہ یوگ پہلے سورج کو سکھایا۔ پھر سورج سے بچار اور غور و فکر کرنے والے منو نے اسے سیکھا۔" چوبیس گھنٹے کرم کرتے ہوئے بھی سورج ذرہ برابر کام نہیں کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ حالت سچ مچ عجیب ہے۔

(۲۰) اکرم کا دوسرا بازو: سنیاس

مگر یہ تو سنیاس کی صرف ایک قسم ہوئی۔ کرم کر کے بھی نہیں کرنا، یہ اس کی حالت کا ایک پہلو ہوا۔ وہ کچھ بھی کرم نہیں کرتا، پھر بھی ساری دنیا کو کرم کرنے پر آمادہ کرتا ہے، یہ اس کا دوسرا پہلو ہوا۔ اس میں بے انتہا تحریکی طاقت ہے۔ اکرم کی خوبی بھی یہی ہے۔ اکرم میں لا انتہا کام کے لئے ضروری طاقت بھری رہتی ہے۔ بھاپ کی بھی یہی حالت ہے۔ اسے روک کر رکھئے، پھر دیکھئے، وہ کتنا زبردست کام کرتی ہے۔ اس رکی ہوئی بھاپ میں بے پناہ طاقت آجاتی ہے۔ وہ بڑے بڑے جہاز اور ریل گاڑیوں کو بات کی بات میں کھینچ لے جاتی ہے۔ سورج کی بھی ایسی ہی حالت ہے۔ وہ ذرہ برابر بھی کرم نہیں کرتا۔ تاہم

چوبیس گھنٹے لگاتار کام کرتا رہتا ہے۔ اس سے پوچھیں تو وہ کہے گا "میں تو کچھ نہیں کرتا"۔ رات دن کام کرتا رہتا ہے۔ اس سے پوچھیں تو وہ کہے گا۔ "میں تو کچھ نہیں کرتا"۔ رات دن کام کرتے ہوئے نہ کرنا، سورج کا ایک پہلو ہوا، ایسے ہی کچھ نہ کرتے ہوئے رات دن بے شمار کام کرنا، یہ دوسرا پہلو ہوا۔ سنیاس ان دونوں قسموں سے مزیّن ہے۔

دونوں قسمیں غیر معمولی ہیں۔ ایک میں کرم نمایاں ہے اور اکرم کی حالت چھپی ہوئی ہے۔ دوسری میں اکرم کی حالت ظاہر ہے، لیکن اس کی بدولت بے شمار کرم ہوتے رہتے ہیں۔ اس حالت میں اکرم میں کرم لبالب بھرا رہتا ہے۔ اس لئے اس سے طاقتور کام ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو پہنچے ہوئے شخص میں اور کاہل آدمی میں بڑا فرق ہے۔ کاہل آدمی تھک جائے گا، اکتا جائے گا۔ لیکن یہ اکرمی سنیاسی کرم شکتی کو محفوظ رکھتا ہے۔ ذرہ برابر بھی کرم نہیں کرتا۔ وہ ہاتھ پاؤں سے کبھی اندر ہی سے کوئی کرم نہیں کرتا۔ لیکن کچھ نہ کرتے ہوئے بھی وہ بے شمار کرم کرتا ہے۔

کسی آدمی کو غصہ آگیا۔ اگر ہماری کسی بھول سے وہ غصہ ہوا ہے، تو ہم اس کے پاس جاتے ہیں۔ وہ چپ رہتا ہے۔ بولتا نہیں۔ اب اس کی خاموشی کا، اس ترک عمل کا کتنا زبردست اثر ہوتا ہے۔ دوسرا بڑبڑاتا چلا جائے گا۔ دونوں ہیں تو غصہ میں ہی، لیکن ایک چپ ہے دوسرا بڑبڑاتا ہے۔ دونوں میں غصہ کے ہی نمونے۔ یہ نہ بولنا بھی غصہ ہی کا ایک روپ ہے، اس سے بھی کام ہوتا ہے۔ ماں یا باپ نے بچے سے بولنا بند کر دیا، تو اس کا اثر کتنا زبردست ہوتا ہے۔ بولنے کے اس کام کو چھوڑ دینے سے اور بولنا بند کر دینے سے ہی اتنا زبردست کام ہوتا ہے کہ نمایاں کام کرنے پر بھی اتنا اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نہ بولنے کا جتنا اثر ہوا،

وہ بولنے سے نہیں ہو سکتا۔ گیانی انسانوں کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔ ان کا اکرم یعنی خاموش بیٹھنا ہی بہت زبردست کام کرتا ہے، زبردست طاقت پیدا کرتا ہے۔ اکرمی رہ کر وہ اتنے کرم کرتا ہے کہ وہ سب عمل کے ذریعہ ظاہر ہی نہیں ہو سکتے۔ یہ سنیاس کی دوسری قسم ہوئی۔

ایسے سنیاسی کا سارا رجحان، اس کی ساری جدوجہد ایک آسن پر آکر ٹھہر جاتی ہے۔ ــ مجاہدات کی ریل پیل ختم ہو گئی۔ بھگوان نے یہ گٹھری ٹھیک سے باندھ دی ہے۔ میں قطعی مطمئن ہو گیا ہوں اور مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ میں تاریکی سے نکل کر اجالے میں آگیا ہوں۔ بھگوان نے میری یہ خودی پامال کر دی ہے۔ تکا کہتا ہے کہ اب زندگی میں مجھے اپنے وجود کا احساس نہیں۔

تکا کہتے ہیں ــ "میں اب خالی ہو گیا ہوں۔ گٹھری ہو کر پڑا ہوں۔ سب مجاہدات ختم ہو گئے۔" تکا خالی ہو گئے۔ لیکن اس خالی برسے میں زبردست تحریکی طاقت ہے۔ سورج خود بخود آواز نہیں لگاتا، لیکن اسے دیکھتے ہی پرندے اڑنے لگتے ہیں۔ میمنے ناچنے لگتے ہیں، گائیں بن میں چرنے جاتی ہیں، مہاجن دکان کھولتے ہیں، کسان کھیت پر جاتے ہیں۔ دنیا کے مختلف کاروبار شروع ہو جاتے ہیں۔ سورج رہے، یہی کافی ہے۔ اتنے ہی سے بے انتہا کرم شروع ہو جاتے ہیں۔ اکرمی حالت میں بے شمار کرموں کی تحریک بھری رہتی ہے۔ کرم کرنے کی قوت ٹھسا ٹھس بھری ہوتی ہے۔ ایسی یہ سنیاس کی دوسری نرالی قسم ہے۔

(۲۱) دونوں کا موازنہ کون کر سکتا ہے؟

پانچویں باب میں سنیاس کے دو طریقوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ایک چوبیسوں گھنٹے کرم کرکے بھی کچھ نہیں کرتا اور دوسرا ایک لمحہ بھی کچھ نہ کرکے سب کچھ کرتا ہے۔ ایک بول کر نہ بولنے کا طریقہ، تو دوسرا نہ بول کر بولنے کا طریقہ۔ ان دو طریقوں کا ہی یہاں موازنہ کیا گیا ہے۔ یہ جو دونوں ملکوتی طریقے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ انھیں جانچیں

ان پر غور و فکر کریں، اس میں بے انتہا لطف ہے۔

یہ مضمون ہی اعلیٰ اور بے نظیر ہے۔ سچ مچ سنیاس کا یہ تصور نہایت پاکیزہ اور خوب صورت ہے۔ جس کسی نے یہ خیال یہ تصور پہلے پہل ڈھونڈ نکالا، اس کو جتنی بھی مبارک باد دی جائے کم ہے۔ یہ بڑا نورانی تصور ہے۔ انسانی غور و فکر نے آج تک جتنی اونچی اڑانیں ماری ہیں، ان سب میں اعلیٰ اور بلند پرواز سنیاس تک پہنچی ہے۔ اس کے آگے ابھی تک کوئی اُڑان نہ مار سکا۔ پروازِ فکر تو جاری ہے، لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ بچار اور تجربہ میں اتنی بلند پرواز کسی نے کی ہو۔ ان دو طریقوں کے سنیاس کا محض تصور ہی آنکھوں کے سامنے آجانے سے، بے انتہا لُطف حاصل ہوتا ہے۔ مگر جب ہم قول و عمل کی اس دنیا میں آجاتے ہیں، تب وہ لُطف کم ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نیچے گر رہے ہیں۔ میں ہمیشہ دوستوں سے اس کے متعلق کہتا رہتا ہوں۔ سال ہا سال سے ان ملکوتی خیالات پر میں غور و فکر کر رہا ہوں۔ یہاں زبان عاجز اور ناقص ثابت ہوتی ہے۔ اسے الفاظ کا جامہ پہنانا ممکن نہیں ہے۔

نہ کر کے سب کچھ کر ڈالا اور سب کچھ کر کے کچھ بھی نہیں کیا، یہ کتنا عظیم، پُر لُطف اور شاعرانہ تصور ہے! اب شاعری اور کیا باقی رہی؟ جو کچھ شاعری کے نام سے مشہور ہے، وہ سب اس کے آگے پھیکا ہے۔ اس تصور میں جو لُطف، جو اُمنگ، جو حوصلہ اور جو پاکیزگی ہے، وہ کسی شاعری میں نہیں ہے۔ اس طرح یہ پانچواں باب نہایت اونچے پس منظر پہ قائم کیا گیا ہے۔ چوتھے باب تک کرم، وکرم بتا کر یہاں نہایت ہی بلند پرواز کی ہے۔ یہاں اکرمی حالت کی دو قسموں کا نمایاں طور پر موازنہ کیا گیا ہے۔ یہاں زبان لڑکھڑاتی ہے۔ "کرم یوگی" بڑا یا "کرم سنیاسی"؟ کرم کون زیادہ کرتا ہے، یہ کہنا ممکن ہی نہیں۔ سب کچھ کر کے بھی کچھ نہ کرنا اور کچھ

بھی نہ کرتے ہوئے سب کچھ کرنا۔ یہ دونوں یوگ ہی ہیں۔ لیکن موازنے کے لئے ایک کو یوگ کہا ہے اور دوسرے کو سنیاس۔

(۲۲) جیومیٹری اور مفسّرین کی مثال

تو اب ان کا موازنہ کیسے کیا جائے؟ اس کے لئے مثال ہی سے کام لینا پڑے گا۔ جب مثال دی جاتی ہے، تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نیچے گر رہے ہیں۔ مگر نیچے گرنا ہی ہوگا۔ سچ پوچھئے تو مکمل سنیاس اور مکمل کرم یوگ یہ ایسے تصورات ہیں جو اس جسم میں نہیں سما سکتے، وہ اس کو توڑ پھوڑ ڈالیں گے۔ لیکن جو عظیم انسان اس تصور کے نزدیک پہنچ گئے ہیں، ان کی مثال سے ہمیں کام لینا ہوگا۔ مثالیں تو ہمیشہ ادھوری رہنے والی ہیں، لیکن تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لینا ہوگا کہ وہ مکمل ہیں۔

جیومیٹری میں جیسے کہتے ہیں کہ فرض کرو کہ الف، ب، ج، ایک مثلث ہے۔ بھلا "فرض" کیوں کر لیں؟ کیونکہ اس مثلث کے خطوط واقعی خطوط نہیں ہیں۔ خط کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس میں لمبائی ہے، چوڑائی نہیں۔ تختے پر بنا چوڑائی کے یہ لمبائی کیسے دکھائی جائے؟ لمبائی جہاں کھینچی کہ چوڑائی آ ہی جاتی ہے۔ جو خط بھی ہم کھینچیں گے، اس میں کچھ نہ کچھ چوڑائی ضرور رہے گی۔ اس لئے جیومٹری میں "خط" مان لئے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔ عقیدت کی بھی ایسی ہی بات ہے؟ وہاں بھی بھگت کہتا ہے — "اس چھوٹی سی شالگرام کی بٹیا میں سارے جگت کا ایشور موجود ہے، یہ" مانو"! اگر کوئی کہے — "یہ کیا پاگل پن ہے!" تو اس سے کہو — "تمہاری جیومیٹری کیا پاگل پن ہے؟ صاف صاف موٹا خط دکھائی دیتا ہے اور کہتے ہو کہ اسے بغیر چوڑائی کا مانو، یہ کیا پاگل پن ہے! خوردبین سے دیکھو گے، تو وہ آدھ انچ چوڑا دکھائی دے گا۔ جیسے تم اپنی جیومیٹری میں مانتے ہو، ویسے ہی عقیدت کہتی ہے کہ اس شالگرام میں پرمیشور مانو۔" اب اگر کوئی یہ کہے کہ "پرمیشور نہ ٹوٹتا ہے، نہ پھوٹتا ہے، تمہارا یہ شالگرام

تو ٹوٹ جائے گا۔ گگاؤں ایک چوٹ ؟" تو یہ عقل مندی نہیں کہی جائے گی، کیونکہ جب جیومیٹری میں " مانو" تو پھر بھگتی شاستر" میں کیوں نہیں چلنا چاہیے ؟ نقطہ کو کہتے ہیں " مانو" اور تختے پر نقطہ ظاہراطور پر بناتے ہیں۔ نقطہ بھی اچھا خاصا گولا ہوتا ہے۔ اس کی تعریف گویا ایشور کی ہی تعریف ہے۔ نہ لمبائی، نہ چوڑائی، نہ موٹائی ۔ یہ سب کچھ بھی نہیں۔ تاہم تعریف تو ایسی ہی کرتے ہیں اور پھر اسے تختہ پر بنا کر دکھاتے ہیں۔ مگر نقطہ تو غیر متشکل ہے۔ ہر سہ جہات سے معرّا۔ مطلب یہ کہ سچا مثلث، سچا نقطہ تو تصور ہی میں رہتا ہے، لیکن ہمیں اسے مان کر چلنا پڑتا ہے۔ بھگتی شاستر میں بھی شالگرام کی بٹیا میں نہ ٹوٹنے پھوٹنے والا اور سب میں رہنے والا پرمیشور ماننا پڑتا ہے۔ ہم بھی ایسی ہی قیاسی مثال لے کر ان کا موازنہ کریں گے۔

میمانسکوں (ویدوں کے مفسرین) نے ایک بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ پرمیشور کہاں ہے ۔ اس کا بیان کرتے ہوئے بڑی حسین تشریح کی ہے۔ ویدوں میں اِندر اگنی، ورُن وغیرہ دیوتا ہیں۔ ان دیوتاؤں کے بارے میں ایک سوال کیا گیا ہے ۔ " یہ اِندر کیا ہے ؟ اس کی شکل کیسی ہے ؟ یہ رہتا کہاں ہے ؟" مفسرین جواب دیتے ہیں ۔ لفظ "اِندر" ہی اِندر کی شکل ہے۔ لفظ "اِندر" ہی میں وہ رہتا ہے۔ "الف" اور اس پر "نون غنہ"، پھر "د"، پھر "ر" ۔ یہی اس کی شکل ہے۔ وہی اس کی صورت، وہی اس کی تفصیل۔ وَرُن دیوتا کیسے ہیں ؟ ویسے ہی۔ پہلے "و"، پھر "ر"، پھر "ن" و، ر، ن ۔ یہ "وَرُن" کی شکل۔ اسی طرح اگنی وغیرہ دیوتاؤں کے بارے میں سمجھئے۔ یہ سب دیوتا حروف کا روپ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ سب دیوتا حرف نما صورت ہیں۔ اس تصور میں، اس خیال میں بڑی مٹھاس ہے ۔ " دیو " کا تصور ۔ دیو ایسی چیز کہی ڈیل ڈول میں نہ سمانے جیسی ہے۔ اس تصور کو ظاہر کرنے کے لئے حرف ہی کی علامت کافی ہے۔ ایشور کیسا ہے ؟ تو پہلے "ای" پھر "شو" پھر

"بڑ" آخر میں " اوم " نے تو کمال ہی کر ڈالا۔ " اوم " حرف ہی ایشور ہو گیا۔ ایشور کے تصور کے لئے وہ ایک علامت ہو گیا۔ ایسی علامتیں بنانی پڑتی ہیں، کیونکہ مورت کی بناوٹ میں یہ وسیع تصورات سما ہی نہیں سکتے ؛ مگر انسان کی خواہش بڑی زبردست ہوتی ہے۔ وہ ان تصورات کو مورت میں داخل کرنے کی تدبیر کرتا ہی ہے۔

(۴۳) یوگی اور سنیاسی ایک ہی.....

سنیاس اور یوگ، یہ بہت اونچی اڑانیں ہیں۔ مکمل سنیاس اور مکمل یوگ کا تصور ہمارے جسم میں نہیں سما سکتا۔ بھلے ہی جسم میں نہ سما سکے، تو بھی تصور میں ضرور سما جاتا ہے۔ کامل یوگی اور کامل سنیاسی تو تصور میں ہی رہنے والے ہیں۔ وہ محض نصب العین اور ناقابل حصول رہیں گے۔ لیکن مثال کے طور پر ایسے اشخاص لینے ہوں گے، جو ان تصورات کے زیادہ سے زیادہ نزدیک پہنچ چکے ہوں اور پھر اقلیدس کی طرح کہنا ہوگا کہ اسے " پورا یوگی " اور پورا " سنیاسی " سمجھو۔ سنیاس کی مثال دیتے وقت شک اور یاگ ولکیہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ادھر کرم یوگی کی شکل میں جنک اور شری کرشن کا نام خود بھگوت گیتا میں لیا گیا ہے۔ لوک مانیہ تلک نے " گیتا رہسیہ " میں ایک فہرست بھی ایسے ناموں کی دی ہے۔ " جنک، شری کرشن وغیرہ اس راستہ سے گئے، شک اور یاگیہ ولکیہ وغیرہ اس راہ سے گئے۔ " لیکن ذرا غور کرنے سے یہ فہرست نقش بر آب کی طرح مٹ جائے گی۔ یاگیہ ولکیہ سنیاسی تھے، جنک کرم یوگی۔ یعنی سنیاسی یاگیہ ولکیہ کے کرم یوگی جنک چیلے تھے، لیکن اسی جنک کے چیلے شک دیو سنیاسی ہوئے۔ یاگیہ ولکیہ کے شاگرد جنک اور جنک کے شاگرد شک۔ سنیاسی، پھر کرم یوگی، پھر سنیاسی ـــ ایسا یہ سلسلہ بنتا ہے۔ اس طرح یوگ اور سنیاس ایک ہی سلسلہ میں آجاتے ہیں۔

شک دیو سے ویاس نے کہا۔ " بٹیا شک ! تم گیانی تو ہو، لیکن گرو کی مہر ابھی

تم پر نہیں لگی ہے۔ اس لئے تم جنک کے پاس جاؤ۔" شُک دیو چلے۔ جنک اپنے وسیع محل کی تیسری منزل پر دیوان خانہ میں مقیم تھے۔ شُک تھے تن باسی، شہر دیکھتے بھالتے چلے۔ جنک نے شک دیو سے پوچھا۔ "کیوں آئے؟" شُک نے جواب دیا۔ "گیان حاصل کرنے کے لئے۔" "کس نے بھیجا؟" "ویاس دیو نے۔" "کہاں سے آئے؟" "آشرم سے۔" "یہاں آتے ہوئے بازار میں کیا کیا دیکھا؟" "چاروں طرف ایک ہی شکر کی مٹھائی سجی دکھائی دی۔" "اور کیا دیکھا؟" "بولتے چالتے شکر کے پُتلے دیکھے۔" "پھر کیا دیکھا؟" "یہاں آتے ہوئے شکر کی سخت سیڑھیاں ملیں۔" "پھر کیا ملا؟" "شکر کی مورتیں یہاں بھی ہر طرف دیکھیں۔" "اب کیا دکھائی دے رہا ہے؟" "ایک شکر کا پتلا دوسرے شکر کے پُتلے سے بات کر رہا ہے۔" جنک جی نے کہا۔ "جاؤ، تم کو سب گیان مل چکا۔" شُک دیو کو جنک کی جو دستخطی سند درکار تھی، وہ مل گئی۔ مدعا یہ کہ کرم یوگی جنک نے سنیاسی شُک دیو کو چیلے کے روپ میں پاس کر دیا۔ شک تو سنیاسی ہی تھے، لیکن یہ موضوع کیسا پُر لطف ہے!

راجا پریکشت کو یہ بد دعا ملی کہ "سات دِن میں تمہاری موت آجائے گی۔" راجہ کو مرنے کی تیاری کرنی تھی۔ اُسے ایسا گرو چاہیئے تھا، جو بتائے کہ مریں کیسے؟ اس نے شُک آچاریہ کو بُلایا۔ شُک دیو جو آکر بیٹھے تو ۲۴ × ۷ = ۱۶۸ گھنٹے مسلسل پالتی مار کر بھاگوت سناتے رہے۔ جو آسن جمایا، تو پھر چھوڑا ہی نہیں۔ ایک سی کتھا کہتے ہی رہے۔ "تو اس میں کون سی بڑی بات ہے؟" بڑی بات یہ کہ برابر، سات دِن تک ان کو بھاری محنت کرنی پڑی، پھر بھی وہ انھیں کچھ معلوم نہیں ہوئی۔ لگاتار کرم کرتے ہوئے بھی وہ گویا کرم کر ہی نہیں رہے تھے۔ محنت کا کوئی خیال ہی نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ سنیاس اور کرم یوگ، یہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں

ہیں ہی نہیں۔

اسی لئے بھگوان کہتے ہیں ہے۔ "سنیاس اور یوگ کو جو ایک روپ دیکھتا ہے، وہی سچا دیکھنے والا ہے۔" ایک نہ کرتے ہوئے کرتا ہے اور دوسرا کرکے بھی کچھ نہیں کرتا۔ جو سچ پوچھ۔ اونچے درجے کا سنیاسی ہے، جس کی سمادھی (محویت) ہمیشہ لگی رہتی ہے، جو پاک باز ہے، ایسے سنیاسی دس دن ہمارے آپ کے بیچ میں آکر رہیں، تو کتنی روشنی اور کتنی طاقت ملے گی! سالہا سال کام کا ڈھیر لگا کر بھی جو نہیں ہوا، وہ صرف اس کے درشن سے، محض اس کی موجودگی سے ہوجائے گا۔ تو تو دیکھ کہ اگر من میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، مردہ لوگوں کی تصویر کو سے اگر بھگتی، پریم اور پاکیزگی دل میں بیدار ہوتی ہے، تو زندہ سنیاسی کو دیکھنے سے کتنا فیض ہوگا! سنیاسی اور یوگی دونوں سنسار کی بھلائی کرتے ہیں۔ ایک جگہ اگر باہر سے ترکِ عمل دکھائی دیا، تو بھی اس ترکِ عمل میں کرم لبالب بھرا ہے۔ اس میں بے انتہا طاقت بھری ہوئی ہے۔ گیانی سنیاسی اور گیانی کرم یوگی دونوں ایک ہی تخت پر بیٹھنے والے ہیں۔ نام مختلف ہونے پر بھی مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ ایک ہی حقیقت کے یہ دو پہلو یا دو رنگیں ہیں۔ مشین جب تیزی سے گھومتی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قائم ہے، گھوم نہیں رہی ہے۔ سنیاسی کی حالت بھی ایسی ہوتی ہے۔ اس کے سکون و قیام سے بے انتہا قوت اور بے پایاں تحریک نکلتی ہے۔ مہاویر، بدھ، نورتی ناتھ، ایسی ہی نورانی ہستیاں تھیں۔ سنیاسی کی تمام کوششوں کی دوڑ ایک مرکز پر قائم ہوجائے، تب بھی وہ بھاری کرم کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ یوگی ہی سنیاسی ہے اور سنیاسی ہی یوگی۔ دونوں میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ لفظ الگ الگ ہیں مگر مطلب ایک ہے۔ پتھر کے معنی سنگ اور سنگ کے معنی پتھر جیسے ہیں، ویسے ہی کرم یوگی

کے معنی سنیاسی اور سنیاسی کے معنی کرم یوگی ہیں۔

(۲۴) .....مگر کرم یوگ سنیاس سے افضل ہے

بات اگرچہ ایسی ہی ہے، تاہم بھگوان نے ایک طرہّ لگا رکھا ہے۔ بھگوان کہتے ہیں ہے" سنیاس سے کرم یوگ بڑھ کر ہے۔" جب دونوں ایک سے ہیں، تو پھر بھگوان نے ایسا کیوں کہا؟ یا پھر یہ دل لگی ہے۔ جب بھگوان کہتے ہیں کہ 'کرم یوگ" بڑا ہے، تب سادھک (عارف) کے نقطۂ نظر سے کہتے ہیں۔ بالکل کرم نہ کرتے ہوئے سب کرم کرنے کا طریقہ ایک سدھ (سالک) کے لئے ہی ممکن ہے، سادھک (عارف) کے لئے نہیں۔ لیکن سب کرم کرکے بھی کچھ نہ کرنا، اس کی تھوڑی بہت نقل کی جا سکتی ہے۔ ایک ترکیب ایسی ہے جو سادھک کے لئے ناممکن ہے، صرف سدھ کے لئے ہی ممکن ہے۔ دوسری ایسی ہے، جو سادھک کے لئے بھی تھوڑی بہت ممکن ہے۔ بالکل کرم نہ کرتے ہوئے، کرم کیسے کرنا، یہ عامل کے لئے ایک پہیلی ہی رہے گی۔ یہ اس کے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ کرم یوگ سادھک کے لئے ایک راستہ بھی ہے اور منزل بھی ہے۔ لیکن سنیاس تو آخری منزل پر ہی ہے، راستہ پر نہیں ہے۔ اسی وجہ سے سادھک کے نقطۂ نظر سے سنیاس کے مقابلہ میں کرم یوگ بہتر ہے

اسی اصول پر بھگوان نے آگے بارہویں باب میں نرگن (غیر متشکل) کی بہ نسبت سگن (متشکل) کو خصوصیت دی ہے۔ سگن میں سب حواسوں کے لئے کام ہے، نرگن میں ایسا نہیں ہے۔ نرگن میں ہاتھ بیکار، پاؤں بے کار، آنکھیں بے کار ــــ سبھی حواس فعل سے مبرّا رہتے ہیں۔ سادھک سے یہ سب ممکن نہیں ہے۔ لیکن سگن میں ایسی بات نہیں ہے۔ آنکھوں سے روپ دیکھ سکتے ہیں، کانوں سے حمد سن سکتے ہیں، ہاتھ سے پوجا کر سکتے ہیں، لوگوں کی

سیوا کر سکتے ہیں، پاؤں سے تیرتھ یاترا کر سکتے ہیں۔ اس طرح کل حواسوں کو کام میں لگا کر ان سے ایسا کام کراتے ہوئے، دھیرے دھیرے انہیں خالق کے حوالہ کر دینا، سگن میں ممکن ہے۔ لیکن نرگن میں یہ سب بند، زبان بند، کان بند، ہاتھ پیر بند، یہ سب بندشیں دیکھ کر بیچارہ عامل گھبرا جاتا ہے! پھر اس کے دل میں نرگن بیٹھے گا کیسے؟ وہ اگر خاموش بیٹھا رہے گا، تو اس کے دل میں فضول خیالات آنے لگیں گے۔ حواس کی یہ فطرت ہے کہ اگر ان سے کہیں کہ نہ کرو، تو وہ ضرور کریں گے۔ اشتہاروں میں کیا ایسا نہیں ہوتا؟ اوپر عنوان میں لکھتے ہیں "مت پڑھو" تو پڑھنے والا من میں کہتا ہے کہ نہ پڑھنے کو لکھا ہے، تو پہلے اسی کو پڑھونا! "مت پڑھو" لکھنا اسی مقصد سے ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اسے ضرور پڑھے۔ آدمی اسے غور سے پڑھتا بھی ضرور ہے۔ نرگن میں من بھٹکتا رہے گا۔ سگن بھگتی کی ایسی بات نہیں ہے۔ وہاں آرتی ہے، پوجا ہے، سیوا ہے، سب پر مہربانی ہے۔ اندریوں کے لئے وہاں کام ہے۔ ان حواس کو ٹھیک کام میں لگا کر من سے کہو — "اب جاؤ جہاں جی چاہے۔" مگر تب من نہیں جائے گا۔ وہیں ٹھہرا رہے گا، خود بخود یکسو ہو جائے گا۔ لیکن اگر اسے ایک جگہ بٹھانا چاہو گے، تو وہ بھاگ ہی کھڑا ہوگا۔ مختلف حواس کو عمدہ اور نیک کاموں میں لگا دو، پھر من کو خوشی سے بھٹکنے کے لئے کہہ دو۔ وہ نہیں بھٹکے گا۔ اسے جانے کی بالکل چھٹی دیدو، تو وہ کہے گا — "لو میں یہیں بیٹھ گیا۔" اگر اسے حکم دیا کہ "چپ بیٹھو" تو وہ کہے گا "میں یہ چلا۔"

انسان کے لئے سہولت کے نقطۂ نظر سے نرگن کی بہ نسبت سگن بہتر ہے۔ کرم کرتے ہوئے بھی اسے اڑا دینے کی ترکیب، کام نہ کرتے ہوئے کرم کرنے کی بہ نسبت بہتر ہے! کل حواسوں کو اپنے بس میں کر کے دھیرے دھیرے تمام دھندوں

ے من ہٹانے کی مشق کرم یوگ میں کی جاسکتی ہے۔ یہ ترکیب آج نہ کامیاب ہوئی، تو کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہوگی. کرم یوگ کی پیروی آسان ہے۔ سنیاس کے مقابلہ میں یہی اس کی خصوصیت ہے. لیکن بحالتِ کمال کرم یوگ اور سنیاس دونوں ایک ہی ہیں. پورا سنیاس اور پورا کرم یوگ، دونوں ایک ہی ہیں، نام دو ہیں. دیکھنے میں الگ الگ ہیں، لیکن اصل میں ہیں دونوں ایک ہی۔ ایک میں کرم کا بھوت باہر ناچتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر اندر سکون رہتا ہے۔ دوسرے میں کچھ نہ کرتے ہوئے تینوں لوک (سہ جہات) کو ہلا ڈالنے کی طاقت ہے۔ جو دکھائی پڑتا ہے، وہ نہیں ہے — یہ دونوں کی شکلیں ہیں. مکمل کرم یوگ سنیاس، تو مکمل سنیاس کرم یوگ ہے۔ کوئی فرق نہیں ہے. لیکن سادھک کے لئے کرم یوگ آسان ہے۔ بحالتِ کمال دونوں ایک ہی ہیں۔

گیان دیو کو چانگ دیو نے ایک خط بھیجا۔ وہ ایک کورا کاغذ تھا. چانگ دیو سے گیان دیو عمر میں چھوٹے تھے۔ "چرنجیو" (طول عمرہٗ) لکھتے ہیں، تو گیان دیو علم میں بہتر. "پوجیہ" (محترم) لکھیں تو عمر میں کم۔ اب القاب ہی کیا لکھیں؟ کچھ طے نہیں ہوتا تھا. اس لئے چانگ دیو نے کورا کاغذ ہی بھیج دیا۔ پہلے تو وہ نورتی ناتھ کے ہاتھ پڑا۔ انھوں نے اسے پڑھ کر گیان دیو کو دے دیا۔ گیان دیو نے پڑھا اور مکتا بائی کو دے دیا۔ مکتا بائی نے پڑھ کر کہا — "چانگ دیو اتنا بڑا ہو گیا، مگر رہا کورے کا کورا ہی۔" نورتی ناتھ نے اور ہی مطلب سمجھا۔ انھوں نے کہا — "چانگ دیو کورے ہیں، پاک ہیں، صاف ہیں، نصیحت دینے والے ہیں۔" پھر گیان دیو سے خط کا جواب دینے کے لئے کہا۔ انھوں نے ۶۵ اودیوں[1] کا خط لکھ بھیجا۔ اسے "چانگ دیو پاشنٹی" کہتے ہیں۔ اس خط کا ایسا دل کش قصہ ہے۔ لکھا ہوا پڑھنا آسان ہے، مگر نہ لکھا

[1] اودیو، ایک مروجہ مراٹھی چھند

ہوا پڑھنا مشکل ہے۔ اس کا پڑھنا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح سنیاسی خالی کورا نظر آتا ہے، تو بھی اس میں بے پایاں عمل بھرا رہتا ہے۔

سنیاس اور کرم یوگ بدرجہ کمال دونوں کی قیمت ایک ہی ہے، لیکن کرم یوگ عملی قیمت میں زیادہ ہے۔ کسی ایک نوٹ کی قیمت پانچ روپیہ ہے۔ سونے کا سکہ بھی پانچ روپے کا ہوتا ہے۔ جب تک سرکار قائم رہتی ہے تب تک دونوں کی قیمت یکساں ہے۔ لیکن اگر سرکار بدل گئی، تو پھر للی دین میں اس نوٹ کی قیمت ایک پائی بھی نہیں رہتی۔ لیکن سونے کے سکے کی قیمت ضرور کچھ نہ کچھ مل جائے گی، کیوں کہ آخر وہ سونا ہے۔ بحالتِ کمال ترکِ عمل اور کرم یوگ دونوں کی قیمت ایک سی ہے؛ کیونکہ گیان دونوں میں برابر ہے۔ گیان کی قیمت اننت (لا انتہا) ہے۔ اننت میں کچھ ملاؤ تو قیمت اننت ہی رہتی ہے، علم حساب کا یہ اصول ہے۔ کرم تیاگ (ترکِ عمل) اور کرم یوگ جب مکمل گیان میں مل جاتے ہیں، تو دونوں کی قیمت برابر ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر گیان کو دونوں طرف سے ہٹا لیا، تو پھر کرم تیاگ کی بہ نسبت کرم یوگ ہی عامل کے لئے بہتر ثابت ہوگا۔ ٹھوس خالص علم دونوں طرف لیا جائے، تو قیمت ایک سی رہتی ہے۔ منزل پر پہنچ جانے پر گیان + کرم = گیان + اکرم۔ لیکن گیان کو دونوں طرف سے گھٹا دیجئے، تو پھر اکرم کی بہ نسبت کرم ہی سادھک کے لئے بہتر ٹھہرے گا۔ نہ کر کے کرنا سادھک کی سمجھ میں ہی نہیں آسکتا۔ کر کے نہ کرنا وہ سمجھ سکتا ہے۔ کرم یوگ راستہ میں بھی ہے اور منزل پر بھی ہے، لیکن سنیاس صرف منزل پر ہی ہے۔ راستہ میں نہیں ہے۔ اگر یہی بات شاستر (شریعت) کی زبان میں کہنی ہو، تو کرم یوگ ذریعہ بھی ہے اور مقصد بھی ہے مگر سنیاس صرف عقیدت ہے۔ اور عقیدت کے معنی ہیں آخری منزل۔

اتوار ۲۰-۳-۳۲

چھٹا باب

رُجحانات کی رُوک تھام

(۲۵) نجات کی تمنّا

پانچویں باب میں ہم نے تکرو تصوّر کے ذریعہ دیکھ لیا کہ اِنسان کی اونچی سے اونچی اُڑان کہاں تک ہے۔ کرم، وِکرم، اکرم مل کر ساری ریاضت کی تکمیل کرتے ہیں۔ کرم غیر لطیف چیز ہے۔ سودھرم کے طور پر ہم جو بھی کرم کریں، اس میں من کا تعاون ہونا چاہیئے۔ دماغی تربیت کے لئے جو کام کیا جائے، وہ وِکرم، خاص کام یا لطیف کام ہے۔ ضرورت کرم اور وِکرم دونوں کی ہے۔ ان دونوں پر عمل کرتے کرتے اکرم کی سرزمین تیار ہوتی ہے۔ ہم نے پچھلے باب میں دیکھ لیا ہے کہ اس سرزمین پر کرم اور سنیاس، دونوں ایک ہی روپ ہو جاتے ہیں۔ اب چھٹے باب کے شروع میں پھر کہا گیا ہے کہ کرم یوگ کا پس منظر سنیاس کے پس منظر سے الگ دکھائی دینے پر بھی ہمیشہ یکساں ہی رہتا ہے۔ صرف نگاہ کا فرق ہے۔ پانچویں باب میں جس راہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے ذریعہ تلاش کرنا، بعد کے ابواب کا مضمون ہے۔

کچھ لوگوں نے یہ غلط خیال قائم کر لیا ہے کہ روحانیات کے اونچے خیالات اور گیتا جیسی کتاب دراصل صرف سادھوؤں کے لئے ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ "میں کوئی سادھو نہیں ہوں۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ سادھو نام کی کوئی مخلوق ہے، جن میں سے وہ صاحب نہیں ہیں۔ جیسے گھوڑے، شیر، ریچھ، گائے

وغیرہ جان دار ہیں، ویسے ہی سادھو نامی بھی کوئی جاندار ہیں اور الٰہیات کا تصور صرف انھیں تک محدود ہے۔ باقی اِنسان جو عملی دُنیا میں رہتے ہیں، وہ لوگ گویا کسی دوسری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خیال الگ، کردار الگ! اس تخیل نے سادھو سنت اور دنیا دار لوگ، ایسی دو الگ الگ جماعتیں بنادی ہیں۔ "گیتا رہسیہ" میں تلک مہاراج نے اس بات کی طرف دھیان دِلایا ہے کہ "گیتا کی تصنیف عام دُنیا داروں کے لئے ہے۔" ان کا یہ قول میں حرف بحرف صحیح مانتا ہوں۔ بھگوت گیتا سارے سنسار کے لئے ہے۔ روحانیت کے متعلق یہ سارے دھندے ہر عملی آدمی کے لئے ہیں۔ روحانیت سکھاتی ہے کہ اپنا عمل پاک و صاف رکھ کر دِل کا سکون اور اطمینان کیسے حاصل کیا جائے؟ معاملت پاک و صاف کیسے کی جائے — گیتا اسی کی ترجمان ہے۔ جہاں جہاں تم معاملت کرتے ہو، وہاں وہاں گیتا آتی ہے۔ لیکن وہ تم کو وہیں کا وہیں رکھنا نہیں چاہتی۔ تمہارا ہاتھ پکڑ کر آخری منزل تک لے جائے گی۔ ایک مشہور کہاوت ہے کہ "پہاڑ اگر محمدؐ کے پاس نہ آئے، تو محمدؐ خود پہاڑ کے پاس جائیں گے۔" محمدؐ کو فکر ہے کہ میرا پیغام غیرذی روح پہاڑ تک بھی پہنچے۔ پہاڑ جامد ہے، اس لئے محمدؐ اس کے آنے کی راہ نہیں تکتے رہیں گے۔ یہی بات گیتا کی ہے۔ کیسا ہی عاجز اور کمزور ہو، گنوار ہو، گیتا اس کے پاس پہنچ جائے گی۔ مگر اس لئے نہیں کہ اسے جہاں کا تہاں رکھ دے۔ بلکہ اس لئے کہ ہاتھ پکڑ کر اسے آگے لے جائے اور اوپر اٹھائے۔ گیتا چاہتی ہے کہ اِنسان اپنے معاملات پاکیزہ بنا کر عظیم ترین حالت کو حاصل کرے۔ اسی لئے گیتا کا جنم ہوا۔

اس لئے "میں جاہل ہوں، عام اِنسان ہوں، دنیا دار ہوں" — یہ کہہ کر اپنے آس پاس رکاوٹیں مت کھڑی کرو۔ مت کہو کہ "میرے ہاتھوں سے کیا ہوگا؟ یہ ساڑھے تین ہاتھ کا جسم ہی میری ساری پونجی ہے۔" ایسی رُکاوٹیں اپنے آس پاس کھڑی کرکے

حیوانوں کی طرح کام مت کرو۔ تم تو آگے بڑھنے اور اوپر چڑھنے کی ہمّت رکھو۔

سہ "اپنے وجود سے وجود کو اٹھاؤ اور اپنے کو ذلیل مت کرو۔"

ایسی ہمت رکھو کہ میں اپنے کو ضرور اوپر لے جاؤں گا۔ یہ مان کر کہ میں ایک حقیر سنساری ہستی ہوں، من کی طاقت کو مار مت ڈالو۔ تخیل کے بازو کاٹ نہ ڈالو۔ بلکہ اپنے تخیل کو وسیع بناؤ۔ حیڈول کی مثال اپنے سامنے رکھو۔ صبح سویرے سورج کو دیکھ کر وہ کہتا ہے "میں اُڑ کر سورج تک پہونچوں گا۔" ہمیں بھی ایسا ہی بننا چاہیئے۔ اپنے کمزور بازوؤں سے حیڈول بیچارہ کتنا ہی اونچا اُڑے، تو بھی وہ سورج تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ لیکن اپنی قوتِ تخیل کے ذریعہ وہ ضرور سورج کو پا سکتا ہے۔

ہمارا طرزِ عمل اس سے اُلٹا ہوتا ہے۔ ہم جتنے اونچے جا سکتے تھے، اتنا بھی نہ جاکر اپنے خیالات کو اور جذبات پر رُکاوٹیں لگا کر اپنے کو اور نیچے گرا لیتے ہیں! جو طاقت ہے، اسے بھی اپنے کمزور جذبات سے تباہ کر دیتے ہیں۔ جب تخیل کے ہی پاؤں ٹوٹ گئے، تو پھر نیچے گرنے کے سوا چارہ کیا ہوگا؟ لہٰذا ہمارے خیالات کا رُخ ہمیشہ اوپر کی طرف رہنا چاہیئے۔ تخیل ہی کے سہارے آدمی آگے بڑھتا ہے، اس لئے اسے سکوڑ مت ڈالو۔

سہ "عام راہ کو مت چھوڑو۔ دنیا میں پڑے رہو۔ اِدھر اُدھر نہ بھٹکو۔"

ایسا رونا روتے مت رہو۔ روح کو ذلیل مت کرو۔ سادھک کے پاس اگر عمدہ تخیل ہوگا۔ اور خود اعتمادی ہوگی، تب ہی وہ قائم رہ سکے گا۔ اسی سے نجات حاصل ہوگی۔ لیکن دھرم تو سادھو سنتوں کے لئے ہی ہے، سادھو سنتوں کے پاس گئے بھی تو اسی شاباشی کا سرٹیفکٹ لینے کے لئے کہ "تم جس حالت میں ہو، اس میں یہی اعمال مناسب ہیں۔" اس قسم کے خیال چھوڑ دو۔ ایسے خود ساختہ خیالات قائم کر کے اپنے کو مندھن میں مت ڈالو۔ اگر ارادے بلند نہیں رکھوگے، تو ایک قدم بھی آگے

نہیں پڑھ سکو گے۔

یہ نظریہ، یہ ارادے اور یہ بلند خیالی اگر ہو، تو ذریعوں کا جوڑ توڑ ضروری ہے! ورنہ سارا قصہ ہی ختم۔ باہری کرم کی مدد کے لئے اندرونی ذریعہ یعنی وکرم بتایا گیا ہے۔ کرم کی مدد کے لئے وکرم ہمیشہ چاہیئے۔ ان دونوں کی مدد سے اکرم نامی جو ملکوتی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ اور اس کی قسمیں پانچویں باب میں ہم نے دیکھیں۔ اس چھٹے باب سے وکرم کی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ضمیر کی تہذیب کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اس ریاضت کو سمجھانے سے پہلے گیتا کہتی ہے ۔ "روحو! تم دیوتا بن سکتی ہو۔ تم پاک اور بلند ارادہ رکھو۔ من کو آزاد کر کے، اس کے بازوؤں کو مضبوط بناؤ۔" ریاضت کی ۔ وکرم کی مختلف قسمیں ہیں۔ بھگتی یوگ (عقیدت) دھیان یوگ (مراقبہ) گیان وگیان (تحقیق وتجزیہ) گن وکاس (صفاتی ارتقاء) آتم اناتم وویک (روح اور مادّہ کی تمیز) وغیرہ وغیرہ مختلف طریقے ہیں۔ چھٹے باب میں اس طریقے کا ذکر ہے، جسے مراقبہ کہتے ہیں۔

(۲۶) قلب کی یکسوئی

دھیان یوگ میں تین اہم باتیں ہیں:۔ ۱۔ قلب کی یکسوئی۔ ۲۔ قلب کی یکسوئی کے معقول زندگی اور ۳۔ یک نگاہی اور وسعت نظری۔ ان تینوں کے بغیر سچی ریاضت ممکن نہیں۔ قلبی یکسوئی کا مطلب ہے من کی پراگندگی کی روک تھام۔ معقول زندگی کا مطلب ہے سب کرموں کا ناپ تول کر ہونا۔ یک نگاہی کا مطلب ہے، سارے سنسار کی طرف وسعتِ نظر سے دیکھنا۔ ان تینوں باتوں کے ملنے سے دھیان یوگ بن جاتا ہے۔ ان تینوں ریاضت کے بھی ذریعے ہیں۔ وہ ہیں ابھیاس اور ویراگ۔ ان پانچوں کا تھوڑا سا ذکر ہم یہاں کریں۔

پہلے من کی یکسوئی کو لیجئے۔ ہر کام میں من کی یکسوئی ضروری ہے۔ روزمرّہ کے سارے کاروبار میں بھی یکسوئی چاہیئے۔ یہ بات نہیں کہ دنیا اور آخرت کے لئے الگ الگ اوصاف

کی ضرورت ہے۔ معاملت کو پاکیزہ بنانے کا ہی آخرت کا اکتساب۔ کیسی بھی معاملت ہو، اس کی کامیابی اور ناکامی آپ کی یکسوئی پر منحصر ہے۔ تجارت، معاملت، سیاست اور تحقیق، کسی کو لے لیجئے، ان میں جو کچھ بھی کامیابی حاصل ہوگی، وہ من کی یکسوئی کے مطابق ہی ملے گی۔ نپولین کے بارے میں مشہور ہے کہ لڑائی میں جہاں اس نے ترتیب رزم ایک بار ٹھیک ٹھیک طور پر دے دی، تو پھر وہ میدانِ جنگ میں علم حساب کے اصول حل کیا کرتا تھا۔ ڈیروں اور خیموں پر گولے برستے، سپاہی مرتے، لیکن اس کا دل اپنے حساب میں مگن رہتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نپولین کی یکسوئی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس سے بھی اونچے درجے کی قلبی یکسوئی کی مثالیں دی جا سکتی ہیں، لیکن قابلِ غور یہ امر ہے کہ یکسوئی اس کے پاس کتنی تھی! خلیفہ عمرؓ کی بھی ایسی ہی بات تھی۔ بیچ لڑائی میں جب نماز کا وقت ہو جاتا، تو وہیں میدان میں قلب کو یکسو کرکے نماز پڑھنے لگتے اور ان کی محویت اتنی ہو جاتی کہ ان کو یہ بھی ہوش نہیں رہتا کہ کس کے آدمی کٹ مر رہے ہیں۔ اسلام کی توسیع و اشاعت کی وجہ اسلام کے ابتدائی دور کے مسلمانوں کی خدا پر عقیدت اور ان کی یکسوئی تھی۔

ایک دن میں نے ایک کہانی سنی۔ ایک فقیر تھا۔ اس کے بدن میں تیر چبھ گیا۔ اس کو بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ تیر نکالنے کی کوشش کی جاتی تو ہاتھ لگانے سے ہی درد اور بڑھتا تھا۔ اس لئے وہ تیر باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ کلوروفارم جیسی بے ہوش کرنے کی دوا اس زمانہ میں تھی نہیں۔ بڑی مشکل پڑ گئی۔ کچھ لوگ اس فقیر کو جانتے تھے۔ انھوں نے کہا — "تیر ابھی نہ نکالو۔ جب یہ نماز پڑھنے لگے گا تو نکال لیں گے۔" شام کی نماز کا وقت آیا تو فقیر نماز پڑھنے لگا۔ پل بھر میں اس پر اتنی محویت طاری ہو گئی کہ اس کے بدن سے تیر کھینچ لیا گیا اور اسے ذرا بھی معلوم نہیں ہوا۔ کیسی زبردست ہے یہ یکسوئی!

خلاصہ یہ ہے کہ دنیاوی معاملات ہو یا آخرت کے کام، قلب کی یکسوئی کے بغیر اس میں کامیابی ہونا مشکل ہے۔ اگر من یکسو رہے گا، تو پھر اہمیت کی بھی کمی نہیں رہے گی۔ ساٹھ برس کے بوڑھے ہونے پر بھی کسی نوجوان کی طرح تم میں جوش اور مقدرت دکھائی پڑے گی۔ آدمی جیسے جیسے بڑھاپے کی طرف جائے، اس کا من تیدرستج مضبوط ہونا چاہیئے۔ کسی پھل کو ہی لیجئے۔ پہلے وہ ہرا ہوتا ہے، پھر پکتا ہے، پھر سڑتا اور رسٹ جاتا ہے۔ مگر اندر کا بیج زیادہ سے زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ یہ باہری جسم سڑ جائے گا، گر جائے گا، لیکن مادی جسم ہی اصل شے نہیں ہے۔ اس کا جوہر، اس کی آتما، اس کا بیج ہے۔ یہی بات انسانی جسم کی ہے۔ چاہے جسم کتنا ہی بوڑھا ہوتا چلا جائے، لیکن قوتِ حافظہ تو بڑھتی ہی رہنی چاہیئے، عقل تیز ہوتی جانی چاہیئے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ انسان کہتا ہے — "ان دنوں میری یادداشت کمزور ہو گئی۔" آخر کیوں؟ "اب بڑھاپا آ گیا۔" تمہارا جو علم اور تمہاری جو یادداشت ہے، وہ تمہارا بیج ہے۔ جسم جیوں جیوں بوڑھا ہوتا جائے گا، اس میں ڈھیلا پن آئے گا، لیکن ویسے ہی ویسے روح طاقتور ہوتی جانی چاہیئے اور یہ بغیر یکسوئی کے نہیں ہو سکتا۔

(۲۷) یکسوئی کی مشق کیسے کریں؟

یکسوئی تو ہونی چاہیئے، پر وہ ہو کیسے؟ اس کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ بھگوان کہتے ہیں — "آتما میں من کو پرو کر کسی دوسری بات کا بچار نہ کرو۔" لیکن یہ ہو کیسے؟ من کو بالکل شانت کرنا بڑی اہم بات ہے۔ خیالات کے چکر کو بھرپور روکے بغیر یکسوئی کیسے ہوگی؟ باہری چکر تو کسی طرح روک بھی لیا جائے، لیکن بھیتری چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔ من کی یکسوئی کے لئے خارجی وسائل جیوں جیوں کام میں لائے جاتے ہیں، اندرونی چکر تیوں تیوں زیادہ تیزی سے چلنے لگتے ہیں۔ آپ آسن جما کر تن کر بیٹھ جائیے، آنکھیں بند کر لیجئے، لیکن اتنے سے من یکسو نہیں ہو سکے گا۔ اصل بات

یہ ہے کہ من کا چکر بند کرنے کی مشق ہونی چاہیئے۔

بات یہ ہے کہ باہر کا یہ لامحدود سنسار، جو ہمارے من میں بھرا رہتا ہے، اس کو روکے بغیر من کی یکسوئی ناممکن ہے۔ اپنی روح کی لامحدود گیان شکتی ہم باہر کی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں خرچ کر ڈالتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ جس طرح دوسروں کو لوٹے بغیر اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے مال دار ہو جانے والا انسان بغیر ضرورت خرچ نہیں کرتا، اسی طرح ہمیں بھی اپنی روح کی گیان شکتی چھوٹی چھوٹی باتوں کی فکر میں خرچ نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ گیان شکتی ہماری بیش قیمت دولت ہے، لیکن ہم اسے فضول چیزوں میں خرچ کر دیتے ہیں۔ یہ سالن اچھا نہیں پکا، اس میں نمک کم پڑا۔ ارے بھائی کتنی رتی نمک کم پڑا؟ نمک ذرا سا کم پڑا، اسی ذرا سی بات پر ہمارا گیان خرچ ہو جاتا ہے! بچوں کو مدرسہ کی چاردیواری کے اندر ہی پڑھاتے ہیں، کیونکہ کہتے ہیں کہ اگر پیڑ کے نیچے پڑھائیں گے، تو کوے، کوئل اور چڑیاں دیکھ دیکھ کر ان کا من بھٹکے گا، یکسو نہیں ہوگا۔ بچے ہی تو ٹھہرے! کوے، چڑیاں نہیں دکھائی دیں، تو ہو گئی یکسوئی! لیکن اب ہم ہو گئے ہیں گھوڑے کے برابر۔ ہمارے اب سینگ نکل آئے ہیں۔ سات سات دیواروں کے اندر بھی اگر کسی نے ہمیں بند کر دیا، تو بھی ہمارے من کو یکسوئی حاصل نہیں ہو سکتی، کیونکہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا ذکر کرنے کی عادت ہمیں پڑ گئی ہے۔ جو گیان ہمیں ایشور سے ملا سکتا ہے، اسے ہم سالن سبزی کے ذائقہ کا چرچا کرنے میں ہی کھو دیتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ دن رات ایسا بھیانک سنسار ہمارے چاروں طرف، اندر، باہر امنڈا کرتا ہے۔ عبادت اور ریاضت کرتے وقت بھی ہماری یہ غرض باہر ہی رہتی ہے۔ پرمیشور میں محو ہو کر ایک لمحہ کے لئے بھی سنسار بھلا دینے کی طبیعت نہیں ہوتی۔ عبادت بھی ایک دکھاوا ہے۔ ایسی جہاں من کی حالت ہو،

وہاں آسن جما کر بیٹھنا اور آنکھ بند کر لینا سب بیکار ہے ۔ من کی دوڑ مسلسل باہر ہوتے رہنے سے انسان کی ساری اہلیت برباد ہو جاتی ہے ۔ کسی طرح کا نظم و ضبط انسان میں باقی نہیں رہتا ۔ اس کا تجربہ آج ہمارے ملک میں قدم قدم پر ہو رہا ہے ۔ دراصل ہندوستان تو روحانیات کا گہوارہ ہے ۔ یہاں کے لوگ پہلے ہی اونچی ہوا میں اڑنے والے سمجھے جاتے ہیں ۔ مگر ایسے دیش میں ہماری آپ کی کیا حالت ہے ؟ چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر اتنی فکر کے ساتھ بار بار کرتے ہیں جسے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے ۔ ذرا ذرا سی باتوں میں ہمارا چت ڈوبا رہتا ہے ۔

وعظ و پند کی محفل میں نیند ستاتی ہے اور بستر پر لیٹنے سے فکر پریشان کرتی ہے ۔ کرم کی ایسی مخفی چال ہے ۔ اس پر رونے سے کیا فائدہ ۔

وعظ و نصیحت کے لئے جاتے ہیں تو وہاں نیند آگھیرتی ہے اور نیند لینے جاتے ہیں تو وہاں فکر و خیالات کے چکر شروع ہو جاتے ہیں ۔ اگر ایک طرف ذہن بالکل خالی ہے ، تو دوسری طرف خیالات کی بھرمار ہے ۔ من کی یکسوئی کا کہیں پتہ نہیں ۔ اتنا یہ انسان اندریوں کا غلام ہے ۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا ۔ "آنکھیں ادھ مندی رکھنی چاہئے ، ایسا کیوں کہا گیا ہے ؟" میں نے جواب دیا کہ "سیدھا سا جواب دیتا ہوں آنکھیں بالکل موند لیں تو نیند آنے لگتی ہے ۔ کھلی رکھیں تو چاروں طرف نگاہ بھٹکنے سے یکسوئی نہیں ہوتی ۔ آنکھیں موندنے سے نیند آجاتی ہے ، یہ تموگن (کاہلی) ہوا کھلی رکھنے سے چاروں طرف نظر جاتی ہے ، یہ رجوگن (حرکت) ہوا ۔ اس لئے درمیانی حالت بتائی گئی ہے ۔"

خلاصہ یہ کہ من کی حالت بدلے بغیر یکسوئی نہیں ہو سکتی ۔ من کی حالت بالکل پاک ہونی چاہئے ۔ صرف آسن جما کر بیٹھنا ہی کافی نہیں ہے ۔ اس کے لئے ہمارے تمام معاملات پاک اور صاف ہونے چاہئیں اور اس پاکی اور صفائی کو حاصل کرنے کے لئے مقصد کو پاک و صاف بنانا چاہئے ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا فعل ذاتی فائدہ ، نفس پرستی یا باہری باتوں کے لئے نہ ہو ۔

یوں کام تو ہم دن بھر کرتے رہتے ہیں، مگر دن بھر کی اس ادھیڑ بن کی غرض کیا ہے؟
سے یہ ساری تگ و دو اسی لئے تو ہے کہ آخری لمحات شیریں ہو جائیں!"
ساری اُدھیڑ بن، ساری دوڑ دھوپ، اسی لئے کہ آخری لمحات شیریں ہو جائیں۔
زندگی بھر کڑوا زہر کیوں ہضم کیا جاتا ہے، اسی لئے کہ آخری گھڑی، موت پاکیزہ ہو جائے۔ دن کی آخری گھڑی شام کو آتی ہے۔ آج کے دن کا سارا کام اگر پاک نیت سے کیا گیا، تو رات کی پرارتھنا میٹھی ہو گی۔ دن کا وہ آخری لمحہ اگر میٹھا ہو گیا، تو دن کا سارا کام کامیاب سمجھو۔ تب میرا من یکسو ہو جائے گا۔

یکسوئی کے لئے ایسی پاک زندگی کی ضرورت ہے۔ باہری چیزوں کی فکر دور ہو جانی چاہئے۔ انسان کی عمر بہت نہیں ہے، لیکن اس تھوڑی سی عمر میں بھی قدرتی شکھ کا مزہ لینے کی صلاحیت ہے۔ دو آدمی بالکل ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ایک سی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ دو آنکھیں اور ان کے درمیان ایک ناک اور اس میں دو نتھنے، اس طرح بالکل یکساں ہوتے ہوئے بھی ایک فرشتہ خصلت ہوتا ہے اور دوسرا حیوان صفت۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایک ہی بھگوان کی مخلوق "سب ایک ہی کان کے ہیں"، تو پھر یہ فرق کیوں ہے؟ ان دونوں کی نسل ایک ہے، ایسا یقین نہیں ہوتا۔ ایک فرشتہ ہے تو دوسرا شیطان!

آدمی کتنا اونچا اٹھ سکتا ہے، اس کی مثال پیش کرنے والے لوگ پہلے بھی ہو چکے ہیں اور آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ یہ تجربہ کی بات ہے۔ اس انسانی جسم میں کتنی طاقت ہے، اس کو ظاہر کرنے والے سنت پہلے بھی ہوئے اور آج بھی ہیں۔ اس جسم میں رہ کر اگر آدمی ایسے حیرت انگیز کام کر سکتا ہے، تو پھر بھلا میں کیوں نہ کر سکوں گا؟ میں اپنے تصورات کو اعلیٰ اصولوں کے ساتھ کیوں نہ جوڑ دوں؟ جس انسانی جسم میں رہ کر دوسرے برگزیدہ ہو گئے ہیں، وہی جسم مجھے بھی ملا ہے، پھر میری حالت ایسی کیوں؟ کہیں نہ کہیں مجھ سے غلطی ہو رہی ہے۔ میرا من ہمیشہ باہر جاتا رہتا ہے۔ دوسروں

کی اچھائی برائی دیکھنے میں بہت وا بیانت ہوگیا ہے۔ لیکن مجھے دوسروں کی اچھائی برائی دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ "دوسروں کے عیب و ہنر کیا دیکھوں! مجھ میں کیا ان کی کمی ہے؟ کیا خود مجھ میں عیب کم ہیں؟ اگر میں ہمیشہ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی باتیں دیکھنے میں ہی لگا رہا، تو پھر میرے دل کو یکسوئی ہوگی کیسے؟ اس صورت میں میری حالت دو قسم کی ہو سکتی ہے ـــــ ایک تو خالی الذہنی کی یعنی نیند کی کیفیت اور دوسری محشر خیالی کی یعنی خیالات کی بھرمار۔ اس طــــرح سے میں تموگن اور جوگن میں ہی الجھتا رہوں گا۔

بھگوان نے یہ ضرور کہا ہے کہ چت کی یکسوئی کے لئے اس طرح بیٹھو، اس طرح آنکھیں رکھو، اس طرح آسن جماؤ، وغیرہ لیکن ان سب سے فائدہ اسی وقت ہوگا جب ہم یکسوئی قلب کے قائل ہوں۔ انسان کے دل میں سب سے پہلے یہ بات بیٹھنی چاہئے کہ یکسوئی ضروری ہے، پھر تو وہ خود اس کے طریقے اور راستے ڈھونڈھ نکالے گا۔

(۲۸) زندگی کا انضباط

دل کی یکسوئی میں ایک دوسری بات سے بڑی مدد ملتی ہے، وہ ہے زندگی کے حدود کا تعین۔ ہمارا سب کام نپا تلا ہونا چاہئے۔ علم الحساب کا یہ اصول ہمارے سب کاموں میں داخل ہونا چاہئے۔ دوا جیسے ناپ تول کر لی جاتی ہے، ایسے ہی کھانا، پینا، سونا بھی نپا تلا ہونا چاہئے۔ زندگی میں سب جگہ اور ہر طرف ناپ تول کرنی چاہئے۔ ہر حواس پر پہرہ بٹھانا چاہئے۔ میں زیادہ تو نہیں کھاتا ہوں، زیادہ تو نہیں سوتا ہوں، ضرورت سے زیادہ تو نہیں دیکھتا ہوں، بڑی توجہ سے ان باتوں کی نگرانی کرنی چاہئے۔

ایک صاحب کسی شخص کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ وہ کسی کے کمرے میں گئے، تو ایک منٹ میں ان کی نگاہ میں آجاتا تھا کہ اس میں کہاں کیا کیا رکھا ہے۔ میں نے دل میں کہا ـــــ "بھگوان! یہ وصف مجھے نہ ملے"۔ کیا میں ایسی کا سکر بڑی ہوں جو پاپ نہ

پچاس چیزوں کی فہرست من میں رکھوں؟ یا مجھے چوری کرنی ہے؟ صابن یہاں تھا، گھڑی وہاں تھی، ان سب سے مجھے کیا لینا ہے؟ اس علم کی مجھے کیا ضرورت ہے؟ آنکھوں کی یہ فضول حرکت مجھے چھوڑ دینی چاہئے۔ اسی طرح کان پر بھی پہرہ رکھو۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر کتوں کی طرح ہمارے کان ہوتے تو کیا اچھا ہوتا، جدھر چاہتے اُدھر انھیں ہلایا کرتے۔ انسان کے کان میں بھگوان نے یہ کسر ہی رکھدی۔ لیکن کانوں کی یہ واہیات شکتی ہمیں نہیں چاہئے۔ ویسے ہی یہ من بھی بہت زبردست ہے۔ ذرا کہیں کھٹکا ہوا، آہٹ ہوئی کہ دھیان اُدھر بھاگا۔ اس لئے زندگی میں انضباط پیدا کرو اور حد سے آگے نہ بڑھو۔ خراب چیزیں نہیں دیکھیں۔ خراب کتاب نہیں پڑھیں، بُرائی بھلائی نہیں سُنیں، بُری چیزیں تو دور، بے عیب چیزوں کا بھی ضرورت سے زیادہ استعمال نہ کریں۔ لالچ کسی قسم کا نہیں ہونا چاہئے۔ شراب، پکوڑیاں، رس گُلّے تو ہونے ہی نہیں چاہئیے، لیکن سنترے، کیلے، موسمی بھی بہت نہیں چاہئے۔ پھل کی غذائیں تو پاکیزہ غذا ہے، مگر وہ بھی اناپ شناپ نہیں ہونا چاہئے۔ زبان کے چٹورپن کے عمل کا بار اندرونی مالک کے لئے ناقابل برداشت ہونا چاہئے۔ اندریوں (حواسوں) پر دھاک رکھنی چاہئے کہ اگر ہم اوٹ پٹانگ ــــ کریں گے، تو بھیتر کا مالک ہمیں ضرور سزا دے گا۔ افعال کی باقاعدگی کو ہی جیون کی پریمیتا ــــ زندگی کے حدود کا تعین یا زندگی کا انضباط کہتے ہیں۔

(۲۹) پاکیزہ نظری

تیسری چیز ہے "سم درشٹی" (یک نظری) کا ہونا۔ سم درشٹی کا ہی مطلب ہے شُبھ درشٹی (پاکیزہ نظری) شُبھ درشٹی حاصل کئے بغیر دل یکسو نہیں ہو سکتا۔ شیر اتنا بڑا جنگل کا بادشاہ ہے لیکن چار قدم چل کر پیچھے دیکھتا ہے۔ خونخوار شیر کو یکسوئی کیسے حاصل ہوگی؟ شیر، کوّے، بلّی کی آنکھیں ہمیشہ پھرتی رہتی ہیں۔ ہر وقت نگاہ چوکنی اور گھبرائی ہوئی رہتی ہے۔ تشدّد کرنے والے جانداروں کا یہی حال رہتا ہے۔ سم درشٹی پیدا کر لینی چاہئے۔ یہ سارا سنسار اچھائی سے بھرا ہوا معلوم ہونا چاہئے۔ جیسا مجھے اپنے پر بھروسہ ہے ویسا ہی ساری مخلوق پر میرا

بھروسہ ہونا چاہیئے۔ ڈرنے کی بات کیا ہے؟ سب کچھ شُدھ اور پوتر ہے۔

یہ سنسار اچھائی سے بھرا ہے۔ کیوں کہ بھگوان اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ انگریز شاعر براؤننگ نے بھی ایسا ہی کہا ہے کہ "بھگوان عرش میں مقیم ہے اور سنسار سب ٹھیک طرح سے چل رہا ہے"

سنسار میں کچھ بھی بگاڑ نہیں ہے۔ بگاڑ اگر کہیں ہے تو وہ ہے میری نظر میں۔ جیسی میری نظر، ویسا ہی یہ سنسار۔ اگر میں لال رنگ کی عینک لگاؤں، تو سارا سنسار لال ہی لال اور جلتا ہوا دکھائی دے گا۔

رام داس رامائن لکھتے جاتے اور شاگردوں کو پڑھ کر سناتے جاتے تھے۔ ہنومان بھی خفیہ طور پر اُسے سننے کے لیے آکر بیٹھتے تھے۔ سمرتھ رام داس نے لکھا تھا ـــ "ہنومان اشوک بن میں گئے۔ وہاں انہوں نے سفید پھول دیکھے" یہ سنتے ہی جھٹ ہنومان ظاہر ہو گئے اور بولے ـــ "میں نے سفید پھول نہیں دیکھے، لال دیکھے تھے تم نے غلط لکھا ہے، اسے سُدھار لو" سمرتھ نے کہا ـــ "میں نے ٹھیک لکھا ہے۔ تم نے سفید ہی پھول دیکھے تھے" ہنومان نے کہا ـــ "میں خود وہاں گیا تھا اور میں ہی جھوٹا ہوں؟" بالآخر معاملہ رام چندر جی کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا ـــ "پھول تو سفید ہی تھے، مگر ہنومان کی آنکھیں غصہ سے لال ہو رہی تھیں، اس لئے وہ سفید پھول انھیں لال دکھائی پڑے" اس عمدہ کہانی کا مقصد یہی ہے کہ دنیا کو دیکھنے کی جیسی ہماری نگاہ ہوگی، ویسی ہمیں دکھائی پڑے گی۔

اگر ہمارے من کو اس کا یقین نہ ہو کہ یہ دنیا اچھی ہے، تو دل کو یکسوئی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک میں یہ سمجھتا رہوں گا کہ دنیا بگڑی ہوئی ہے، تب تک شک و شبہہ کی ہی نگاہ سے چاروں طرف دیکھتا رہوں گا۔ شاعر لوگ پرندوں کی آزادی کے گانے گاتے ہیں۔ اُن سے کہنا چاہیئے کہ ذرا ایک بار پرندہ ہو کر دیکھو تو پھر ان کی آزادی کی صحیح قیمت معلوم ہو جائے گی۔ پرندوں کی گردن آگے پیچھے برابر ناچتی رہتی ہے۔ اُنھیں ہر وقت دشمن کا خوف لگا رہتا

ہے۔ چڑیا کو آسن پر لا بٹھاؤ۔ کیا وہ یکسو ہو جائے گی؟ میرے ذرا قریب آتے ہی وہ پھر سے اُڑ جائے گی۔ وہ ڈرے گی کہ کہیں یہ مجھے مارنے تو نہیں آرہا ہے؟ جن کے دماغ میں ایسا خوفناک تصور ہے کہ یہ ساری دنیا کھانے کو دوڑ رہی ہے، مہلک ہے، انھیں سکون کہاں؟ جب تک کہ یہ خیال دماغ سے نہیں نکلے گا کہ اپنا محافظ میں خود اکیلا ہوں باقی سب مجھے کھا جانے والے ہیں تب تک یکسوئی حاصل نہیں ہو سکتی یکجائی نظر کا رکھنا ہی اس کا عمدہ طریقہ ہے۔ آپ ہر طرف اچھا ہی اچھا دیکھنے لگ جائیں، دل خود بخود پرسکون ہو جائے گا۔

کسی غم زدہ انسان کو کل کل بہنے والی ندی کے کنارے لے جائیے۔ اس کے پاک اور پرسکون بہاؤ کو دیکھکر اس کی بے چینی کم ہو جائے گی۔ وہ اپنا دکھ بھول جائے گا۔ اس جھرنے میں، اس بہاؤ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی؟ بھگوان پاک قدرت اسی سے ظاہر ہوتی ہے۔ ویدوں میں جھرنوں کا بہت ہی خوش نما بیان کیا گیا ہے:—

"لامقام اور لاامکان ـــ"

ـــ ایسے یہ جھرنے ہیں۔ جھرنے کا بہاؤ اٹوٹ ہے، اس کا اپنا کوئی گھر بار نہیں، وہ سنیاسی ہے۔ ایسا پاک صاف جھرنا لمحہ بھر میں میرے من کو یکسو کر دیتا ہے۔ ایسے سُندر جھرنے کو دیکھ کر پریم اور گیان کا چشمہ میرے من میں کیوں نہ اُبل پڑے؟

باہر کا یہ بہنے والا پانی اگر میرے من کو سکون دے سکتا ہے۔ تو پھر میری انسانی وادی میں اگر بھگتی اور گیان کا جھرنا بہنے لگے، تو کتنا سکون حاصل ہوگا؟ میرے ایک دوست ہمالیہ میں کشمیر کی سیر کو گئے تھے۔ وہاں کے مقدس پہاڑوں اور سُندر جھرنوں کا ذکر مجھے لکھ لکھ کر بھیجتے تھے۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ پانی کی جو روانی، پہاڑوں کا جو جو سلسلہ اور جو پاکیزہ ہوا تمہیں انوکھا کیف و سرور بخشتی ہے، اُن سب کا احساس مجھے اپنے دل میں ہو سکتا ہے۔ اپنے دل کی دنیا میں ہمیشہ یہ سب

دلکش نظارہ کرتا ہوں۔ اس لئے تمہارے بلانے پر بھی میں اپنے دل کے اس سمندر اور ملکوتی ہمالیہ کو چھوڑ کر نہیں آؤں گا۔

استحکام کی مورت کے روپ میں جس ہمالیہ کا دھیان استحکام لانے کے لئے کرتا ہے، اس کا ذکر سن کر اگر میں نے اپنا فرض چھوڑ دیا، تو وہ الٹی بات ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ دل کو ذرا پرسکون کیجئے۔ دل پر پاکیزہ نظر ڈالیں تو پھر آپ کے دل میں بے شمار جھرنے پھوٹ نکلیں گے۔ تصورات کے سمندر نالے من کے آسمان پر چمکنے لگیں گے۔ پتھر اور مٹی کی خوبصورت چیزیں دیکھ کر اگر دل پرسکون ہو جاتا ہے، تو پھر دل کی دنیا کے عمدہ نظارے دیکھ کر کیوں نہ ہوگا؟ ایک بار میں تراونکور گیا تھا۔ ایک دن سمندر کے کنارے پر بیٹھا تھا۔ وہ لامحدود سمندر، اس کا گرجنا، شام کا وقت، میں مبہوت ہو کر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ میرے دوست نے اس سمندر کے کنارے کچھ پھل کھانے کو لا دئے۔ اس وقت وہ پاکیزہ غذا بھی مجھے زہر ہی لگی۔ سمندر کی وہ "اوم اوم" کی گرج مجھے گیتا جی کی یاد دلا رہی تھی۔ خود سمندر برابر اس کی یاد کر رہا تھا اور کام میں جٹا ہوا تھا۔ ایک لہر آئی، وہ گئی اور دوسری آئی۔ اسے ایک پل کیلئے بھی قرار نہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر میری بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ آخر اس سمندر میں ایسا کیا تھا؟ اس کھارے پانی کی لہروں کو اچھلتے دیکھ کر اگر میرا جی مچلنے لگتا ہے، تو پھر گیان اور بھگتی کے اتھاہ سمندر کے دل میں ہلوریں مارنے پر میں کتنا ناچ اٹھوں گا! ویدک رشی کے دل میں ایسا ہی سمندر لہریں مارتا تھا۔

"دل کے سمندر کے اندر۔ زندگی کے تہ میں گھی کے دھارا کی لہر اٹھ رہی ہے۔

یہ دیکھتا ہوں سمندر سے شہد کی لہریں اٹھ رہی ہیں"

اس جاند مخلوق کی خدائی زبان کی ترجمانی کرنے میں بے چارے شاعر کی بھی فضیحت ہونے کی نوبت آگئی۔ کیسی وہ گھی کی دھار؟ کیسی وہ شہد کی دھار؟

کیا میرے دل کے سمندر میں کھاری لہریں اٹھیں گی؟ نہیں نہیں میرے دل میں تو دودھ، شہد اور گھی کی لہریں ہلوریں مار رہی ہیں۔

(۲۰) معصوم معلّم

دل کے اس سمندر کو دیکھنا سیکھو۔ باہر کے صاف ستھرے نیلے آسمان کو دیکھ کر قلب کو بھی پاک اور بے لوث بناؤ۔ سچ پوچھو، تو قلبی یکسوئی ایک کھیل ہے، معمولی بات ہے۔ قلب کی بے چینی ہی خلاف فطرت ہے۔ چھوٹے بچّے کی آنکھوں کی طرف دھیان لگا کر دیکھو۔ وہ کیساں ٹکٹکی لگا کر دیکھتا ہے۔ لیکن تم دس بار پلک جھپکاؤ گے، بچّوں کا من فوراً یکسو ہو جاتا ہے۔ چار پانچ مہینے کے بچے کو باہر کی ہری بھری دنیا دکھاؤ، وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہے گا۔ عورتوں کا تو ایسا خیال ہے کہ باہر کی ہریالی کو دیکھ کر اس کا پاخانہ بھی ہرے رنگ کا ہو جاتا ہے۔ گویا سب اندریوں (حواسوں) کی آنکھیں بنا کر وہ دیکھتا ہے۔ چھوٹے بچوں کے من پر کسی بھی واقعہ کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ ـــ "شروع کے دو چار برس میں جو تعلیم بچوں کو مل جاتی ہے، وہی اصلی تعلم ہے۔" آپ کتنے ہی مدرسے، تعلیم گاہیں اور انجمنیں قائم کیجئے، شروع میں جو تعلیم ملی ہے وہ پھر کبھی نہیں مل سکتی۔ تعلیمی معاملات سے میرا تعلق ہے۔ دن بہ دن مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اس باہری تعلیم کا انجام فضول ہے۔ شروع شروع کے تاثرات پتھر کی لکیر بن جاتے ہیں۔ بعد کی تعلیم کو باہری رنگ اور اوپری جھلی سمجھو۔ صابن لگانے سے اوپر کا دھبہ، میلاپن دور ہو جاتا ہے۔ مگر چمڑے کا کالا رنگ کیسے چلا جائے گا؟ اسی طرح جو عادتیں شروع میں پڑ جاتی ہیں، ان کا مٹانا کٹھن ہو جاتا ہے۔

تو یہ ابتدائی تاثر گہرے اور طاقت ور کیوں اور بعد کے سنسکار (تاثر) کمزور کیوں؟ اس لئے کہ بچپن میں قلبی یکسوئی قدرتاً ہوتی ہے۔ یکسوئی کے سبب جو

سنسکار پڑے ہیں وہ پھر نہیں مٹتے۔ قلبی یکسوئی کی اتنی اہمیت ہے۔ جسے یہ یکسوئی حاصل ہو گئی اس کے لئے پھر کیا چیز غیر ممکن ہے۔

ہمارا سارا جیون آج بناوٹی ہو گیا ہے۔ زمانہ طفلی کے ہمارے نیک رُجحان غائب ہو گئے ہٹ گئے۔ زندگی میں اصلی تر و تازگی نہیں رہی۔ وہ خشک ہو گئی ہے۔ ہم اوٹ پٹانگ، جیسے تیسے چل رہے ہیں۔ ڈاروِن صاحب نہیں، بلکہ ہم خود اپنی حرکتوں سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہمارے مورث بندر تھے۔

چھوٹا بچہ زود یقین ہوتا ہے۔ ماں جو کہئے وہ اس کے لئے سند ہے۔ جو کہانیاں اسے سنائی جاتی ہیں وہ اسے جھوٹ نہیں معلوم ہوتیں۔ کوا بولا، چڑیا بولی، یہ سب اسے سچ معلوم ہوتا ہے۔ بچوں کے اس نیک رُجحان کے سبب انھیں یکسوئی جلد حاصل ہو جاتی ہے۔

(۳۱) مشق، بے نیازی اور عقیدت

خلاصہ یہ کہ "دھیان یوگ" کے لئے من کی یکسوئی، محدود زندگی اور پاکیزہ نظر لازمی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ذریعے بتائے گئے ہیں۔ ویراگیہ (بے نیازی) اور ابھیاس (مشق)، ان میں سے ایک تخریبی ہے اور دوسرا تعمیری۔ کھیت سے گھاس اکھاڑ کر پھینکنا یہ تخریب ہے۔ اسی کو ویراگیہ کہتے ہیں۔ اس میں بیج بونا تعمیری کام ہے۔ من میں اچھے خیالات پر بار بار غور و فکر کرنا، ابھیاس کہلاتا ہے۔ ویراگیہ تخریبی عمل ہے۔ ابھیاس تعمیری عمل ہے۔ ویراگیہ آئے کیسے؟ ہم کہتے ہیں: "آم میٹھا ہے"۔ تو کیا یہ مٹھاس نرے آم میں ہے؟ نہیں، نرے آم میں نہیں ہے۔ بلکہ ہم اپنی روح کی مٹھاس چیزوں میں ڈالتے ہیں اور پھر وہ میٹھی لگتی ہے۔ اس لئے باطنی مٹھاس کو چکھنا سیکھو۔ صرف باہری چیزوں میں مٹھاس نہیں ہے بلکہ وہ —

"جو مدھ رسوں کا رس ہے " میٹھاس کا سمندر روح میرے نزدیک ہے۔ اُسی کی بدولت میٹھی چیزوں کو میٹھاس ملی ہے، ایسا خیال کرتے رہنے سے من میں ویراگیہ پھیلنے لگتا ہے۔ سیتا ماتا نے ہنومان کو موتیوں کا ایک ہار انعام میں دیا۔ ہنومان موتیوں کو چباتا، دیکھتا اور پھینک دیتا۔ ان میں اسے کہیں رام دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رام تو تھا اس کے دل میں۔ انھیں موتیوں کے لئے بیوقوف لوگ لاکھ روپے دے دیتے!

اس دھیان یوگ کا ذکر کرتے ہوئے شروع میں ہی بھگوان نے ایک بڑی اہم بات بتادی ہے — وہ یہ کہ آدمی کو ایسا پکا ارادہ کرنا چاہیئے کہ —" مجھے خود اپنی نجات حاصل کرنی ہے۔ میں آگے بڑھوں گا۔ اونچی پرواز کروں گا۔ اس انسانی جسم میں جوں کا توں پڑا نہیں رہونگا، بلکہ بھگوان کے پاس جانے کی ہمت کے ساتھ کوشش کروں گا"۔

یہ باتیں سن کر ارجن کے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ اس نے کہا — بھگوان! اب تو ہماری عمر ختم ہو گئی۔ کچھ دنوں میں مر جائیں گے، تو یہ ساری سادھنا کس کام آئے گی؟" بھگوان نے جواب دیا —"موت کا مطلب ہے لمبی نیند" روزانہ کام کر کے ہم سات آٹھ گھنٹے سوتے ہیں؟ کیا اس نیند سے کوئی ڈرتا ہے؟ نیند اگر نہ آئے تو فکر ہو جاتی ہے۔ جیسے نیند ضروری ہے، ویسے ہی موت بھی ضروری ہے۔ جس طرح نیند سے اٹھ کر ہم اپنا کام شروع کر دیتے ہیں، ویسے ہی مرنے کے بعد بھی پہلے کی یہ تمام سادھنا کام آجائیں گی۔ گیان دیو نے گیانیشوری میں اس مضمون کو لے کر لکھی" اوویوں" میں گویا اپنا کردار ہی لکھ دیا ہے۔ "بچپن میں سارا علم خود بخود آتا ہے اور تمام علم خود بخود زبان سے نکلتے ہیں"۔

— اس طرح نکلے اشعار میں یہی دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے جنم کا ابھیاس تمہیں کھینچ لیتا ہے۔ کسی کا من تو التذاذ کی طرف جھانا ہی نہیں۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ مزہ کیسا ہوتا ہے! کیوں کہ پچھلے جنم میں وہ ان پر عمل کر چکا ہے۔

"جو آدمی بھلائی کی راہ پر چلتا ہے، اس کی ذرا سی محنت بھی بے کار نہیں جاتی" — آخر میں اس طرح کی عقیدت بتائی گئی ہے "جو نامکمل اور ادھورا ہے وہ آخر کو پورا ہو کر رہے گا"۔ بھگوان کی اس نصیحت کا خلاصہ قبول کرو اور اپنے جیون کو کامیاب بناؤ۔

اتوار، ۲۷-۳-۳۲

ساتواں باب

پرپتی - یا خدا کی پناہ

(۳۲) عبادت کا حسین نظارہ

بھائیو! ارجن کے سامنے جب سودھرم پر عمل کا سوال آیا، تو اپنے اور پرائے کا موہ اس کے من میں پیدا ہوگیا اور سودھرم سے بچنے کی تدبیر کرنے لگا۔ اس کا یہ فضول موہ پہلے باب میں دکھایا گیا ہے۔ اس موہ کو مٹانے کے لئے دوسرا باب شروع ہوا۔ اس میں یہ تین اصول بتائے گئے (۱) روح امر ہے اور سب جگہ پھیلی ہوئی ہے (۲) جسم فانی ہے۔ اور (۳) سودھرم کو کبھی بھی ترک نہیں کرنا چاہئے۔ ساتھ ہی ترک مکافات کی ترکیب بھی بتائی، جس سے ان اصولوں پر عمل کرنے کی کنجی ہاتھ لگ جائے۔

اس کرم یوگ سے تین چیزیں۔ کرم، وکرم اور اکرم پیدا ہوئے ہیں۔ کرم، وکرم کے ملاپ سے پیدا ہونے والے دو طرح کے اکرم پانچویں باب میں ہم نے دیکھ لئے۔ چھٹے باب سے طرح طرح کے وکرم بتانے کی شروعات کی گئی۔ چھٹے باب میں سادھنا کے لئے یکسوئی، جو ضروری چیز ہے اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔

آج ساتواں باب ہے۔ اس باب میں وکرم کا ایک نیا عمدہ محل کھول

دیا گیا ہے۔ قدرتی مناظر میں، کسی عظیم الشان جنگل میں ہم جس طرح، طرح طرح کے عمدہ نظارے دیکھتے جاتے ہیں، ویسا ہی احساس گیتا میں ہوتا ہے۔ چھٹے باب میں یکسوئی قلب کا ایک محل دیکھا۔ ہم اب ذرا دوسرے محل میں داخل ہوں۔ اس محل کا دروازہ کھولنے سے پہلے ہی بھگوان نے موہ پیدا کرنے والی اس دنیا کا راز سمجھا دیا ہے۔ ایک ہی طرح کے کاغذ پر ایک ہی برش سے مصور مختلف قسم کی تصویریں بناتا ہے۔ کوئی موسیقار سات سُروں سے مختلف راگ راگنیاں نکالتا ہے۔ ابجد کے چند حرفوں کی مدد سے ہم مختلف قسم کے خیالات اور جذبات ظاہر کرتے ہیں۔ ویسے ہی اس سنسار کو سمجھو۔ سنسار میں بے انتہا چیزیں اور رجحانات پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سارا اندر باہر کا سنسار ایک ہی غیر منقسم آتما اور مختلف عناصر، اس دوہرے مصالحے سے بنا ہے۔ غصہ ور کا غصہ، پریمی کا پریم، دکھی کا رونا، سکھی کی مسرت، کاہل کا نیند کی طرف جھکاؤ، محنتی کے کام کرنے کا جوش، یہ سب ایک ہی باشعور طاقت کے کھیل ہیں۔ ان باہم متضاد جذبات کی جڑ میں ایک ہی شعور یہاں سے وہاں تک بکھرا ہوا ہے۔ بھیتری شعور ایک ہی سا ہے۔ اسی طرح باہری پردہ کی شکل ایک سی ہی ہے۔ روح اور مادّہ، اس دوہرے مصالحے سے ساری مخلوق بنی ہے اور پیدا ہوئی ہے۔ یہ شروع ہی میں بھگوان بتا رہے ہیں۔

جسم اور روح، اپنا اور پرایا، سب ایک ہی ہے۔ پھر آدمی موہ میں کیوں پڑ جاتا ہے؟ اختلاف کیوں دکھائی دیتا ہے؟ ایک انسان کا چہرہ بھلا معلوم ہوتا ہے، تو کسی دوسرے کو دیکھ کر طبیعت ہٹتی ہے۔ ایک سے ملنے کی اور دوسرے سے پرہیز کرنے کی طبیعت کیوں ہوتی ہے؟ ایک ہی پنسل، ایک ہی کاغذ، ایک ہی مصور لیکن مختلف تصویروں سے مختلف خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ مصور کی یہی خوبی ہے۔ مصور کے برش میں، موسیقار کے انگلیوں میں ایسی خوبی ہے کہ وہ ہمیں رُلا بھی دیتے ہیں اور ہنسا بھی دیتے ہیں۔

یہ ساری خوبی ان انگلیوں میں ہے۔

یہ نزدیک رہے وہ دور رہے؛ یہ میرا، وہ پرایا ـــــ ایسے جو خیالات من میں آتے ہیں اور جن کی وجہ سے وقت پر فرض سے بھی پیچھے ہٹنے کا رجحان پیدا ہونے لگتا ہے، اس کا سبب موہ ہے۔ اس موہ سے بچنا ہو، تو اس خالق عالم کی انگلیوں کی کرامات کا راز سمجھ لینا چاہیے۔ "برھدارنیک اُپنیشد" میں نقارے کی مثال دی گئی ہے ایک ہی نقارہ سے طرح طرح کی آوازیں نکلتی ہیں۔ کچھ آوازوں سے میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں، کچھ کو سن کر ناچ اٹھتا ہوں۔ ان سب خد. بات یہ اگر قابو پالینا ہے، تو نقارہ بجانے والے کو پکڑ لینا چاہیے۔ اس کے پکڑ میں آتے ہی ساری آوازیں گرفت میں آجاتی ہیں۔ بھگوان ایک ہی جملہ میں کہتے ہیں "جو مایا کو تیرجانا چاہتے ہیں وہ میری پناہ میں آئیں۔ صرف وہی لوگ جو میری پناہ میں آئیں گے، وہ مایا کے کھیل سے بچیں گے؛ ان کے لیے مایا کا پانی ابھی ہی خشک ہو جائے گا"۔

تو یہ مایا کیا ہے؟ مایا کہتے ہیں بھگوان کی طاقت کو، اس کے ہنر کو، خوبی کو۔ (روح اور مادہ) جینیوں کی زبان میں کہیں تو (روح اور غیر روح) کے دوہرے مصالحہ سے جس نے یہ لاتعداد رنگوں والی دنیا تعمیر کی ہے، اس کی طاقت اور اس کا ہنر ہی مایا ہے۔ جیل خانہ میں جس طرح ایک ہی اناج کی روٹی اور وہی ایک طرح کی دال سب کے لیے ہوتی ہے، ویسے ہی ایک ہی اٹوٹ آتما اور ایک طرح کے مرکب کا یہ جسم سمجھو۔ اس سے بھگوان طرح طرح کی چیزیں بناتا رہتا ہے۔ ہم ان چیزوں کو دیکھ کر مختلف اور متضاد اچھے برے خیالات کا احساس تصور کرتے ہیں۔ اس چکر سے بچ کر اگر ہم سچا سکون پانا چاہتے ہیں، تو ان چیزوں کے بنانے والے کو پکڑ لینا چاہیے۔ اور اس سے تعارف پیدا کر لینا چاہیے۔ اس سے تعارف

ہو جانے پر ہی اس اختلاف اور لگاؤ پیدا کرنے والے موہ سے بچا جا سکے گا۔

اس بھگوان کو سمجھ لینے کا ایک بڑا ذریعہ بتانے کے لئے ساتویں باب میں بھکتی کا ایک خوبصورت محل کھڑا کر دیا ہے۔ صفائی قلب کے لئے یگیہ دان (عمل و خیرات) جپ تپ (تسبیح تہلیل) دھیان دھارنا (مراقبہ ذکر کاشغل) وغیرہ وغیرہ ——— بہت سے ورکرم بتلائے جاتے ہیں ——— لیکن ان طریقوں کو میں سوڈا، صابن اور اریٹھا کی مثال دوں گا۔ لیکن بھکتی کو پانی کہوں گا۔ سوڈا، صابن اور اریٹھا صفائی لاتے ہیں، لیکن پانی کے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ پانی نہ ہو تو ان سے کیا فائدہ؟ اس کے برعکس اگر سوڈا، صابن، اریٹھا نہ ہو اور صرف پانی ہی ہو تو بھی صفائی ضرور آ سکتی ہے۔ اس پانی کے ساتھ اگر یہ چیزیں بھی ہوں تو زیادہ سے زیادہ کامیابی ہو جائے گی، گویا دودھ میں شکر کا اضافہ ہو جائے گا۔ یگیہ کرنا کرانا دھیان اور تپ، ان سب میں اگر دلی لگن نہ ہو تو پھر صفائی قلب ہو گی کیسے؟ دلی لگن کا ہی مطلب ہے بھکتی۔

سب طرح کے ذریعوں کو بھکتی کی ضرورت ہے۔ بھکتی ایک ہمہ گیر ندبیر ہے۔ سیوا اور تیمارداری میں ماہر اگر کوئی شخص کسی مریض کی خدمت کے لئے جاتا ہے، لیکن اگر اس کے دل میں خدمت کا جذبہ نہ ہو گا تو بتائیے سچی خدمت کیسے ہو گی؟ بیل چاہے کتنا ہی موٹا تازہ ہو، لیکن اگر گاڑی کھینچنے کی خواہش ہی اس میں نہ ہو، تو کندھا ڈال کر بیٹھ جائے گا اور ممکن ہے گاڑی کو کسی گڈھے میں گرا دے۔ جس کام میں دلی لگن نہیں ہے، اس سے نہ اطمینان میسر ہو سکتا ہے اور نہ قوت۔

(۴۳) عبادت سے خالص سرور کا حصول

یہ بھکتی ہو گی، تو اس بڑے مصور کے فن کو ہم دیکھ سکیں گے۔ ہم اس کے ہاتھ کا وہ قلم دیکھ سکیں گے جہاں ایک بار اس سرچشمہ کے جھرنے کو اور اس کے

بے نظیر شیریں رس کو چکھ لیا تو پھر باقی کے تمام رس حقیر اور بے کیف معلوم ہوں گے جس نے اصلی کیلے کھالئے وہ لکڑی کے رنگین کیلے ہاتھ میں لے گا اور "بڑے خوبصورت ہیں" کہہ کر ایک طرف رکھ دے گا۔ اصلی کیلوں کا مزہ مل جانے کے سبب اسے ان نقلی کیلوں میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح جسے اصلی جھرنے کی مٹھاس کا مزہ مل گیا ہے، وہ بازار کے شربت گلاب پر لٹو نہیں ہوگا۔

ایک عارف سے لوگوں نے کہا ــــــ "حضرت چلئے۔ شہر میں آج بڑی آرائش کی گئی ہے" عارف نے پوچھا کہ ــــــ "بھائی یہ آرائش کیا ہوتی ہے؟ ایک چراغ، اس کے بعد دوسرا، پھر تیسرا، اسی طرح لاکھ، دس لاکھ، کروڑ جتنے چاہو سمجھ لو۔ جان گیا تمہاری آرائش کو" علم حساب میں ۱ + ۲ + ۳ .... لامعلوم تعداد تک ہوتا ہے۔ ہندسوں ہندسوں میں جو فرق رکھنا ہو، وہ اگر معلوم ہو جائے تو پھر ساری تعداد لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح وہ چراغ ایک کے بعد ایک رکھ دئے۔ ان میں اتنا مشغول ہونے کی کون سی بات ہے؟ مگر انسان کو یہی مسرت محبوب ہوتی ہے۔ وہ لیموں لائے گا، شکر لائے گا، پانی میں اسے گھولے گا اور پھر بڑے ذائقہ سے پی کر کہے گا ــــــ " واہ کیا بڑھیا شکنجبین بنی ہے" زبان کو ذائقہ چکھنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے؟ یہ اس میں ملاؤ، وہ اس میں ملاؤ، ایسی چاٹ کھانے میں ہی اسے سارا مزہ ملتا ہے۔ بچپن میں ایک دفعہ میں تھیٹر دیکھنے گیا تھا۔ ساتھ ہی ایک ٹاٹ کا ٹکڑا لے گیا تھا کہ اگر نیند آنے لگے تو سو جاؤں۔ پردے پر آنکھوں کو چندھیا دینے والی آگ میں پردہ پر دیکھنے لگا۔ آگ کی ان تصویروں کو دیکھ کر دو ہی چار منٹ میں میری آنکھیں تھکنے لگیں۔ میں اپنے ٹاٹ پر سو گیا اور کہا کہ جب ختم ہو جائے تو جگا لینا۔ رات کو کھلی فضا میں آسمان کے چاند تارے دیکھنا چھوڑ کر، عالم سکون کا وہ پاک لطف ترک کر کے، اس کند تھیٹر میں آگ کی پتلیوں کو دیکھ کر لوگ تالیاں پیٹتے ہیں! میری سمجھ میں ہی یہ سب آتا تھا۔

انسان اتنا بے کیف کیوں؟ ان بے جان تیلیوں کو دیکھ کر آخر بیچارہ کسی طرح تھوڑا کیف حاصل کر لیتا ہے۔ زندگی میں جب کیف نہیں ہے، تو پھر اس طرح مصنوعی لطف کی تلاش کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے پڑوس میں باجا بجنا شروع ہوا۔ میں نے پوچھا "یہ باجا کیوں؟" تو کہا گیا "لڑکا ہوا ہے۔" دُنیا میں کیا ایک تمہارے ہی لڑکا ہوا ہے، جو باجا بجا کر جتاتے ہو کہ میرے یہاں لڑکا ہوا ہے؟ لڑکا ہونے کی بات کہہ کر ناچنا، کودنا اور گاتا ہے، یہ لڑکپن نہیں تو کیا ہے؟ گویا لطف کا اکال ہی پڑ گیا ہے۔ قحط کے دنوں میں جس طرح کہیں اناج کا دانہ دیکھتے ہی لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں، اسی طرح جہاں لڑکا ہوا، سرکس آیا، سنیما آیا کہ یہ لطف کے بھوکے پیاسے بے چارے ٹڈی کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔

کیا یہ سچا سور ہے؟ موسیقی کی لہریں کانوں میں گھس کر دماغ کو دھکا دیتی ہیں۔ رُوپ آنکھوں میں گھس کر دماغ کو دھکا دیتا ہے۔ اس دھکے میں ہی ان بیچاروں کا آنند سمایا رہتا ہے۔ کوئی تمباکو کوٹ کر اسے ناک میں چڑھاتا ہے، کوئی بیڑی بنا کر منہ میں ٹھونستا ہے۔ اس سونگھنی کا یا اس دھوئیں کا دھکا لگا، تو گویا ان کو آنند کی گٹھری مل جاتی ہے۔ بیڑی کا ٹھونٹھ ملتے ہی اس کے لطف کی انتہا نہیں رہتی۔ ٹالسٹائے لکھتے ہیں۔" اس سگریٹ کے خمار میں انسان کسی کا خون بھی کر ڈالے، تو تعجب نہیں۔" اسے ایک قسم کا نشہ ہی سمجھو۔

ایسی مسرت میں انسان کیوں مست ہو جاتا ہے؟ کیونکہ اسے سچی مسرت کا پتہ ہی نہیں ہے۔ وہ تو پرچھائیں پر ہی پاگل ہو رہا ہے۔ آج وہ حواس خمسہ کا ہی لطف لے رہا ہے۔ اس کے اگر آنکھ نہ ہوتی، تو وہ سمجھتا کہ چار ہی حواس کا لطف دُنیا میں ہے۔ کل اگر مریخ سے کوئی چھ حواس والا شخص نیچے اتر آئے، تو یہ بیچارے پانچ حواس والے مایوس ہو کر رونے لگیں گے کہ "ہائے اس کے مقابلہ میں ہم کتنے

گئے گذرے اور لاچار ہیں۔

سنسار کا تمام راز پانچ اندریوں (حواس خمسہ) کو کیسے معلوم ہو؟ ان پانچوں میں بھی پھر وہ انتخاب کرتا ہے اور اس میں مست رہتا ہے۔ گدھے کا رینکنا اس کے کانوں میں جاتا ہے، تو کہتا ہے کہ کہاں سے یہ نامبارک آواز آگئی؟ تو کیا تمہارا درشن اس گدھے کے لئے منحوس نہیں ہے؟ تم کو ہی اس سے نقصان پہنچتا ہے، کیا دوسروں کا تم سے کچھ نہیں بگڑتا؟ ایک بار جب میں بڑودا کالج میں تھا، تب کچھ یوروپین گانے والے آئے تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے گانے والے، اپنی طرف سے تو کمال ہی کر رہے تھے، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ کب یہاں سے بھاگ نکلوں، کیونکہ مجھے ویسا گانا سننے کی عادت نہ تھی۔ میں نے انھیں فیل کر دیا۔ ہماری طرف کے موسیقار اگر ادھر گئے، تو شائد وہاں فیل سمجھے جائیں گے۔ اس طرح موسیقی سے ایک کو لطف آتا ہے، تو دوسرے کو نہیں۔ مطلب یہ کہ سچا آنند نہیں ہے۔ مایا کا جھوٹا لطف ہے۔ جب تک سچے آنند کا دیدار نہ ہوگا، تب تک اس جھوٹے اور دھوکہ دینے والے آنند میں ہی جھولتے رہیں گے۔ جب تک اصلی دودھ نہیں ملا تھا، اشو تھاما آٹا گھول کر بنایا ہوا دودھ ہی اصلی دودھ سمجھ کر پیتا تھا۔ اسی طرح جب آپ صحیح شکل سمجھ لیں گے اور اس ذائقہ کو سمجھ لیں گے، تو پھر دوسری چیزیں پھیکی لگنے لگیں گی۔ اس مسرت کا پتہ لگانے کی اعلیٰ تدبیر ہے بھگتی۔ اس راہ پر چلتے چلتے پرمیشور کی حقانیت کا پتہ چل جائے گا۔ اس ملکوتی تصور کے آنے ہی دوسرے سارے تصورات خود بخود غائب ہو جائیں گے۔ پھر چھوٹی چیزوں کے بارے میں کوئی کشش نہیں رہ جائے گی۔ پھر دُنیا میں ایک آنند ہی بھرا ہوا دکھائی دے گا۔ مٹھائی کی دکانیں بھلے ہی سیکڑوں ہوں، مگر سب میں مٹھاس ہی ہوتی ہے۔ جب تک اصلی چیز ہاتھ نہ لگے گی، تب تک ہم چنچل پرند کی طرح ایک چیز یہاں کی کھائیں گے، تو ایک وہاں کی

رتے میں تلسی راماین پڑھ رہا تھا۔ چراغ کے پاس کیڑے جمع ہو رہے تھے۔ اتنے میں وہاں ایک چھپکلی آئی۔ اسے میری راماین سے کیا لینا تھا! کیڑے دیکھ کر اسے کتنا لطف آ رہا تھا! وہ کیڑوں پر جھپٹنے والی تھی کہ میں نے ذرا ہاتھ ہلا دیا۔ وہ بھاگ گئی۔ مگر اس کا دھیان برابر کیڑے پر ہی رہا۔ میں نے اپنے من میں سوچا "تو کھاتی ہے اس کیڑے کو، تیری زبان پر رال ٹپکتی ہے؛ مگر میری زبان سے رال نہیں ٹپکتی۔ جس رس کا اندر میں لوٹ رہا تھا، اس کا اس بیچاری چھپکلی کو کیا پتہ؟ وہ راماین کا رس نہیں چکھ سکتی تھی۔

اس چھپکلی کی طرح ہماری حالت ہے۔ ہم مختلف قسم کے رسوں میں مست رہتے ہیں، لیکن اگر سچا رس مل جائے، تو کیسی بہار آئے! بھگوان بھکتی کا طریقہ دکھا رہے ہیں، جس سے ہم اس اصلی رس کو چکھ سکیں گے۔

(۳۴) غرض مندانہ عبادت کی بھی قیمت ہے

بھگوان نے بھگت کی تین قسمیں بتلائی ہیں:۔ سکام بھکتی (عبادت مع غرض کرنے والا (۲) نشکام لیکن ایکانگی (بے غرض لیکن نامکمل) عبادت کرنے والا اور (۳) گیانی یا سمپورن بھکتی (سراپا عبادت) کرنے والا۔ نشکام لیکن ایکانگی بھکتی کرنے والوں کی تین قسمیں ہیں (۱) آرت (مجذوب و وارفتہ) (۲) جگیاسو (تلاش و تفتیش میں فکر و کاوش کرنے والا) (۳) ارتھارتھی (عوامی فلاح پر نظر رکھنے والا)۔ بھکتی نما پیڑ کی یہ شاخیں در شاخیں ہیں۔

سکام بھکتی کا مطلب کیا ہے؟ کچھ خواہش من میں رکھ کر بھگوان کے پاس جانے والا۔ میں یہ کہہ کر اس کی توہین نہ کروں گا کہ یہ بھکتی گھٹیا قسم کی ہے۔ کئی لوگ عوامی خدمت کے میدان میں اس لئے کودتے ہیں کہ عزت اور توقیر حاصل ہو۔ اس میں نقصان کیا ہے؟ آپ انھیں عزت دے دیجئے۔ اس سے کچھ ہرج نہ ہوگا۔ ایسی عزت ملتے رہنے سے، آگے چل کر وہ عوامی خدمت میں

لگے رہ جائیں گے۔ پھر اسی کام میں انھیں لطف آنے لگے گا۔ عزت حاصل کرنے کی جو خواہش ہوتی ہے، اس کا مطلب بھی آخر کیا ہے؟ یہی کہ اس عزت کو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ جو کام ہم کرتے ہیں، وہ اچھا ہے۔ میری خدمت اچھی ہے یا بُری، یہ سمجھنے کے لئے جس کے پاس کوئی باطنی ذریعہ نہیں ہے، وہ اس باہری ذریعہ کا سہارا لیتا ہے۔ ماں نے بچے کی پیٹھ ٹھونک کر کہا "شاباش" تو اس کا جی چاہتا ہے کہ ماں کے اور کام بھی کرے۔ یہی کام "سکام بھگتی" کا ہے۔ سکام بھگت سیدھے پرمیشور کے پاس جا کر کہے گا۔ "دو"۔ سب کچھ بھگوان سے مانگنے کا رجحان ہونا معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔

گیان دیو نے نام دیو سے پوچھا۔ "تیرتھ یاترا کو چلو گے نا؟" نام دیو نے کہا۔ "کس لئے؟" گیان دیو نے کہا "سادھو سنتوں کی صحبت رہے گی۔" نام دیو نے جواب دیا۔ "تو بھگوان سے پوچھ آتا ہوں۔" نام دیو مندر میں جا کر بھگوان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بھگوان کے خوب صورت قدموں کی طرف وہ دیکھتے رہے۔ آخر کو روتے روتے انھوں نے پوچھا۔ "پربھو، کیا میں جاؤں؟" گیان دیو قریب ہی تھے۔ نام دیو کو کیا آپ پاگل کہیں گے؟ ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو بیوی کے گھر میں نہ ہونے سے روتے ہیں، لیکن پرمیشور کے پاس جا کر رونے والا بھگت چاہے سکام ہی کیوں نہ ہو، بڑی غیر معمولی ہستی ہے۔ اب یہ اس کی ناواقفیت سمجھو کہ جو چیز سچ مچ مانگنے کے لائق ہے، اسے وہ نہیں مانگتا، لیکن اتنی خامی کی وجہ سے اس کی سکام بھگتی حقیر نہیں سمجھی جا سکتی۔

عورتیں صبح اٹھ کر طرح طرح کے پوجا پاٹھ کرتی ہیں، کس لئے؟ تاکہ مرنے کے بعد پرمیشور کی دیا حاصل ہو، ان کے من میں ایسا بھولا جذبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ برت، تپ اور اُپواس وغیرہ اختیار کرتی ہیں۔ ایسے برت

رکھنے والے خاندانوں میں نیک لوگوں کا جنم ہوتا ہے۔ تلسی داس کے خاندان میں سوامی رام تیرتھ پیدا ہوئے۔ رام تیرتھ فارسی زبان کے عالم تھے۔ کسی نے کہہ دیا۔ "تلسی داس کے خاندان میں پیدا ہوئے ہو اور سنسکرت نہیں جانتے؟" رام تیرتھ کو یہ بات چبھ گئی۔ خاندانی غیرت میں کتنی طاقت ہوتی ہے! اس سے متاثر ہو کر وہ سنسکرت کے گہرے مطالعہ میں جٹ گئے۔ عورتیں جو بھگتی بھاؤ رکھتی ہیں، اس کی دل لگی نہیں اڑانا چاہیئے۔ جہاں بھگتی کا ایسا ایک ایک ذرہ اکٹھا ہوتا ہے، وہاں صالح حلال اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے بھگوان کہتے ہیں کہ۔ "میرا بھگت سکام ہوگا، تو بھی میں اس کی بھگتی کو مضبوط کروں گا۔ اس کے من میں گول مال نہیں ہونے دوں گا۔ اگر وہ مجھ سے سچے دل سے دعا کرے گا کہ میرا روگ دور کر دو، تو میں اس کے جذبۂ صحت کو مضبوط کر کے اس کی بیماری کو دور کر دوں گا۔ چاہے کسی بھی وسیلے سے کیوں نہ ہو۔ اگر وہ میرے پاس آئے گا، تو میں اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اس کی قدر ہی کروں گا۔" دھرو کی ہی مثال لیجئے۔ باپ کی گود میں بیٹھنے نہ پایا، تو اس کی ماں نے کہا۔ "ایشور سے جگہ مانگ۔" وہ عبادت میں لگ گیا۔ بھگوان نے اسے مستقل مقام دے دیا۔ من اگر بے آرزو نہ ہو، تو بھی کیا ہوا؟ اصل بات یہ ہے کہ آدمی جاتا کس کے پاس ہے، مانگتا کس سے ہے؟ سنسار کے سامنے ہاتھ نہ پھیلا کر ایشور سے مانگنے کے رجحان کی اہمیت کو کم نہ سمجھنا چاہیئے۔

کوئی بھی وسیلہ ہو، تم بھگتی منڈل میں جاؤ تو۔ شروع میں اگر آرزو لے کر بھی جاؤ گے، تو آگے چل کر نشکام ہو جاؤ گے۔ نمائشیں کی جاتی ہیں۔ ان کے چلانے والے کہتے ہیں۔ "اجی، آپ آکر تو دیکھئے۔ کیسی بڑھیا، رنگین، باریک کھادی بننے لگی ہے۔ ذرا نمونہ تو دیکھئے۔" گاہک آتا ہے اور متاثر ہوتا ہے۔ یہی بات بھگتی کی ہے۔ عقیدت کے منڈل میں ایک دفعہ جاؤ تو، پھر وہاں کی خوبی و صلاحیت خود بخود

معلوم ہو جائے گی۔ سورگ جاتے ہوئے دھرم راج کے ساتھ آخر میں ایک کتا ہی رہ گیا۔ بھیم اور ارجن سب راستہ میں ہی گل گئے۔ سورگ کے دوازے پر دھرم راج سے کہا گیا کہ "تم آسکتے ہو، مگر یہ کتا نہیں آسکتا۔" دھرم راج نے کہا۔ "اگر میرا کتا نہیں جا سکتا، تو میں بھی نہیں جاسکتا۔" کیونکہ ایشور کی خدمت کرنے والا چاہے کتا ہی کیوں نہ ہو، مگر وہ دوسرے "میں" "تیں" کرنے والوں سے تو وہ بہتر ہی ہے۔ وہ کتا تو بھیم، ارجن سے بھی افضل ثابت ہوا۔ پرمیشور کی طرف جانے والا چاہے حقیر کیڑا ہی کیوں نہ ہو، وہ خدا کی طرف نہ جانے والی بڑی سے بڑی ہستی سے افضل اور بزرگ تر ہے۔ مندر میں گھوڑے اور نندی کی مورتیاں رہتی ہیں؛ لیکن اس نندی بیل کو نمسکار کرتے ہیں، کیونکہ وہ معمولی بیل نہیں ہے۔ وہ بھگوان کے سامنے رہتا ہے۔ بیل ہونے پر بھی یہ نہیں بھول سکتے کہ وہ پرمیشور کا ہے۔ بڑے بڑے عقل مندوں کی بہ نسبت وہ افضل ہے۔ ایک پاگل بھی کیوں نہ ہو، وہ اگر خدا کی یاد کرتا ہے، تو وہ دنیا کے لئے قابلِ پرستش ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ میں ریل گاڑی میں جا رہا تھا۔ جمنا کے پُل پر گاڑی آئی۔ پاس میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے بڑی خوش دلی سے اس میں ایک ادھیلا ڈال دیا۔ پاس ہی میں ایک نکتہ چیں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "ملک ویسے ہی غریب ہے اور یہ لوگ یوں بیکار پیسہ پھینکتے ہیں۔" میں نے کہا "آپ نے اس کے مقصد کو سمجھا نہیں۔ جس جذبے سے اس نے دھیلا پھینکا، اس کی قیمت دو چار پیسے بھی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کسی دوسرے نیک کام کے لئے یہ پیسے دئیے ہوتے، تو یہ دان بعد میں اچھا ہوتا۔ پھر اس بات کا خیال تو ہم بعد میں کریں گے، لیکن اس نیک جذبہ والے نے تو اس خیال سے متاثر ہو کر یہ تیاگ کیا ہے کہ یہ ندی کیا، ایشور کی کرپا بہہ رہی ہے۔ اس جذبہ کے لئے آپ کے اعتقادات میں کوئی جگہ ہے؟ دلیپ کی ایک ندی کو دیکھ کر

اس کا دِل پگھل گیا۔ اگر اس جذبہ کی آپ قدر کرسکیں، تو میں آپ کی دیش بھگتی کا امتحان لوں گا۔" دیش بھگتی کا مطلب کیا سوجھتی ہے؟ دیس کی ایک پاکیزہ ندی دیکھ کر اگر یہ جذبہ من میں پیدا ہوتا ہے کہ اپنی ساری دولت اس میں ڈبو دوں، اس کے قدموں پہ نثار کردوں، تو یہ کتنی بڑی دیش بھگتی ہے! وہ دھن دولت، وہ پتھر پہلے پتھر، کیڑوں کی گندگی سے بنے ہوئے موتی اور کوئلہ سے بنے ہوئے ہیرے ۔ ان سب کی قیمت پانی میں ڈبو دینے کے لائق ہی ہے۔ پرمیشور کے چرنوں کے یہ سب دھول اور حقیر سمجھو۔ آپ پوچھیں گے کہ ندی کا اور ایشور کے چرنوں کا کیا تعلق؟ آپ کی دنیا میں پرماتما کا کچھ تعلق ہے بھی؟ ندی ہے آکسیجن اور ہائیڈروجن۔ سورج ہے کہیں کی آگ کا ایک بڑا نمونہ۔ اسے نمسکار کیوں کریں؟ نمسکار کرنا ہوگا صرف آپ کی روٹی کو۔ پھر اس روٹی میں بھی بھلا کیا ہے؟ وہ بھی تو بالآخر ایک سفید مٹی ہی ہے۔ اس کے لئے کیوں اتنی رال ٹپکاتے ہو؟ آسمان پر یہ سورج چمک رہا ہے، اتنی خوب صورت یہ ندی بہ رہی ہے۔ ان میں اگر خدا کا تصور نہ ہوگا، تو پھر ہوگا کہاں؟ انگریز شاعر ورڈس ورتھ بڑے دُکھ سے کہتا ہے" پہلے جب میں اندر دھنش دیکھتا تھا، تو ناچ اٹھتا تھا۔ دِل پوری میں مارنے لگتا تھا، مگر آج میں کیوں نہیں ناچ اُٹھتا؟ پہلے کا لطف زندگی کھو کر میں کہیں حقیر تو نہیں بن گیا؟"

مطلب یہ کہ سکام بھگتی اور گنوار آدمی کے جذبہ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ آخر میں اس سے عظیم صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ذی روح کوئی بھی اور کیسا بھی ہو، جب وہ ایک بار پرمیشور کے دربار میں آجاتا ہے، تو پھر وہ مقبول ہو جاتا ہے۔ آگ میں کیسی بھی لکڑی کو ڈالئے، وہ جل ہی اٹھے گی۔ پرمیشور کی بھگتی ایک انوکھی سادھنا ہے۔ وہ سکام بھگتی کی بھی قدر کرے گا۔ آگے چل کر وہ بھگتی سے لوبھ اور کمال کی طرف چلی جائے گی۔

(۳۵) بے لوث عبادت کی قسمیں اور اس کا کمال

سکام بھگتی ہم نے دیکھی، اب نشکام بھگتی دیکھیں۔ ان میں اور دو قسمیں ہیں۔ ایکانگی اور پورن۔ پھر ایکانگی کی تین قسمیں ہیں۔ ان میں پہلی قسم آرت بھگتوں کی ہے۔ آرت ہوتا ہے دیا کا طلب گار، بھگوان کے لئے رونے چلّانے اور بے چین رہنے والا۔ جیسے نام دیو۔ وہ اس بات کے لئے بے چین رہتا ہے کہ کب بھگوان کے پریم رس کو چکھوں گا، کب اس کے گلے مل کر جیون کو سپھل کروں گا، کب اس کے قدموں میں ڈال کر نیک بخت بنوں گا! ہر کام میں وہ یہ دیکھے گا کہ سچائی، دلی لگاؤ، اضطراب اور پریم اس میں ہے یا نہیں؟ دوسری قسم ہے جگیاسوؤں کی۔ فی الحال اپنے دیس میں اس درجہ کے بھگت بہت نہیں ہیں۔ اس قسم کے بھگت کبھی گوری شنکر پہاڑ پر بار بار چڑھیں گے اور مر جائیں گے، کبھی قطب شمالی کی تلاش میں نکل پڑیں گے اور اپنی تلاش و تحقیقات کے نتائج ایک کاغذ پر لکھ کر انھیں بوتل میں بند کر کے پانی میں چھوڑ کر مر جائیں گے، کوئی کوہ آتش فشاں کے دہانے میں اتریں گے۔ ابھی تو ہندستانیوں کے لئے موت ایک خوفناک شئے ہو رہی ہے۔ اپنے کنبے و خاندان کی پرورش سے بڑھ کر دوسرا کوئی نیک کام ہی انھیں نہیں ہے۔ جگیاسو بھگت کے پاس حصول معلومات کی اٹوٹ خواہش ہوتی ہے۔ وہ ہر شے کی فطرت اور اصلیت تلاش کرتا ہے۔ انسان جیسے دنیا کے مخرج کے مہا سمندر کو پا جاتا ہے، اسی طرح یہ جگیاسو بھی آخر میں پرمیشور تک پہنچ جائے گا۔

تیسری قسم ارتھارتھیوں کی ہے۔ یعنی وہ بھگت جو ہر بات میں کوئی نہ کوئی مفاد پیش نظر رکھتے ہیں۔ مفاد کا مطلب روپیہ پیسہ سے نہیں ہے، بلکہ نیکی اور بھلائی سے ہے۔ کسی بھی بات کی تحقیق کرتے وقت وہ اسے اسی معیار سے دیکھے گا کہ

اس سے سماج کا کیا بھلا ہوگا۔ وہ دیکھے گا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، لکھتا ہوں اور کرتا ہوں اس سے دُنیا کا بھلا ہوگا یا نہیں۔ غیر مفید اور فضول کام اسے منظور نہیں۔ سنسار کی بھلائی کی فکر کرنے والا کتنا بڑا وہ بھاتما ہے! سنسار کی بھلائی ہی اس کا آنند ہے۔ جو پریم کی نگاہ سے تمام کرموں کو دیکھتا ہے، وہ آرت ہے۔ گیان کی نگاہ سے جو دیکھتا ہے، وہ جگیاسو ہے اور جو فلاح کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ ارتھارتھی ہے۔

یہ تینوں بھگت ہیں تو نشکام لیکن ایکانگی ہیں۔ ایک کرم کے ذریعہ، دوسرا دل کے ذریعہ، تیسرا بُدھی کے ذریعہ ایشور کے پاس پہنچتا ہے۔ اب رہا پورن بھگت (کامل) اس کو گیانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بھگت کو جو کچھ نظر آتا ہے، وہ سب پرمیشور کا ہی روپ ہے۔ حسین، بدصورت، امیر، غریب، عورت، مرد، چرندہ پرندہ، سب جگہ پرماتما کے ہی پاک نظارے ہیں ؎

"اے بھگوان، میرا دل ایسا بنا دو کہ مرد عورت اور بچے سبھی میں تمہارا دیدار ہو جائے" سنت تکا رام کی ایسی پرارتھنا ہے۔ ہندو دھرم میں جیسے ناگ پوجا، گنیش پوجا، پیڑوں کی پوجا وغیرہ پاگل پن کے نمونے ہیں، ان سے بھی بڑھ کر پاگل پن کی مثالیں پورن بھگتوں کے ہاں نظر آتی ہیں۔ ان سے کوئی بھی کیوں نہ ملے، انھیں چیونٹیوں سے لے کر چاند سورج تک، سب جگہ ایک ہی پرماتما دکھائی دیتا ہے۔ اور ان کا دل آنند سے ہلوریں مارنے لگتا ہے ؎

"پھر اسے بے انتہا سکھ ملتا ہے۔ آنند سے اس کا دل ہلوریں مارنے لگتا ہے" ایسا یہ حسین اور سندر نظارہ ہے، اسے آپ چاہے دھوکہ کہیں، مگر یہ دھوکہ سکھ کا خزانہ ہے اور آنند کا منبع ہے۔ اسے اس سنجیدہ ساگر میں ایشور کا وہ دکھائی پڑتا ہے۔ سمائے ہوئے میں اسے ایشور کا بمبیم نظر آتا ہے۔ زمین میں اس کی شکتی دکھائی دیتی ہے بغیر بدلا کے

آسمان میں اس کی پاکیزگی، سورج، چاند اور تاروں میں اس کا جلال اور اسکی عظمت دکھائی پڑتی ہے پھول میں اس کی نزاکت اور برے لوگوں میں اپنا امتحان لینے والا پرمیشور نظر آتا ہے۔ اس طرح "ایک ہی پرماتما سب جگہ جلوہ افروز ہے" یہ دیکھنے کی مشق گیانی بھگت کیا کرتے ہیں۔ ایسا کرتے کرتے وہ گیانی بھگت ایک دن ایشور میں ہی مل جاتا ہے۔

اتوار، ۳-۴-۳۲

آٹھواں باب

پریان سادھنا: سانتیہ یوگ

(۲۶) پاکیزہ سنسکاروں کا حصول

اِنسانی زندگی طرح طرح کے سنسکاروں (تاثرات) سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ ہم سے بے شمار افعال صادر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہم ان کا حساب لگانے لگیں، تو اس کا خاتمہ ہی نہیں ہو سکتا۔ موٹے طور پر اگر ہم ۲۴ گھنٹے کے ہی کاموں کا جائزہ لیں، تو ان کی گنتی کتنی بڑھ جائے گی۔ کھانا، پینا، بیٹھنا، سونا، چلنا، پھرنا، کام کرنا، لکھنا، بولنا، پڑھنا — ان کے علاوہ طرح طرح کے خواب، الفت و نفرت، توقیر و توہین، دکھ سکھ وغیرہ بے انتہا اقسام دکھائی دیں گے۔ ان سب کے سنسکار ہمارے من پر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ زندگی کسے کہتے ہیں تو میں کہوں گا — "سنسکار سنچے" (تاثرات کا مجموعہ)۔

سنسکار دونوں طرح کے ہوتے ہیں، اچھے بھی اور بُرے بھی۔ دونوں کا اثر اِنسان کی زندگی پر پڑتا رہتا ہے۔ بچپن کے اعمال کی تو ہمیں یاد بھی نہیں رہتی۔ سارا بچپن اس طرح مِٹ جاتا ہے، جیسے سلیٹ پر لکھ کر مٹا دیا ہو۔ پچھلے جنم کے سنسکاروں پر تو بالکل ہی پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس بات کا بھی شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ پچھلا جنم تھا بھی یا نہیں۔ جب اس جنم کا ہی بچپن یاد نہیں رہتا، تو پھر پچھلے جنم کی بات ہی کیا۔ پچھلے جنم کو جانے دیجئے، اپنا موجودہ

زندگی پر ہی غور کیجیے، یہ بات نہیں کہ جتنے اعمال ہمیں یاد رہتے ہیں، اتنے ہی ہوتے ہیں۔ اعمال بہت سارے ہوتے ہیں اور گیان بھی بہت سے؛ لیکن یہ اعمال اور گیان مٹ کر آخر میں کچھ سنسکار ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ رات کو سوتے وقت دن کے سارے اعمال کی اگر ہم یاد کرنے لگیں، تو بھی یاد نہیں آتے۔ یاد کون سے اعمال آتے ہیں؟ وہی اعمال ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، جو بہت واضح اور باثر ہوتے ہیں۔ اگر ہمارا کسی سے لڑائی جھگڑا ہوا ہے، تو وہ یاد رہتا ہے۔ کیونکہ اس دن کی وہی خاص کمائی ہوتی ہے۔ خاص اور واضح قسم کے اعمال کے سنسکار من پر بڑے گہرے ہوجاتے ہیں۔ خاص اعمال یاد رہتے ہیں، باقی سب پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اگر ہم روزنامچہ لکھنے بیٹھیں، تو دو چار اہم باتیں لکھ لیتے ہیں۔ اگر ہم دن کے ایسے سنسکاروں کو لے کر ایک ہفتہ کا حساب لگانے لگیں؛ تو اور بھی کئی باتیں اس میں سے نکل جائیں گی اور ہفتہ کے خاص واقعات ہی رہ جائیں گے۔ پھر مہینے بھر بعد اپنے پچھلے کاموں کا حساب لگانے بیٹھیں، تو اتنی ہی باتیں ہمارے سامنے آتی رہیں گی، جو اس ماہ میں خاص رہی ہوں گی۔ اسی طرح پھر چھ مہینے، سال، پانچ سال کا حساب لگائیں، تو بہت ہی تھوڑی اہم باتیں یاد رہیں گی اور انھیں کے سنسکار بنیں گے۔ لاتعداد افعال اور بے انتہا گیانوں کے ہوجانے پر بھی آخر کو من کے پاس بہت تھوڑی بچت رہ جاتی ہے۔ وہ مختلف کرم اور گیان آئے اور اپنا کام کرکے مر گئے۔ ان سب کرموں کے پانچ، دس مضبوط مستقل سنسکار ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ سنسکار ہی ہماری پونجی ہیں۔ ہم زندگی کے بیوپار میں صرف سنسکار ہی کی دولت جمع کرتے ہیں۔ جیسے بیوپاری دن کی، مہینے کی، سال بھر کی آمدنی و خرچ کا حساب کرکے آخر میں نفع و نقصان کی ایک ہی رقم نکالتا ہے، اسی طرح زندگی کا حال ہوتا ہے۔

بہت سے سنسکاروں کا جمع خرچ ہوتے ہوتے آخر میں ایک نہایت ٹھوس، محدود نچوڑ جیسی چیز باقی بچ جاتی ہے۔ جب موت کی گھڑی آتی ہے، تو آتما (روح) زندگی کی آخری ریکارڈ باتیں یاد کرنے لگتی ہے۔ جنم بھر میں کیا کیا کیا، اسکی جب انسان یاد کرتا ہے، تو ساری کمائی کی شکل میں دو چار باتیں ہی نظر آتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ سب کرم اور گیان بے کار چلے گئے۔ ان کا کام پورا ہو گیا۔ ہزاروں اکھاڑ پچھاڑ کے بعد آخر میں کل پانچ ہزار کا نقصان یا دس ہزار کا نفع اتنا ہی نتیجہ بیوپاری کے ہاتھ لگتا ہے۔ فائدہ رہا تو دل اچھلنے لگتا ہے، نقصان ہوا تو چھاتی بیٹھ جاتی ہے۔

ہمارا بھی یہی حال ہے، مرنے کے وقت اگر کھانے کی ہوس دامنگیر ہوئی، تو یہ ثابت ہوگا کہ ساری زندگی کھانے کا ذائقہ لینے کی ہی کوشش کرتے رہے۔ کھانے یا ذائقہ کی ہوس ہی زندگی بھر کی کمائی ہے۔ کسی ماں کو مرتے وقت اگر بیٹے کی یاد آگئی، تو ماننا پڑے گا کہ اس کی ممتا کا سنسکار ہی مضبوط ہے۔ باقی جو بے شمار کرم کئے، وہ دوسرے درجے کے ہو گئے۔ علم حساب میں کسر کے سوال ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے اعداد ہوتے ہیں، لیکن مختصر کرتے کرتے آخیر میں ایک یا مختصر جواب آتا ہے۔ اسی طرح زندگی میں بے شمار سنسکاروں کی تعداد مٹ کر آخر میں ایک قومی سنسکار رہی نچوڑ کی طرح رہ جاتا ہے۔ استفسارِ زیست کا وہ جواب ہوتا ہے۔ آخر وقت کا سنسکار ہی زندگی کا انجام ہوتا ہے۔

زندگی کا یہ آخری نچوڑ میٹھا نکلے، آخر کی یہ گھڑی شیریں ہو، اسی نظریہ سے ساری زندگی کی تمام کوششیں ہونی چاہئیں۔ جسکا انجام شیریں، اسکا سب کچھ شیریں۔ اس آخری جواب پر دھیان رکھ کر ساری زندگی کا سوال حل کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کو مد نظر رکھ کر ساری زندگی کو ترتیب دو۔ جب کوئی سوال

حل کرتے ہو، تو جو خاص سوال پوچھا گیا ہے، اسی کو سامنے رکھ کر جواب دیتے ہو۔ اسی طرح کی روش سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس لئے مرتے وقت جن سنسکاروں کے قوی رکھنے کی خواہش ہو، ان کے مطابق ساری زندگی کی روانی کا بندوبست کرنا چاہیئے۔ دن رات ان ہی کی طرف رجحان بنا رہنا چاہیئے۔

(۳۷) موت کی یاد

اس آٹھویں باب میں یہ اصول بتایا گیا ہے کہ جو خیال مرتے وقت زور دار رہتا ہے، وہی اگلے جنم میں قوی تر ثابت ہوتا ہے۔ اس زادِ راہ کو ساتھ لے کر جیو (روح) آگے سفر کے لئے نکلتا ہے۔ آج کے دن کی کمائی لے کر، نیند کے بعد ہم کل کا دن شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح اس زندگی کی جمع پونجی لے کر موت کی لمبی نیند کے بعد پھر ہمارا سفر شروع ہوتا ہے۔ اس زندگی کا جو آخر ہے، وہی اگلی زندگی کی شروعات ہے۔ اس لئے ہمیشہ موت کی یاد رکھ کر چلو۔

موت کی یاد رکھنے کی ضرورت اس لئے اور بھی ہے کہ موت کی ہولناکی کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس کا راستہ نکالا جا سکے۔ ایکناتھ مہاراج کا قصہ ہے۔ ایک شخص نے ان سے پوچھا: "مہاراج آپ کا جیون کتنا سیدھا سادہ، کتنا بے خطا ہے! ہمارا جیون ایسا کیوں نہیں؟ آپ کبھی کسی پر غصہ نہیں ہوتے، کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں، جھگڑا بکھیڑا نہیں، کتنا پُرسکون، کتنا مہر آمیز اور کتنا پاکیزہ ہے آپ کا مزاج۔" ایکناتھ نے کہا: "فی الحال میری بات تو رہنے دو، تمہارے بارے میں مجھے ایک بات معلوم ہوئی ہے۔ آج سے ساتویں دن تمہاری موت آ جائے گی۔" اب ایکناتھ کی کہی بات کو جھوٹ کون مانتا؟ سات دن میں موت! صرف ۱۶۸ گھنٹے ہی باقی رہے۔ ہے بھگوان! یہ کیسا اندھیر! وہ آدمی جلدی جلدی گھر دوڑا گیا۔ کچھ سوجھ نہیں پڑتا تھا۔ آخری وقت کی، سب کچھ سمیٹ لینے کی باتیں کر رہا

تھا۔ وہ بیمار ہو گیا۔ بستر پر پڑ گیا۔ چھ دِن ختم ہو گئے۔ ساتویں دِن ایکناتھ اس سے ملنے آئے۔ اس نے سلام کیا۔ ایکناتھ نے پوچھا "کیا حال ہے؟" اس نے کہا "بس اب چلا۔" ایکناتھ جی نے پوچھا "اِن چھ دنوں میں کتنا پاپ کیا؟ پاپ کے کتنے بِچار من میں آئے؟" وہ قریب المرگ بیمار بولا "ناتھ جی، پاپ کا خیال کرنے کی تو مطلق فرصت ہی نہیں ملی۔ موت ایک سی آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔" ایکناتھ جی نے کہا "ہمارا جیون اتنا بے خطا کیوں ہے، اس کا جواب اب مل گیا نا؟ موت کا تصویر ہر وقت سامنے کھڑا رہے، تو پھر پاپ سوجھے گا کیسے؟ پاپ کرنے کے لئے بھی بے فکری چاہیئے۔ موت کا ہمیشہ خیال رکھنا پاپ سے آزاد ہونے کی تدبیر ہے۔ اگر موت سامنے دکھائی دیتی رہے، تو پھر انسان کس بل پر پاپ کرے گا؟"

لیکن آدمی موت کی یاد کو ٹالتا رہتا ہے۔ پاسکل نامی ایک فرانسیسی فلاسفر ہوا ہے۔ اس کی کتاب "پانسے" ہے۔ "پانسے" کا مطلب ہے "بِچار"۔ اس نے اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے متفرق خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ کہتا ہے "موت سدا پیچھے کھڑی ہے، لیکن انسان کی یہ کوشش مسلسل جاری ہے کہ اسے بھولے کیسے؟ لیکن وہ یہ بات اپنے سامنے نہیں رکھتا کہ موت کو یاد رکھ کر کیسے چلیں؟" انسان کو موت کا لفظ تک برداشت نہیں ہوتا۔ کھاتے وقت اگر کسی نے موت کا نام لے لیا، تو کہتے ہیں "کیا منحوس بات منہ سے نکالتے ہو؟" لیکن اتنا ہوتے ہوئے بھی ہمارا ایک ایک قدم موت کی طرف جا رہا ہے۔ بمبئی کا ٹکٹ کٹا کر جب ایک بار ہم ریل گاڑی میں بیٹھ گئے، تو ہم بھلے ہی بیٹھے رہیں، لیکن گاڑی ہمیں بمبئی لے جا کر ضرور چھوڑے گی۔ جنم ہوتے ہی ہم نے موت کا ٹکٹ کٹا رکھا ہے۔ اب آپ بیٹھے رہیئے یا دوڑتے رہیئے۔ بیٹھے رہیں گے، تو بھی موت

آوئے گی، دوڑتے رہیں گے، تو بھی آئے گی۔ آپ موت کا خیال کریں یا نہ کریں، وہ آئے بغیر نہیں رہے گی۔ موت یقینی ہے، دیگر امور بھلے ہی غیر یقینی ہوں۔ سمجھ ڈوبنے کو ہو اکہ ہماری عمر کا ایک حصہ کھا گیا۔

زندگی کے حصے یوں کٹتے جارہے ہیں، زندگی چھیج رہی ہے۔ ایک ایک قطرہ کر کے گھٹ رہی ہے، تو بھی انسان کو اس کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ گیانیشور کہتے ہیں "تعجب معلوم ہوتا ہے۔" یعنی گیان دیو کو تعجب ہے کہ انسان کیونکر اتنی بے فکری محسوس کرتا ہے۔ اسے موت کا اتنا خوف معلوم ہوتا ہے کہ اسے موت کا تخیل تک برداشت نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ اس کے خیال اور تصور سے بچنا چاہتا ہے۔ آنکھوں پر پردہ ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ لڑائی میں جانے والے سپاہی اس لئے کھیلتے، ناچتے، گاتے اور سگریٹ پیتے ہیں کہ موت کا خیال نہ آنے پائے۔ پاسکل کہتا ہے کہ "موت کو ہر جگہ سامنے موجود دیکھتے ہوئے بھی یہ تاجی، یہ سپاہی اسے بھولنے کے لئے کھانے پینے، رقص و سرود میں مست رہتا ہے۔"

ہم سب اس تاجی کی طرح ہیں۔ چہرے کو گول ہنس مکھ بنانے کی کوشش کرنا، سوکھا ہو تو تیل، پوڈر لگانا، بال سفید ہو گئے ہوں، تو خضاب لگانا وغیرہ تدبیریں انسان کرتا ہے۔ چھاتی پر موت ناچ رہی ہے، تاہم ہم تاجی کی طرح اسے بھولنے کی الٹی تدبیر کر رہے ہیں اور چاہے کچھ بھی باتیں کریں گے، پر کہیں گے کہ "موت کی بات مت نکالو۔" میٹرک پاس لڑکے سے پوچھو کہ "اب آگے کیا ارادہ ہے؟" تو کہتا ہے۔ "ابھی مت پوچھو، ابھی تو فرسٹ ایر میں ہوں۔" دوسرے سال پھر پوچھو گے، تو کہے گا۔ "پہلے انٹر تو ہو جانے دو، پھر دیکھیں گے۔" یہی سلسلہ چلتا ہے۔ جو آگے ہونے والا ہے، اس پر کیا پہلے سے نہیں سوچنا چاہیئے؟ اگلے قدم کے بارے میں پہلے ہی سے سوچ لینا چاہیئے، نہیں تو وہ کھڈے میں گر سکتا ہے۔ لیکن طالب علم

اس کو ٹالتا ہے۔ بیچارے کی تعلیم ہی تاریکی میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہے کہ اس پار کا مستقبل دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اس لئے "آگے کیا کرنا ہے" یہ سوال ہی وہ سامنے نہیں آنے دیتا، کیونکہ اسے چاروں طرف اندھیرا ہی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن مستقبل ٹالا نہیں جاسکتا۔ وہ تو سر پر آکر سوار ہو ہی جاتا ہے۔

کالج میں استاد منطق پڑھاتا ہے: "انسان فانی ہے۔ سقراط انسان ہے۔ اس لئے سقراط مرے گا۔" یہ منطق وہ سکھاتا ہے۔ وہ سقراط کی مثال دیتا ہے، خود اپنی مثال کیوں نہیں دیتا؟ استاد بھی فانی ہے۔ وہ یہ نہیں سکھائے گا کہ "سب انسان فانی ہیں اس لئے میں پروفیسر بھی فانی ہوں، اور تم شاگرد بھی فانی ہو۔" وہ اس موت کو سقراط پر ڈھکیل دیتا ہے، کیونکہ سقراط تو مر چکا ہے۔ وہ شکایت کرنے کے لئے حاضر نہیں ہے۔ شاگرد اور استاد دونوں موت کو سقراط کے سپرد کرکے اپنے لئے "تیری بھی چپ، میری بھی چپ" والی حرکت کرتے ہیں۔ گویا وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم بہت محفوظ ہیں۔

اس طرح موت کو بھولنے کی یہ کوشش سب جگہ جان بوجھ کر ہو رہی ہے۔ لیکن اس سے موت کہیں ٹل سکتی ہے؟ کل ماں مرگئی، تو موت سامنے آگئی۔ انسان بے خوف ہوکر موت کا خیال کرکے یہ ہمت ہی نہیں کرتا کہ اس میں سے راستہ کیسے نکالا جائے۔ کسی ہرن کا پیچھا ایک شیر کر رہا ہو، ہرن خوب چوکڑی بھرتا ہے، لیکن اس کی طاقت کم ہوجاتی ہے اور آخرکار وہ تھک جاتا ہے۔ پیچھے سے وہ شیر، موت کا فرشتہ دوڑتا ہی آرہا ہے۔ اس وقت اس ہرن کی کیا حالت ہوتی ہے؟ وہ اس شیر کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔ وہ مٹی میں سینگ اور منہ گھسیٹر کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ گویا الچا ہوکر کہتا ہے "لے اب آ اور مجھے ہڑپ جا۔" ہم موت کو اپنے سامنے نہیں دیکھ سکتے۔ اس سے بچنے کے لئے ہم ہزاروں ترکیبیں نکالیں، تو بھی اس موت کا ندر اتنا

ہوتا ہے کہ وہ آخر میں ہماری گردن دھر دباتی ہے۔

جب موت آتی ہے، تو آدمی اپنی زندگی کی وہ کڑ بائی دیکھتا ہے۔ امتحان میں بیٹھا ہوا سست طالب علم دوات میں قلم ڈبوتا ہے، باہر نکالتا ہی، لیکن سفید کاغذ کو کالا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ارے بھائی کچھ لکھوگے بھی یا نہیں؟ علم کی دیوی آکر تھوڑے ہی جواب لکھ جائے گی! تین گھنٹے ختم ہو جاتے ہیں، وہ کورا کاغذ دے دیتا ہے یا آخر میں کچھ نہ کچھ گھسیٹ کر دے آتا ہے۔ سوال کو حل کرنا ہے، جواب لکھنا ہے، یہ سوجھتا ہی نہیں! ادھر دیکھتا ہے، اُدھر دیکھتا ہے۔ ایسا ہی ہمارا حال ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم اس بات کو یاد رکھ کر زندگی کا ہرا موت کی طرف گیا ہوا ہے، آخری لمحہ کو انتہائی پاکیزہ اور شیریں بنانے کی مشق عمر بھر کرتے رہیں۔ آج سے ہی اس بات کی فکر کرتے رہنا چاہیئے کہ من پر اعلیٰ سے اعلیٰ اور حسین ترین سنسکار کیسے پڑیں۔ لیکن اچھے سنسکاروں کی عادت ڈالنے کی پڑی کسے ہے؟ اس کے برخلاف بُری باتوں کی مشق قدم قدم پر ہوتی رہتی ہے۔ زبان، آنکھ اور کان کو ہم بچپن سکھا رہے ہیں۔ من کو اس سے مختلف مشاغل میں لگانا چاہیئے اچھی باتوں کی طرف من لگنا چاہیئے۔ ان میں اسے رنگ دینا چاہیئے۔ جس لمحہ اپنی بھول معلوم ہو جائے، اسی گھڑی سے اسے سُدھارنے میں جُٹ جانا چاہیئے۔ بھول معلوم ہو جانے پر بھی کیا اسی طرح کرتے رہیں گے؟

جس لمحہ ہمیں اپنی بھول معلوم ہوئی، اسی لمحہ ہماری دوبارہ نئی پیدائش ہوئی۔ اسے اپنا بچپن، اپنی زندگی کی نئی صبح سمجھو۔ اب تم سچ مچ بیدار ہوئے ہو۔ اب دن رات اعمال زندگی کی جانچ پڑتال کرتے رہو۔ اور خبردار رہو۔ ایسا نہ کروگے، تو پھر پھسلوگے، پھر بُری باتوں کی مشق شروع ہو جائے گی۔

بہت سال گذرے کہ میں اپنی دادی سے ملنے گیا۔ وہ بہت بوڑھی ہوگئی

تھیں۔ مجھ سے کہتیں۔ "دنیا اب مجھے یاد نہیں رہتا۔ گھی کی دوہنی لینے جاتی ہوں اور ویسے ہی لوٹ آتی ہوں"۔ لیکن وہ پچاس سال پہلے کے زیورات کی ایک بات مجھ سے کہا کرتیں۔ پانچ منٹ پہلے کی بات یاد نہیں رہتی مگر پچاس سال پہلے کے قوی سنسکار آخر تک جگمگا رہے تھے۔ اس کا سبب کیا؟ وہ زیورات والی بات انھوں نے ہر ایک سے کہی ہوگی۔ اس بات کا ہمیشہ ذکر ہوتا رہا، اس لئے وہ زندگی سے چپک کر ملجھ گئی۔ زندگی کے ساتھ ہم رنگ ہو گئی۔ میں نے من میں کہا "بھگوان کرے دادی کو مرتے وقت ان زیورات کی یاد نہ آئے۔"

(۴۸) ہمیشہ اسی میں رنگے رہو

جس بات کی ہم دن رات مشق کرتے ہیں، وہ ہم سے کیوں نہ چپکی رہے گی؟ اجامل کی کہانی پڑھ کر غلط فہمی میں نہ پڑ جائیے۔ وہ اوپر سے پاپی تھا لیکن اس کے باطنی چت میں نیکی کی دھار بہہ رہی تھی۔ وہ لقوی آخری لمحہ میں جاگ اٹھا ہمیشہ پاپ کر کے آخر میں بھگوان کا تصور ضرور ہی آجائے گا، اس دھوکے میں مت رہ جانا۔ بچپن سے ہی طبیعت لگا کر عادت ڈالو۔ ایسی احتیاط رکھو کہ ہمیشہ اچھے ہی سنسکار جمع ہوتے رہیں۔ ایسا نہ کہو کہ اِس سے کیا ہوگا اور اس سے کیا ہوگا؟ چار بجے ہی کیوں اٹھیں؟ سات بجے اُٹھیں تو اس سے کیا بگڑا؟ ایسا کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر من کو برابر ایسی آزادی دیتے چلے گئے، تو آخر میں پھنس جاؤ گے۔ پھر اچھے سنسکار منقش نہیں ہونے پائیں گے۔ ایک ایک پیسہ جمع کرنے سے دولت جمع ہوتی ہے۔ ایک ایک لمحہ کو رائیگاں ہونے سے بچا کر حصولِ علم میں لگانا پڑتا ہے۔ اس بات کا دھیان رکھو کہ کیا ہر لمحہ اچھا ہی سنسکار پڑ رہا ہے؟ خراب بات کہی کہ اسی وقت بُرا سنسکار پڑا۔ ہمارا ہر ایک فعل چھینی بن کر ہماری زندگی کے پتھر کو گڑھ رہا ہے۔ دن اچھی طرح بیت گیا، تو بھی خواب میں بُرے خیالات آجاتے ہیں۔ دس پانچ دن کے

ہی خیال خواب میں آتے ہوں، ایسی بات نہیں ہے۔ کتنے ہی بُرے سنسکار غفلت کی وجہ سے پڑ جاتے ہیں۔ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کب جاگ پڑیں گے۔ اس لئے چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی چوکنا رہنا چاہیئے۔ ڈوبتے کو تنکے کا بھی سہارا ہو جاتا ہے ہم سنسار کے سمندر میں ڈوب رہے ہیں۔ اگر ہم تھوڑا بھی اچھا بولیں، تو وہ بھی ہمارے لئے سہارا بن جاتا ہے۔ نیک عمل رائیگاں نہیں جاتا۔ وہ تم کو نجات دلائے گا۔ ذرّہ برابر بھی بُرے سنسکار نہ ہونے چاہئیں۔ ہمیشہ ایسی کوشش کرو، جس سے آنکھیں پاکیزہ بنی رہیں، کان بُری بات نہ سنیں، منہ سے اچھی بات نکلے۔ اگر ایسی احتیاط برتو گے، تو آخری وقت صحیح پانسہ پڑے گا اور ہم اپنی موت اور جیتا کے مالک ہو جائیں گے۔ پاک تاثرات ڈالنے کے لئے اعلیٰ خیالات من میں دوڑاتے رہنا چاہیئے۔ ہاتھ پاکیزہ افعال میں مصروف رہیں۔ اندر سے خدا کی یاد، باہر سے اپنے فرض کی ادائیگی، ہاتھوں سے خدمت گذاری کے افعال اور من میں وِکرم۔ ایسا روزانہ کرتے رہنا چاہیئے۔

گاندھی جی کو دیکھو، روزانہ چرخا چلاتے ہیں۔ وہ روزانہ کاتنے پر زور دیتے ہیں۔ ہر روز کیوں کاتیں؟ کپڑے کے لئے کبھی کبھی کات لیا کریں، تو کیا کام نہیں چلے گا؟ لیکن یہ تو ہوا بیوپار، روز کاتنے میں روحانیت ہے۔ دیس کیلئے بھی مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہے، اس میں یہی جذبہ ہے۔ وہ سوت ہمیں روز روز نا واردیتے جوڑتا ہے اور وہ سنسکار مضبوط ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نے روز۔ دوا پینے کے لئے کہا، پھر ہم ساری دوا ایک ہی روز پی لیں تو؟ وہ بے تکی بات ہو جائے گی۔ دوا کا مقصد اس سے حاصل نہ ہو گا۔ دوا کا سنسکار روز روز پڑ کر جسمانی خرابی کو دور کر دیتا ہے۔ ایسی ہی بات زندگی کی ہے۔ شنکر پر دھیرے دھیرے پانی چڑھانا پڑتا ہے۔ یہ تمثیل مجھے عزیز ہے۔ بچپن میں میں روز اس کام کو دیکھتا تھا۔ چوبیس گھنٹے ملا کر بہت ہوا تو وہ پانی بالٹی دو بالٹی ہوتا ہوگا۔ لیکن ایک ساتھ ہی دو بالٹی پانی شیو جی پر کیوں نہ انڈیل دیا جائے؟ اس کا جواب بچپن ہی میں

مجھے مل گیا۔ پانی انڈیل دینے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ ایک ایک بوند گرنا ہی پڑ جاتا ہے۔ ایک سی سنسکار کی مسلسل دھار بہنی ہی چاہیئے! جو سنسکار صبح کو، وہی دوپہر کو، وہی شام کو، وہی دِن میں، وہی رات میں، وہی کل، وہی آج اور جو آج وہی کل، جو اِس سال وہی اگلے سال، جو اس جنم میں وہی اگلے جنم میں، جو زندگی میں وہی آخری وقت میں، ایسی ایک ایک نیک سنسکار کی پاکیزہ دھار ساری زندگی میں ہمیشہ بہتی رہنی چاہیئے۔ ایسی روانی مسلسل جاری رہے گی، تب ہی ہم آخر میں جیت سکیں گے اور منزل پر جا کر اپنا جھنڈا گاڑ سکیں گے۔ سنسکار کی روانی ایک ہی سمت میں رہنی چاہیئے۔ پہاڑ پر گرا ہوا پانی اگر بارہ سمت میں بہہ نکلا، تو اس سے ندی نہیں بن سکتی۔ اس کے برعکس اگر سارا پانی ایک ہی سمت میں بہے گا، تو وہ چشمہ سے دھار، دھار سے ندی، ندی سے گنگا بن کر سمندر تک جا پہنچے گا۔ جو پانی ایک ہی سمت بہا وہ جا کر سمندر میں ملے گا۔ لیکن جو پانی چاروں سمت بہا، وہ یوں ہی سوکھ جائے گا۔ یہی بات سنسکاروں کی ہے۔ سنسکار اگر آتے گئے اور مٹتے گئے، تو کیا فائدہ؟ اگر زندگی میں سنسکار کی پاکیزہ روانی مسلسل جاری رہی تبھی آخر میں موت کی تلخی خوشگواری سے بدل جائے گی۔ جو مسافر راستہ میں زیادہ نہ رُکتے ہوئے، راستہ کے موہ مایا سے بچتے ہوئے، قدم جما جما کر مشکل چڑھائی چڑھتے ہوئے، چوٹی تک پہنچ گیا اور اوپر پہنچ کر چھاتی کے سارے بوجھ اور بندھن ہٹا کر وہاں کی کھلی ہوا کا احساس کرنے لگا، اس کے لطف کا اندازہ کیا دوسرے لوگ لگا سکیں گے؟ مگر جو مسافر راستہ ہی میں اٹک گیا، اس کے لئے سورج کہیں رُکتا ہے؟

(۳۹) شب و روز جنگ آزمائی

خلاصہ یہ کہ باہر سے ہمیشہ ادائیگی فرض اور اندر سے صفائی قلب کے لئے بھگوان کی یاد رکھنا چاہیئے۔ اس طرح جب یہ اندرونی و بیرونی کرم، وکرم سے

سلسلے جاری رہیں گے، تب موت مسرّت انگیز معلوم ہوگی۔ اسی لئے بھگوان کہتے ہیں ــ "ہمیشہ میری یاد کرو اور لڑتے رہو" ۔ اسی میں ہمیشہ رنگا رہ۔" سدا الشور میں ڈوبے رہو۔ بھگوان کی الفت سے جب اندر باہر رنگ جاؤگے، جب وہ رنگ ساری زندگی میں پھیل جائے گا، تب ہی پاکیزہ باتوں میں لذت محسوس ہونے لگے گا۔ تب بُرے رجحانات سامنے آکر کھڑے ہی نہ رہیں گے۔ سُندر اور بڑھیا خواہشات کی کونپلیں من میں پھوٹنے لگیں گی۔ اچھے افعال خود بخود ہونے لگیں گے۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ بھگوان کی یاد سے اچھے کام بہ آسانی ہونے لگیں گے، لیکن بھگوان کا یہ بھی حکم ہے کہ "ہمیشہ لڑتے رہو" تُکارام مہاراج کہتے ہیں ــــ "رات اور دن، اندر اور باہر، دل کے اندر اور دُنیا میں ہم جنگ کر رہے ہیں۔"

اندر اور باہر ہم کو بے انتہا سنسار گھیرے ہوئے ہے۔ اِس سنسار سے مَن کا ہمیشہ جھگڑا جاری رہتا ہے۔ اس جھگڑے میں ہمیشہ فتح ہی ہوگی، یہ نہیں کہہ سکتے جو انجام کو حاصل کرے گا، وہی سچا فاتح ہوگا۔ آخر میں جو فیصلہ ہو وہی صحیح۔ کئی بار کامیابی ملے گی، تو کئی بار ناکامی۔ ناکامی ملی، تو ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پتھر پر اُنیس بار چوٹ لگنے سے وہ نہیں ٹوٹتا اور بیسویں بار چوٹ سے ٹوٹ گیا، تو کیا وہ اُنیس چوٹیں فضول ہی گئیں؟ اس بیسویں چوٹ کی کامیابی کی تیاری وہ انیس چوٹیں کر رہی تھیں۔

مایوس ہونے کا مطلب ہی، خدا سے منکر ہونا۔ بھروسہ رکھو کہ پرمیشور ہمارا محافظ ہے۔ بچے کی ہمت بڑھانے کے لئے ماں اُسے اِدھر اُدھر جانے دیتی ہے، لیکن وہ اسے گرنے نہیں دیتی۔ جہاں گرنے لگا کہ جھٹ آکر دھیرے سے سہارا دے دیتی ہے۔ ایشور بھی تم پر ہمیشہ نگاہ رکھتا ہے۔ تمہاری زندگی کی پتنگ کی ڈور بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ کبھی وہ ڈور کھینچ لیتا ہے اور کبھی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن یہ

یقین رکھو کہ ڈور ہے اسی کے ہاتھ میں. گنگا کے گھاٹ پر تیرنا سکھاتے ہیں۔ گھاٹ پر کے پیڑ میں زنجیر یا ڈوری بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ اسے کمر میں باندھ کر آدمی کو پانی میں پھینک دیتے ہیں. لیکن سکھانے والے استاد بھی پانی میں رہتے ہی ہیں۔ وہ نو سکھیا پہلے تو دو چار بار ڈوبتا اُبھرتا ہے، لیکن آخر میں وہ تیرنے کا فن سیکھ جاتا ہے۔ اسی طرح ایشور ہمیں زندگی کا فن سکھا رہا ہے۔

(۴۰) روشن اور تاریک راہ

اس لئے خدا پر یقین رکھ کر اگر قول و عمل اور من سے دن رات لڑتے رہو گے تو، آخر کی گھڑی انتہائی اچھی ہوگی۔ اس وقت سب دیوتا موافق ہو جائیں گے۔ یہی بات اس باب کے آخر میں ایک تمثیل کے ذریعہ بتائی گئی ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ جس کی موت کے وقت آگ روشن ہو، سورج چمک رہا ہو، اجالے پاکھ کا چاند بڑھ رہا ہو، اُترائن میں خوب صورت اور صاف آسمان پھیلا ہوا ہو، وہ واصلِ خدا ہو جاتا ہے اور جس کی موت کے وقت دھواں پھیل رہا ہو، اندر باہر اندھیرا ہو رہا ہو، کرشن پکش کا چاند دھیرے دھیرے گھٹ رہا ہو، دکشنائن میں میلا اور بادلوں سے بھرا آکاش پھیلا ہوا ہو، تو وہ پھر آواگون کے چکر میں پڑے گا۔ بہت سے لوگ اس تمثیل کو پڑھ کر چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ اگر یہ چاہتے ہو کہ پاک موت ہو، تو آگ، سورج، چاند، آکاش ان دیوتاؤں کی مہربانی درکار ہے۔ آگ عمل کی علامت ہے، یگیہ کی علامت ہے۔ آخری وقت میں بھی یگیہ کا شعلہ جلتا رہنا چاہیئے۔ جسٹس راناڈے کہتے تھے ــــ "مسلسل فرض گذاری کرتے ہوئے اگر موت آجائے، تو وہ قابلِ تحسین ہے۔ کچھ نہ کچھ پڑھ رہے ہیں، لکھ رہے ہیں، کوئی کام کر رہے ہیں، ایسی حالت میں مروں، تو کامیاب ہوں۔" "آگ جل رہی ہے" اس کا یہ مطلب ہے، مرتے وقت بھی کام کرتے رہیں، یہ اگنی کا فیض ہوا۔

سورج کی مہربانی کا مطلب یہ ہے کہ عقل کی روشنی چمکتی رہنی چاہیئے۔ چاند کی مہربانی کا مطلب ہے کہ موت کے وقت پاکیزہ خیال ہمیشہ بڑھتا رہنا چاہیئے۔ چاند مَن کا تصورات کا دیوتا ہے۔ اُجالے پاکھ کے چاند کی طرح، دِل کی عقیدت، پریم، حوصلہ، خدمتِ خلق، رحم وغیرہ پاک جذبات کی پوری ترقی ہونی چاہیئے۔ آکاش کی مہربانی سے مطلب ہے کہ دِل کے آکاش میں موہ کے بادل بالکل نہ رہنے چاہئیں۔

ایک بار گاندھی جی نے کہا "میں دن رات چرخا چرخا چلاّ رہا ہوں۔ چرخے کو بڑی پاکیزہ چیز مانتا ہوں۔ لیکن آخری وقت میں اسکی بھی خواہش نہ رہنی چاہیئے۔ جس نے مجھے چرخے کی سوجھ دی، وہ خود چرخے کی فکر کر سکتا ہے۔ چرخا اب دوسرے بھلے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ چرخے کی فکر چھوڑ کر مجھے پرماتما سے ملنے کی تیاری کرنی چاہیئے۔" مطلب یہ کہ اترائن کا مفہوم ہے، دِل میں موہ کے بادل نہ رہنا۔

آخری دم تک ہاتھ سے کوئی نہ کوئی خدمت کا کام ہو رہا ہے، نیک جذبات کا ماہِ کامل چمک رہا ہے، دِل کے آکاش میں ذرا بھی الفتِ دنیاوی نہیں ہے، عقل تیز ہے، اس طرح جس کی موت ہوگی، وہ پرماتما میں جا ملیگا۔ ایسا اعلیٰ اور پُرسکون انجام حاصل کرنے کے لیۓ رات دِن ہوشیار اور چوکنّا رہ کر لڑتے رہنا چاہیئے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی قلب پر بُرے سنسکار نہ پڑنے دیجیئے۔ اس کے لئے خدا سے ہمیشہ دعا کرتے رہنا چاہیئے کہ وہ ہم کو اس کی طاقت عطا کرتا رہے اور اس کے نام و حقیقت کی یاد آوری بار بار ہوتی رہنی چاہیئے۔

اتوار ۱۰-۴-۳۲

نواں باب

انسانیت کی خدمت: سمرپن یوگ

(۴۱) بلا واسطہ تجربہ کا فن

آج میرے گلے میں درد ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ میری آواز آپ تک پہنچ سکے گی یا نہیں۔ مجھے اس وقت سادھو صفت بڑے مادھوراؤ پیشوا کے آخری وقت کی بات یاد آرہی ہے۔ وہ مردِ خدا بسترِ مرگ پر پڑا ہوا تھا۔ کف بہت بڑھ گیا تھا۔ کف کا اسہال کے ذریعہ تنقیہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے مادھوراؤ نے معالج سے کہا: "کوئی ایسی تجویز کیجیے، جس سے میرا کف ہٹ جائے اور اس کی جگہ دست آنے لگیں۔ اس سے منھ کھل جائے گا اور میں رام نام لے سکوں گا۔" میں بھی آج پرمیشور سے دعا کر رہا تھا۔ بھگوان نے کہا۔ "جیسا گلا ہو، ویسا ہی بولنا رہ۔" میں جو یہاں گیتا سُنا رہا ہوں، وہ کسی اُپدیش دینے کے لئے نہیں۔ جو اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، انھیں اس سے ضرور فائدہ ہوگا؛ لیکن میں تو گیتا رام نام سمجھ کر سُنا رہا ہوں۔ گیتا کی تشریح کرتے وقت میرا تصور "ہری نام" یعنی اسم ذات کا رہتا ہے۔

میں جو یہ کہہ رہا ہوں، اس کا آج کے نویں باب سے تعلق ہے۔ اس باب میں ہری نام کی انوکھی عظمت بتائی گئی ہے۔ یہ باب گیتا کے وسطی حصہ میں قائم ہے۔ سارے مہابھارت کے وسط میں گیتا اور گیتا کے وسط میں یہ نواں

باب ہے! مختلف وجوہ سے اس باب کو پاکیزگی حاصل ہوگئی ہے۔ کہتے ہیں، جب گیان دیو نے آخری سمادھی لی، تو انھوں نے اس باب کا جپ کرتے ہوئے پران چھوڑا تھا۔ اس باب کی محض یاد سے میری آنکھیں ڈبڈبانے لگتی ہیں اور دل بھر آتا ہے۔ ویاس دیو کا یہ کتنا بڑا احسان ہے! تنہا ہندستان پر ہی نہیں، بلکہ ساری انسانیت پر ان کا یہ احسان ہے۔ جو انوکھی بات بھگوان نے ارجن کو بتائی، وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن رحم کے جذبے سے متاثر ہو کر ویاس جی نے اس کو سنسکرت زبان کے ذریعہ ظاہر کر دیا۔ اس پوشیدہ راز کو لفظ و معنیٰ کا جامہ پہنا دیا۔ اس باب کے شروع ہی میں بھگوان کہتے ہیں۔

"یہ بہت بڑا راز ہے، یہ عظیم ترین اور پاکیزہ فن ہے۔"

یہ جو عظیم ترین فن ہے، یہ جو ایک انوکھی شئے ہے، وہ براہِ راست تجربہ کرنے کی ہے۔ بھگوان اسے "براہِ راست تجربہ میں لانے کے قابل" کہتے ہیں۔ الفاظ میں نہ سمانے والی، لیکن براہِ راست تجربہ کی کسوٹی پر کسی ہوئی یہ بات اس باب میں بتائی گئی ہے۔ اس سے یہ باب بہت حسین بن گیا ہے۔ تلسی داس نے کہا ہے ؎

"کو جانے کو جیئے جم پُر، کو سُر پُر دھام کو ؛ تلسی ہی بہت بھلو لاگت، جگ جیون رام گلام کو"

مرنے کے بعد ملنے والی بہشت اور اس کے قصوں سے یہاں کیا کام چلے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بہشت میں کون جاتا ہے اور جم پُر کون جاتا ہے؟ اگر دنیا میں چار دن رہنا ہے، تو رام کا غلام بن کر رہنے ہی میں مجھے آنند ہے، ایسی بات تلسی داس جی کہتے ہیں۔ رام کا غلام ہو کر رہنے کا مزہ اس باب میں ہے۔ براہِ راست اس جسم میں انھیں آنکھوں سے تجربہ کیا جانے والا پھل، جیتے جی تجربہ کی جانے والی باتیں، اس باب میں بتائی گئی ہیں۔ جب گُڑ کھاتے ہیں، تو

اس کی مٹھاس براہِ راست معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح رام کا غلام ہوکر رہنے کا مزہ یہاں پر ہے۔ اس عالمِ فانی کی زندگی کا مزہ واضح طور پر دکھانے والی عظیم ترکیب کا ہی ذکر اس باب میں ہے۔ وہ ویسے ایک رازِ پنہاں ہے، مگر بھگوان نے اسے سب کے لئے آسان اور واضح طور پر کھول کر رکھ دیا ہے۔

(۴۲) آسان راہ

گیتا ویدک دھرم کا نچوڑ ہے۔ ویدک دھرم کا مطلب ہے، ویدوں سے نکلا ہوا دھرم۔ اس دُنیا میں جتنی قدیم ترین تصنیفات ہیں، ان میں وید سب سے پُرانی تصنیف مانی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے عقیدت مند لوگ انھیں اناد ی۔۔ غیر مخلوق۔۔ مانتے ہیں۔ اسی سے وید لائقِ تعظیم ہیں۔ تاریخ کی نگاہ سے اگر دیکھا جائے، تو بھی وہ ہمارے سماج کے قدیم جذبات کی قدیم ترین علامتیں ہیں۔ تانبے کی تختیوں، پتھروں کے کتبوں، سکّوں، برتنوں اور جانداروں کے پنجروں وغیرہ سے بھی یہ تحریری وسیلے زیادہ اہم ہیں۔ سنسار میں پہلا تاریخی ثبوت اگر کوئی ہے، تو وہ وید ہی۔ ان ویدوں میں جو دھرم بیج کے روپ میں تھا، وہ پیڑ ہوتے ہوتے آخر میں اس میں گیتا کا شیریں اور ملکوتی ثمر لگا۔ پھل کے سوا پیڑ سے ہم کھائیں بھی کیا؟ جب پیڑ میں پھل لگتے ہیں، تب ہی ہمارے کھانے کی چیز اس میں مل سکتی ہے۔ ویدک دھرم کے خلاصہ کا بھی نچوڑ یہ گیتا ہے۔

یہ جو ویدک دھرم زمانہ قدیم سے چلا آرہا تھا، اس میں مختلف یگیہ، ہون، پوجا پاٹھ، عبادت، ریاضت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ جو سارے معمولات ہیں، اگرچہ وہ بیکار نہیں ہیں، تو بھی ان کے لئے استعداد کی ضرورت ہے۔ یہ سب کے لئے آسان نہ تھا۔ اونچے ناریل کے پیڑ پر چڑھ کر پھل کون توڑے؟ کون چھیلے اور کون پھوڑے؟ میں چاہے کتنا ہی بھوکا ہوں، لیکن اونچے پیڑ کا وہ ناریل مجھے ملے کیسے؟ میں نیچے سے

اس کی طرف دیکھتا ہوں، اوپر سے ناریل مجھے دیکھتا ہے۔ لیکن اس سے پیٹ کی آگ کیسے بجھے گی؟ جب تک وہ ناریل میرے ہاتھ نہ پڑے، تب تک سب فضول ہے۔ ویدوں کے ان معمولات میں بڑے باریک خیالات رہتے تھے۔ عوام کو ان کا گیان کیسے ہو؟ ویدک راہ کے سوا موکش (نجات) نہیں۔ لیکن ویدوں کی ہم میں اہلیت نہیں۔ تب دوسروں کا کام کیسے چلے؟ اس لئے مہربان سنت لوگ آگے بڑھے اور بولے۔ "آؤ ہم ان ویدوں کا رس نکال لیں۔ ویدوں کا مغز تھوڑے میں نکال کر سنسار کو دیں۔" اس لئے تکارام مہاراج کہتے ہیں ہے

"ویدوں نے بہت سی باتیں کہی ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف اتنا ہی نچوڑ ہے۔"

وہ مغز کیا ہے؟ بیشک "ہری نام" ہری نام ویدوں کا نچوڑ ہے۔ "رام نام" سے موکش یقینی ہے۔ عورتیں، بچے، شودر، ویش، گنوار، غریب، ناتواں، مریض، لنگڑے، لولے، سب کے لئے موکش آسان ہوگیا۔ ویدوں کی الماری میں بند موکش کو بھگوان نے چوراہے پر لاکر رکھ دیا ہے۔ موکش کی یہ کتنی سیدھی سادی اور آسان ترکیب ہے! جس کی جیسی سیدھی سادی زندگی ہے، جو کچھ سودھرم کرم ہے، سیوا کرم ہے، اسی کو یگیہ کی شکل کیوں بنا دیں؟ پھر دوسرے یگ وغیرہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمہارا روز مرہ کا جو سیدھا سادہ سیوا کا کام ہے، اسی کو یگیہ سمجھ کر کرو، یہی شاہراہ ہے۔

اس راستہ سے اگر آنکھیں بند کر کے دوڑتے چلے جاؤ گے، تو بھی گرنے یا ٹھوکر کھانے کا خوف نہیں۔ دوسرا راستہ ہے ـــــ تلوار کی دھار بھی شائد کسی قدر موٹی ہوگی ـــــ لیکن یہ ویدک طریقہ بے حد مشکل ہے۔ اس کی بہ نسبت رام کا غلام ہو کر رہنے کا طریقہ زیادہ آسان ہے۔ انجینیئر راستہ کی اونچائی دھیرے دھیرے بڑھاتا ہوا اوپر لے جاتا ہے اور ہمیں اونچی چوٹی پر لا بٹھاتا

ہے۔ ہمیں لیکایک پتہ بھی نہیں لگتا کہ اتنے اونچے چڑھ رہے ہیں۔ انجینیر کی اس خوبی کی طرح ہی اس شاہراہ کی خوبی ہے۔ آدمی جس جگہ کرم کرتے ہوئے کھڑا ہے، وہیں اس سادہ کرم کے ذریعہ وہ خدا کو پا سکتا ہے ـــ ایسا ہی یہ راستہ ہے۔

بھگوان کیا کہیں چھپ کر بیٹھا ہے؟ کیا وہ کسی کھوہ میں، گنگا میں، ندی میں یا کسی بہشت میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے؟ لعل، نیلم، چاندی، سونا، زمین کے پیٹ میں چھپے رہتے ہیں۔ موتی مونگا سمندر میں چھپے رہتے ہیں۔ اسی طرح کیا وہ پرمیشور کہیں چھپا ہوا ہے؟ بھگوان کو کہیں سے کھود کر توڑ کے ہی باہر نکالنا ہے؟ وہ تو ہمیشہ ہم سب کے سامنے اور سب جگہ دائم و قائم ہے۔ یہ جتنے لوگ ہیں، پرماتما کی ہی مورتیاں ہیں۔ بھگوان کہتے ہیں ـــ" اس انسان کی شکل میں ظاہری ایشور کی مورت کی توہین مت کرو بھائی۔" ایشور ہی سارے مخلوق کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کو تلاش کرنے کے لئے بناوٹی تدبیروں کی کیا ضرورت ہے؟ تدبیر بالکل سیدھی اور آسان ہے۔ تم جو سیوا کے کام کرو، ان سب کا واسطہ بھگوان سے جوڑ دو؛ بس کام بن گیا۔ تم رام کے غلام ہو جاؤ۔ وید کے وہ مشکل ترین راستے، وہ یگ اور ہون وغیرہ ہمیں موکش کی طرف لے جائیں گے۔ لیکن اس میں اہلیت اور نااہلیت کا جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ صرف اتنا ہی کرو کہ جو کچھ کرتے ہو، وہ بھگوان کی نذر کردو۔ اپنے ہر کام کا تعلق اس ایشور سے جوڑ دو۔ اس نویں باب کی یہی تعلیم ہے۔ اس لئے وہ بھگتوں کو بہت پیارا ہے۔

(۴۳) اہلیت کا بکھیڑا نہیں

کرشن کی ساری زندگی میں اس کا بچپن ہی بہت سندر ہے۔ بال کرشن کی ہی خاص عبادت کی جاتی ہے۔ وہ گوالوں کے بچوں کے ساتھ گائیں چرانے جاتا

ان کے ساتھ کھاتا پیتا اور ہنستا بولتا۔ اندر کی پوجا کرنے کیلئے جب گوال بال نکلے تو ان سے اس نے کہا۔ "اندر کو کس نے دیکھا ہے؟ اس نے ہم پر احسان بھی کیا کیا ہے؟ لیکن یہ گوبردھن پہاڑ ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے۔ یہاں گائیں چرتی ہیں۔ اس میں پانی کے سوتے نکلتے ہیں، اس لئے تم اسی کی پوجا کرو۔" ایسی باتیں وہ انھیں سکھایا کرتا۔ جن گوالوں میں کھیلا، جن گوپیوں میں ہنسا بولا، جن گائے بچھڑوں میں وہ گھل مل گیا، ان سب کے لئے اس نے موکش کا دروازہ کھول دیا۔ کرشن بھگوان نے اپنے تجربے سے یہ آسان راستہ بتایا ہے۔ بچپن میں اس کا کام گائے بچھڑے سے پڑا، بڑے ہونے پر گھوڑوں سے۔ مرلی کی آواز سنتے ہی گائیں خوش ہو جاتیں اور کرشن کے ہاتھ پھیرتے ہی گھوڑے پھر پھر لینے لگتے۔ وہ گائے، بچھڑے اور رتھ کے گھوڑے کرشن میں محو ہو جاتے تھے۔ جن کرپا زیادہ مانا گیا تھا، ان جانوروں کو بھی گویا موکش حاصل ہو جاتا تھا۔ موکش پر صرف انسان کا ہی حق نہیں، چوپایوں اور پرندوں کا بھی ہے؛ یہ بات شری کرشن نے صاف کر دی ہے۔ اپنی زندگی میں انھوں نے اس بات کا تجربہ کیا تھا۔

جو احساس بھگوان کو ہوا، وہی ویاس جی کو بھی ہوا۔ کرشن اور ویاس دونوں میں ہم آہنگی ہے ہی۔ دونوں کی زندگی کا نچوڑ بھی ایک ہی ہے۔ موکش نہ تو علم پر ہی موقوف ہے نہ کہ فن اعمال پر! اس کے لئے تو سیدھی سادھی بھگتی ہی کافی ہے۔ "میں میں" کہنے والے گیانی پیچھے پڑ گئے اور بھولی بھالی نیک فہم عورتیں ان سے آگے بڑھ گئیں۔ اگر من پاک ہو اور سیدھا بھولا اور پاکیزہ جذبہ ہو، تو پھر موکش مشکل نہیں ہے۔ مہابھارت میں "جنک سُلبھا سمواد" نامی ایک موضوع ہے۔ اس میں ویاس جی نے ایک معاملہ کا ذکر کیا ہے۔ جس میں راجا جنک گیان حاصل کرنے کیلئے ایک مرتبہ کہاں سے کہاں گئے ہیں آپ لوگ پہلے ہی بحث

کرتے رہیں کہ عورتوں کو ویدوں کے گیان کی اہلیت ہے یا نہیں، لیکن سُلبھا تو یہاں کھلم کھلا جنک راجہ کو برہم وِدیا (الٰہیات) سکھا رہی ہے۔ وہ ایک معمولی عورت، جنک کتنا بڑا شہنشاہ! کتنے ہی علوم سے بھرپور! مگر اس دانش ور جنک کے ہاتھ میں موکش نہیں تھا، اس لئے ویاس دیو جی نے اسے سلبھا کے قدموں میں گرنے کے لئے بھیجا ایسی ہی بات اُس تُلا دھار ویش کی ہے۔ جاجلی برہمن اس کے پاس گیان پانے کے لئے جاتا ہے۔ تُلا دھر کہتا ہے" ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھنے میں ہی میرا سارا گیان سمایا ہوا ہے۔" ویسی ہی کہانی بہلیا کی ہے۔ بہلیا تو قصائی تھا۔ جانوروں کو مار کر سماج کی سیوا کرتا تھا۔ ایک گھمنڈی عبادت گذار برہمن کو اس کے گرو نے اس بہلیا کے پاس جانے کو کہا۔ برہمن کو تعجب ہوا کہ یہ قصائی مجھے کیا سکھائے گا۔ وہ بہلیا کے یہاں گیا۔ قصائی کیا کر رہا تھا؟ گوشت کاٹ رہا تھا، دھو رہا تھا اور صاف کر کے اسے بیچنے کے لئے رکھ رہا تھا۔ اس نے برہمن سے کہا۔" دیکھو، میرا کام جتنا دھرم کے مطابق کیا جا سکتا ہے، اتنا میں کرتا ہوں۔ اپنی آتما جتنی اس کام میں انڈیلی جا سکتی ہے، اتنی انڈیل کر میں یہ کام کرتا ہوں اور اپنے ماں باپ کی خدمت کرتا ہوں۔" ایسے اس بہلئے کی شکل میں ویاس دیو نے قابلِ تقلید مورت کھڑی کی ہے۔

مہابھارت میں یہ جو عورت، ویش، شُدر وغیرہ کی کتھائیں آئی ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ سب پر یہ صاف صاف ظاہر ہو جائے کہ موکش کا دروازہ سب کے لئے کُھلا ہوا ہے۔ ان کتھاؤں کا خلاصہ اس نویں باب میں بتایا گیا ہے۔ ان کتھاؤں پر اس باب میں مہر لگائی گئی ہے۔ رام کا غلام ہو کر رہنے میں جو مزہ ہے، وہی بہلیا کے جیون میں ہے۔ سنت سیکارام اہنسک تھے، لیکن انھوں نے بڑے چاؤ سے یہ بیان کیا کہ سجن قصائی نے قصائی کا کام کر کے

موکش حاصل کیا۔ تکارام نے ایک جگہ پوچھا ہے ۔ "بھگوان! جانوروں کا قتل کرنے والے کی کیا حالت ہوگی؟" لیکن ۔

"سجن قصائی کے ساتھ گوشت بیچتا ہے۔" یہ مصرع لکھ کر انھوں نے کہا ہے کہ ــــ "بھگوان سجن قصائی کی مدد کرتے ہیں۔ رسی نیتا کی ہنڈی سکارنے والا، ایک ناتھ کے گھر پانی بھرنے والا۔ داماجی کے لئے بہار (چمار) بننے والا اور مہاراشٹر کی ہر دل عزیز خاتون جانا بائی کی کوٹنے پیسنے میں مدد کرنے والا بھگوان سجن قصائی کی بھی اتنی ہی محبت سے مدد کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے سب افعال کا تعلق پرمیشور سے جوڑنا چاہیئے۔ کرم اگر پاکیزہ اور عقیدت کے جذبات سے بھرا ہوا ہو، تو وہ یگیہ ہی ہے۔

(۴۴) عمل کا پھل بھگوان کی نذر

نویں باب میں یہی خاص بات کہی گئی ہے۔ اس میں کرم یوگ کو بھگتی یوگ سے خوبصورتی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ کرم یوگ کا مطلب ہے "کام تو کرنا، مگر پھل کو ترک کر دینا۔" کرم ایسی خوبی سے کرو کہ پھل کی خواہش من میں نہ آئے۔ یہ اخروٹ کے پیڑ لگانے جیسا ہے۔ اخروٹ کے پیڑ میں ۲۵ سال کے بعد پھل لگتے ہیں۔ اسے لگانے والے کو اپنی زندگی میں شائد ہی اس کے پھل چکھنے کو ملیں۔ پھر بھی پیڑ لگانا ہے اور اسے پریم سے پانی دینا ہے۔ کرم یوگ کا مطلب پیڑ لگانا مگر پھل کی خواہش نہ رکھنا۔ اور بھگتی یوگ کسے کہتے ہیں؟ پورے اعتقاد کے ساتھ ایشور کے ساتھ جڑ جانے کا مطلب ہے بھگتی یوگ۔ راج یوگ میں کرم یوگ اور بھگتی یوگ دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔ راج یوگ کی لوگوں نے مختلف تشریحات کی ہیں، لیکن میری تشریح راج یوگ کی مختصراً ایسی ہے۔ یعنی "کرم یوگ اور بھگتی یوگ کا شیریں ملاپ"۔ ہم کام تو کریں، لیکن پھل کو پھینکیں نہیں، بلکہ اسے بھگوان کی نذر کر دیں۔

جب یہ کہتے ہیں پھل پھینک دو، تو اس کا مطلب ہوتا ہے پھل سے پرہیز۔ مگر نذر کر دینے میں ایسا نہیں ہوتا۔ کتنا عمدہ انتظام ہے یہ! بہت مٹھاس ہے اس میں! پھل چھوڑنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پھل کوئی لے گا ہی نہیں، کوئی نہ کوئی اسے ضرور لے گا۔ کسی نہ کسی کو تو وہ ملے گا ہی۔ مگر یہ دلیل قائم ہو سکتی ہے کہ جو اس پھل کو پائے گا، وہ اس کا مستحق بھی ہے یا نہیں؟ کوئی بھکاری گھر آجاتا ہے تو ہم جھٹ کہتے ہیں ——— "تو موٹا تازہ ہے۔ بھیک مانگنا تجھے زیب نہیں دیتا، چلا جا۔" ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اُس کا بھیک مانگنا مناسب تھا کہ نہیں۔ بھکاری بیچارہ شرمندہ ہو کر چلا جاتا ہے۔ ہمارے دل میں اس کے لئے ہمدردی کی کمی ہے۔ پھر بھیک مانگنے والے کی اہلیت ہم کیسے متعین کریں گے؟ میں نے بچپن میں ایک بار اپنی ماں سے بھکاریوں کے متعلق ایسا ہی شک ظاہر کیا تھا۔ اس نے جو جواب دیا تھا، وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ——— "یہ بھکاری تو ہٹا کٹا دکھائی پڑتا ہے، اسے بھیک دینے سے اس کی بُری علّت اور کاہلی بڑھے گی۔" گیتا کا ایک اشلوک بھی میں نے اسے پڑھ کر سنایا۔ اس نے جواب دیا ——— "جو بھکاری آیا وہ پرمیشور ہی تھا۔ اب کرو اہلیت و نا اہلیت پر بحث۔ بھگوان کو کیا نا اہل کہو گے۔ اہلیت و نا اہلیت پر غور کرنے کا تمہیں اور مجھے کیا حق ہے؟ زیادہ غور کرنے کی مجھے ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ میرے لئے وہ بھگوان ہی ہے۔" ماں کے اس جواب کا کوئی معقول جواب مجھے آج تک نہیں سوجھا ہے۔

دوسروں کو کھانا کھلاتے وقت میں ان کے اہل و نا اہل ہونے پر غور کرتا ہوں، لیکن اپنے پیٹ میں روٹی ڈالتے وقت مجھے یہ خیال تک نہیں ہوتا کہ آیا مجھے بھی اس کا کوئی حق ہے یا نہیں؟ جو ہمارے دروازے پر آتا ہے، اسے بدتمیز بھکاری ہی کیوں سمجھا جاتا ہے؟ جسے ہم دیتے ہیں وہ بھگوان ہی ہے، ایسا کیوں نہ سمجھیں؟ راج یوگ کہتا ہے ——— "تمہارے کرم کا پھل کسی نہ کسی کو تو ملے گا ہی نا؟ تو اسے بھگوان کو

ہی دے ڈالو۔ اسی کی نذر کر دو"۔ راج یوگ اس نذر کا مناسب مقام تمہیں بتاتا ہے۔ یہ راج یوگ ترک ثمر کے لیے نہیں کہتا۔ اس میں سب کچھ بھگوان کی نذر کرنا ہے، اس لیے اہل و نا اہل کا بھی سوال حل ہو جاتا ہے۔ بھگوان کو جو دان دیا گیا ہے، وہ ہمیشہ پاکیزہ ہی ہے۔ تمہارے کرم میں اگر عیب بھی رہا ہو، تو اس کے ہاتھوں میں پڑتے ہی وہ پاک ہو جائے گا۔ ہم عیب دور کرنے کی چاہے کتنی ہی کوشش کریں، تاہم عیب باقی رہ جاتا ہے۔ پھر بھی جتنا پاک ہو کر ہم کام کر سکیں، کریں۔ عقل خدا کا عطیہ ہے — اس کو پاک و صاف طریقہ سے استعمال کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا نہ کرنا سراسر قصور ہوگا۔ اس لیے اہل و نا اہل کی تمیز بھی کرنی ہی چاہیئے، مگر رضائے الٰہی پر چھوڑ دینے سے وہ آسان ہو جاتا ہے۔

پھل کو صفائی قلب کے کام میں لانا چاہیئے۔ جو کام جیسا ہو جائے، ویسا ہی اسے بھگوان کی نذر کر دو۔ افعال جیسے جیسے ہوتے جائیں، ویسے ہی ویسے انھیں بھگوان کی نذر کر کے اطمینان قلب حاصل کرتے رہنا چاہیئے۔ پھل کو چھوڑنا نہیں ہے۔ اسے بھگوان کی نذر کر دینا ہے۔ یہ تو کیا من میں پیدا ہونے والی خواہشات اور نفسانیت و غصہ وغیرہ برائیاں بھی پرمیشور کی نذر کر کے چھٹی پا لینا ہے —

"خواہش نفس اور غصہ میں نے بھگوان کی نذر کر دئے"۔

یہاں نہ تو خبط کی آگ میں جلنا ہے، نہ جھلسنا۔ جھٹ سے نذر کیا اور چھوٹے نہ کسی کو دبانا اور نہ مارنا! —

"جو گڑ دینے سے مر جائے اسے زہر کیوں دیا جائے!"

اندریاں بھی ذریعہ ہیں، انھیں بھی بھگوان کی نذر کر دو۔ کہتے ہیں" کان ہماری نہیں سنتے"، تو پھر کیا سننا ہی بند کر دیں؟ نہیں، سنو ضرور لیکن بھگوان کی کتھا سنو۔ نہ سننا بڑا مشکل ہے۔ لیکن بھگوان کی کتھا سننے کی طرف اُمل ہو کر کان کا استعمال آسان، پُر لطف اور

مفید ہے۔ اپنے کان تم رام کو دے دو۔ منہ سے رام نام لیتے رہو۔ اندریاں دشمن نہیں ہیں۔ وہ بھی اچھی ہیں۔ ان کی مقدرت کی انتہا نہیں ہے۔ اس لئے بھگوان کو بدھی نذر کر کے ہر ایک اندری سے کام لینا ہی "راج مارگ" ہے۔ اسی کو راج یوگ کہتے ہیں۔

(۴۵) مخصوص فعل پر اصرار نہیں

یہ بات نہیں کہ ہم کوئی خاص فعل ہی بھگوان کی نذر کریں۔ سارے افعال اسے سونپ دو۔ شبری کے وہ بیر! رام نے انھیں کتنے پریم سے قبول کیا۔ پرمیشور کی پوجا کرنے کے لئے کھوہ میں جا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جہاں جو بھی کام کرو، وہ خدا کی نذر کر دو۔ ماں بچے کو سنبھالتی ہے، گویا بھگوان کو ہی سنبھالتی ہے۔ بچے کو نہلاتی کیا ہے، گویا پرمیشور پر ہی جل چڑھاتی ہے۔ "بچہ نوازش خدا کا عطیہ ہے۔" ایسا ان کر ماں کو چاہئے کہ وہ ایشوری جذبے سے بچے کی پرورش کرے۔ کوشلیا رام کی اور یشودا کرشن کی فکر کتنے لاڈ و پیار سے کرتی تھیں؟ اسے بیان کرتے ہوئے شک۔ بالمیک اور تلسی داس نے اپنے کو بڑا خوش نصیب مانا ہے۔ اس کام میں انھیں بے انتہا لطف محسوس ہوتا ہے۔ ماں کا یہ سیوا اور خدمت کا کام بہت اونچا ہے۔ وہ بالک، پرمیشور کی وہ صورت، اس صورت کی سیوا سے بڑھکر خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اگر ایک دوسرے کی خدمت کرتے وقت ہمارے قلبی جذبات ایسے ہی ہوں۔ تو ہمارے افعال میں کتنی تبدیلی ہو جائے۔ جس کو جو خدمت ملی وہ ایشور کی ہی خدمت ہے، ایسے تصورات کرتے رہنا چاہئے۔

کسان بیل کی خدمت کرتا ہے، اُس بیل کو کیا حقیر سمجھنا چاہئے؟ نہیں۔ ویدوں میں وام دیو نے کُل کائنات کے اندر طاقت کی شکل میں سمائے ہوئے جس بیل کا ذکر کیا ہے، وہی اُس کسان کے بیل میں موجود ہے۔"

جس کے چار سینگ، تین پاؤں، دو سر اور سات ہاتھ ہیں، جو تین جگہ بندھا ہوا ہے۔ بڑا صاحب جلال ہو کر سب فانی چیزوں میں سمایا ہوا ہے، اسی گرجنے والے سنسار بھر میں سمائے ہوئے بیل کی پوجا کسان کرتا ہے۔"

تبصرہ نگاروں نے اس ایک اشلوک کے ۵ - ۷ مختلف مطلب بیان کئے ہیں۔ یہ بیل ہے بھی حیرت انگیز! آسمان میں گرج کے جو بیل پانی برساتا ہے، وہی مل موثر برسا کر کھیت میں فصل پیدا کرنے والے اس کسان کے بیل میں موجود ہے۔ اگر کسان اس بلند خیالی سے اپنے بیلوں کی خدمت کرے گا، تو اس کی یہ معمولی خدمت بھی ایشور کی نذر ہو جائے گی۔

اسی طرح ہمارے گھر کی مالکہ چوکا لگا کر رسوئی گھر کو صاف ستھرا رکھتی ہے، چولھا جلاتی ہے، صاف اور پاک غذا تیار کرتی ہے اور یہ خواہش رکھتی ہے کہ یہ رسوئی گھر کے سب لوگوں کو طاقت اور آسودگی بخشے، تو اس کا یہ سارا کرم یگیہ ہی ہے۔ چولھا کیا گویا اس ماتا نے ایک چھوٹا سا یگیہ ہی جگایا ہے۔ پرمیشور کو آسودہ خاطر رکھنے کی خواہش من میں رکھ کر جو کھانا تیار کیا جائے گا، وہ کتنا صاف اور پاک ہوگا، ذرا اس کا تصور کیجئے۔ اگر اس گھر والی کے من میں ایسی بلند خیالی ہو، تو اسے پھر گیتا میں مذکورہ رشیوں کی بیویوں کی ہی طرح ماننا ہوگا۔ ایسی ہی کتنی ماتائیں خدمت کر کے نجات پا گئی ہوں گی۔ اور "میں میں" کرنے والے پنڈت اور گیانی کونے میں ہی پڑے رہے ہوں گے!

(۴۶) ساری زندگی میں بھگوان کو ملا دو

ہماری روزمرہ کی ہر ہر لمحہ کی زندگی معمولی دکھائی دیتی ہو، تو بھی حقیقت میں وہ ویسی نہیں ہوتی۔ اس کا مفہوم بہت بلند ہے۔ ساری زندگی ایک بڑے یگیہ کا کام

ہی ہے۔ تمہاری نیند کیا، ایک سمادھی ہے۔ سب طرح کے التذاذ کو ایشور کے نذر کر کے اگر ہم نیند لیں گے، تو وہ سمادھی نہیں تو کیا ہوگی؟ ہم لوگوں میں اشنان کرتے وقت پورش سوکت کے پاٹھ کرنے کی رسم چلی آ رہی ہے۔ اب سوچو کہ اس نہانے کے فعل سے اس پورش سوکت کا کیا تعلق ہے؟ دیکھنا چاہو گے تو تعلق ضرور نظر آئے گا۔ جس عظیم ہستی کے ہزار ہاتھ اور ہزار آنکھیں ہیں، اس کا میرے اشنان سے کیا تعلق؟ تعلق یہ کہ تم جو لوٹا بھر پانی سر پر ڈالتے ہو اس میں ہزاروں بوندیں ہیں۔ وہ بوندیں تمہارا اتھاہ دھو رہی ہیں، تمہیں پاک بنا رہی ہیں۔ گویا تمہارے ماتھے پر ایشور کی برکت برس رہی ہے۔ گویا پرمیشور کے ہزاروں ہاتھوں سے ہزار دھاروں کی تم پر بارش ہو رہی ہے۔ ان بوندوں کی شکل میں گویا پرمیشور تمہارے سر کی گندگی دھو رہے ہیں۔ ایسا پاک جذبہ اس اشنان میں انڈیلو، تو وہ اشنان کچھ اور ہی ہو جائے گا اور اس میں بے انتہا شکتی پیدا ہو جائے گی۔

کوئی بھی کام جب اس جذبہ سے کیا جاتا ہے کہ وہ پرمیشور کا ہے، تو معمولی ہونے پر بھی پاک ہو جاتا ہے، یہ بات تجربہ سے ثابت ہے۔ ذرا تصور کرو کہ جو شخص ہمارے گھر آیا ہے وہ ایشور روپ ہے۔ عام طور پر کوئی بڑا آدمی بھی جب ہمارے گھر آتا ہے، تو ہم کتنی صفائی رکھتے ہیں اور کیسا بڑھیا کھانا پکاتے ہیں۔ اس لئے اگر یہ تصور کریں کہ وہ پرمیشور ہے، تو بھلا بتاؤ، ہمارے اس جذبے میں کتنا بڑا فرق پڑ جائیگا؟ کبیر کپڑے بنتا تھا۔ اسی میں محو ہو کر وہ گاتا "جھینی جھینی بینی چدریا"۔ یہ گاتا ہوا جھومتا جاتا۔ گویا ایشور کو اوڑھانے کے لئے وہ چادر بن رہا ہو۔ رگ وید کا رشی کہتا ہے۔ "میں اپنی یہ حمد سندر ہاتھوں سے بنے ہوئے کپڑے کی طرح ایشور کو پیش کرتا ہوں۔" شاعر حمد لکھتا ہے۔ ایشور کے لئے۔ بن کر جو کپڑا بناتا ہے، وہ بھی ایشور کے لئے ہی۔ کیسا دل کش یہ تصور ہے! کتنی قلبی پاکیزگی لانے والا اور دل میں مسرت کی لہریں

اٹھانے والا خیال ہے! یہ تصور اگر زندگی میں ایک بار آجائے، تو پھر زندگی کتنی پاکیزہ ہو جائے گی! اندھیرے میں جب بجلی چمکتی ہے تو وہ اندھیرا ایک لمحہ میں روشنی بن جاتا ہے۔ وہ اندھیرا کیا دھیرے دھیرے روشنی بنتا ہے؟ نہیں ایک لمحہ میں سارا اندر باہر بدل جاتا ہے۔ اسی طرح ہر فعل کو ایشور سے جوڑ دیتے ہو تو زندگی میں ایک دم انوکھی طاقت آجاتی ہے۔ ہر فعل بے نقص ہونے لگتا ہے۔ زندگی میں حوصلوں کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ ہماری زندگی میں آج حوصلہ ہے کہاں؟ ہم جی رہے ہیں کیونکہ مرتے نہیں۔ حوصلہ کا چاروں طرف قحط پڑا ہوا ہے۔ بے کیف زندگی رو رہی ہے! لیکن ذرا یہ تصور میں لاؤ کہ ہمیں اپنے سب افعال ایشور کے ساتھ جوڑنے ہیں۔ پھر دیکھو گے کہ تمہاری زندگی کتنی حسین اور پاکیزہ ہو جائے گی۔

اس میں شک نہیں کہ پرمیشور کے محض نام سے ہی فوراً تبدیلی آجاتی ہے۔ یہ نہ کہو کہ رام کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ذرا کہہ کر تو دیکھو۔ تصور کرو کہ شام کے وقت کسان کام کر کے گھر آ رہا ہے۔ راستہ میں اسے کوئی مسافر مل جاتا ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے ــــ "بھائی۔ مسافر۔ او نارائن ذرا ٹھہرو۔ اب رات ہونے آئی۔ بھگوان میرے گھر چلو۔" اس کسان کے منہ سے ایسے الفاظ نکلتے تو دو پھر دیکھو اس مسافر کا روپ بدلتا ہے یا نہیں۔ وہ مسافر اگر ڈاکو اور لٹیرا ہوگا تو بھی پاک ہو جائے گا۔ یہ فرق جذبہ کے باعث ہوتا ہے۔ جذبہ میں ہی سب کچھ بھرا ہوا ہے۔ زندگی جذبات سے پُر ہے۔ بیس سال کا ایک پرایا لڑکا ہمارے گھر آتا ہے۔ باپ اسے اپنی لڑکی دیتا ہے۔ وہ لڑکا تو صرف بیس سال کا ہے۔ لیکن پچاس سال کا وہ لڑکی کا باپ اس کے پاؤں چھوتا ہے، یہ کیا بات ہے؟ لڑکی دینے کا وہ کام ہی کتنا پاک ہے۔ وہ جسے دی جاتی ہے وہ پرمیشور ہی روپ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ جو داماد کے لئے ہے اسی کو اور اوپر لے جاؤ اور آگے بڑھاؤ۔

لوگ کہیں گے کہ آخر ایسا جھوٹا تصور کرنے سے فائدہ کیا؟ میں کہتا ہوں کہ پہلے سے ہی سچا جھوٹا مت کہو۔ پہلے ابھیاس کرو۔ آزمائش کرو۔ تب سچ جھوٹ خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اس کنیادان (لڑکی دینے) میں محض لفظی نہیں، بلکہ یہ سچا تصور کرو کہ وہ داماد سچ مچ ہی پرماتما ہے، تو پھر دیکھو گے کہ کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس پاک تخیل کے اثر سے چیز کی پہلی شکل اور بعد کے روپ میں زمین آسمان کا فرق پڑ جائیگا۔ نالایق لایق و مستحق بن جائے گا۔ جو برا ہے وہ بھلا ہو جائے گا۔ بالیہ بھیل کی کایا پلٹ اسی طرح ہوئی تھی۔ بینا پر انگلیاں ناچ رہی ہیں۔ مکھ سے نارائن نام کا جپ چل رہا ہے۔ اور مارنے کے لئے دوڑتا ہے، تب بھی سکون میں خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس کی طرف پریم کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بالیہ نے ایسا منظر اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اب تک دو ہی طرح کے جاندار دیکھے تھے —— ایک تو اس کی تیر کمان دیکھ کر بھاگ جانے والے یا الٹ کر اس پر حملہ کرنے والے۔ مگر نارد اسے دیکھ کر نہ تو بھاگے نہ حملہ ہی کیا، بلکہ سکون سے کھڑے رہے۔ بالیہ کی تیر کمان رک گئی۔ نارد کی نہ بھویں ہلیں نہ آنکھ جھپکی —— بیٹھے بھجن جوں کے توں جاری رہے۔ نارد نے بالیہ سے پوچھا۔ "تمہارا تیر کیوں رک گیا؟" بالیہ نے جواب دیا۔ "آپ کا سکون دیکھ کر۔" نارد نے بالیہ میں انقلاب پیدا کر دیا وہ انقلاب جھوٹا تھا یا سچا؟

دنیا میں واقعی کوئی برا ہے بھی یا نہیں، اس کا فیصلہ آخر کون کرے؟ کوئی واقعی برا سامنے آ جائے تو بھی ایسا تصور کرو کہ یہ پرماتما ہے۔ وہ برا ہوگا بھی تو سنت ہو جائے گا۔ تو کیا جھوٹ موٹ یہ تصور کریں؟ میں کہتا ہوں، کس کو یہ پتہ ہے کہ وہ برا ہی ہے۔ بعض آدمیوں کا کہنا ہے کہ بھلے لوگ خود اچھے ہوتے ہیں اس لئے انھیں سب کچھ اچھا دکھائی پڑتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ تو پھر ہم کو جیسا دکھائی دیتا ہے وہ بھی سچ کیسے مانیں؟ دنیا کو صحیح طور پر سمجھنے کا ذریعہ گویا

اکیلے بُرے لوگوں ہی کے پاس ہے۔ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ دنیا تو اچھی ہے، لیکن تم بُرے ہو اس لئے وہ تمہیں بُری دکھائی دیتی ہے۔ دیکھو دنیا کیا ہے؟ ایک آئینہ ہے۔ تم جیسے ہوگے، ویسے ہی سامنے دنیا میں تمہارا عکس دکھائی دے گا۔ جیسی ہماری نظر، ویسا ہی دنیا کا روپ! اس لئے ایسا تصوّر کرو کہ یہ دنیا اچھی ہے، پاک ہے۔ معمولی افعال میں بھی ایسا تصوّر داخل کرو۔ پھر دیکھو کہ کیا معجزہ ظاہر ہوتا ہے۔ بھگوان یہی بات سمجھا دینا چاہتے ہیں ـــ

"تم جو کچھ کرو۔ سب جوں کا توں بھگوان کی نذر کردو"۔

میری ماں بچپن میں ایک کہانی سنایا کرتی تھیں۔ بات مزیدار ہے۔ لیکن اس کا راز بہت قیمتی ہے۔ ایک عورت تھی۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ کروں گی، بھگوان کرشن کی نذر کردوں گی۔ وہ کرتی کیا کہ چوکا لیپنے کے بعد جو گوبر مٹی بچ جاتی اس کا گولا بنا کر باہر پھینک دیتی اور کہتی۔ بھگوان کرشن کی نذر ہو۔ ہوتا یہ کہ گوبر کا وہ گولا وہاں سے اٹھتا اور مندر میں بھگوان کی مورتی کے منہ پر جا کر چپک جاتا۔ بے چارہ پجاری مورتی کو دھوتے دھوتے تھک گیا، کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تھی۔ آخر کار معلوم ہوا کہ یہ کرامات اس عورت کی ہے۔ جب تک وہ عورت زندہ ہے تب تک مورتی کبھی صاف رہ ہی نہیں سکتی۔ ایک دن وہ عورت بیمار پڑ گئی۔ موت کی آخری گھڑی نزدیک آگئی۔ اس نے موت کو بھی کرشن کی نذر کردیا۔ اسی وقت مندر کی مورتی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ وہ ٹوٹ کر گر پڑی۔ اوپر سے آسمانی رتھ آیا عورت کو لینے کے لئے۔ اس نے رتھ کو بھی کرشن کی نذر کردیا۔ رتھ جا کر مندر سے ٹکرایا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سورگ بھی بھگوان کرشن کے دھیان کے سامنے بیکار رہے۔

مطلب یہ کہ جو کچھ بُرے بھلے کام ہم سے بن پڑیں، سب کو ایشور کی نذر کر دینے

سے ان میں کچھ اور ہی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جوار کا دانہ یوں کچھ پیلاپن اور سُرخی لئے ہوتا ہے۔ مگر اسی کو بھوننے سے کتنا بڑھیا سفید لاوا بن جاتا ہے۔ صاف، سفید ہشت پہلو، قاعدہ سے بنا ہوا وہ شاندار لاوا اس دانہ کے پاس رکھکر دیکھو، کتنا فرق ہے۔ مگر وہ لاوا ہے اسی دانہ کا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فرق صرف آگ کی وجہ سے ہو گیا۔ اسی طرح اس سخت دانہ کو چکی میں ڈال کر پیسو، تو اس کا ملائم آٹا بن جائے گا۔ آگ کے اتصال سے لاوا بن گیا۔ چکی میں ڈالنے سے ملائم آٹا بن گیا۔ اسی طرح ہمارا چھوٹا سا کام بھی یادِ خدا کا سنسکار ڈالنے سے بے نظیر بن جائے گا۔ عقیدت سے قیمت بڑھ جاتی ہے۔ وہ گڑھل کا معمولی سا پھول۔ بیل کی پتیاں۔ تلسی کی کوپل اور دُوب کے تنکے انھیں حقیر مت سمجھو ـــــ

"تکا کہتا ہے کہ جو بھی ایشور میں مل جاتا ہے اس میں لذت آجاتی ہے"

ہر ایک بات میں بھگوان کو ملادو اور پھر تجربہ کرو۔ اس ایشوری مسالے کے مقابلہ میں دوسرا کوئی مسالہ ہے کیا؟ اس ایشوری مسالے سے بڑھکر تم دوسرا کون سا مسالہ لاؤ گے؟ یہی ایشوری مسالہ اپنے ہر ایک کام میں ملادو، پھر سب کچھ سُندر اور پسندیدہ ہو جائے گا۔

رات کے ۹ بجے جب مندر میں آرتی ہو رہی ہو، دھوپ کی خوشبو پھیل رہی ہو، چراغ روشن کئے جا رہے ہوں، آرتی اُتاری جا رہی ہو، ایسے وقت سچ مچ یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم پرماتما کو دیکھ رہے ہیں۔ بھگوان دن بھر جاگے اب ان کے سونے کا وقت ہوا۔ بھگت گاتے ہیں۔

" سکھ نیند یا اب سوؤ گوپال" !

مگر شکی مزاج پوچھتا ہے ـــــ "بھلا بھگوان بھی کہیں سوتا ہے؟"

ارے بھگوان کیا نہیں کرتا؟ بھلے آدمی! اگر بھگوان سوتا نہیں، جاگتا

نہیں، تو کیا یہ تھپر سوئے گا، جاگے گا؟ بھائی، بھگوان ہی سوتا ہے، بھگوان ہی جاگتا ہے، اور بھگوان ہی کھاتا پیتا ہے۔ تلسی داس جی صبح تڑکے بھگوان کو جگاتے ہیں۔ پرارتھنا کرتے ہیں۔

"جاگئے رگھناتھ کنور! پنچھی بن بولے"

اپنے بھائی، بہنوں، عورتوں، مردوں کو رام چندر کی مورتی مان کر وہ کہتے ہیں — "میرے رام چندر! اب اٹھو" کتنا حسین خیال ہے یہ! انہیں تو کسی بورڈنگ کو لو۔ وہاں لڑکوں کو اٹھاتے وقت ڈانٹ کر — کہتے ہیں۔ "ابے، اٹھتے ہو کہ نہیں"؟ سویرے کا وہ سہانا وقت! کیا ایسے وقت سخت کلامی اچھی لگتی ہے؟ وشوامتر کے آشرم میں رام چندر سو رہے ہیں۔ وشوامتر انھیں اٹھا رہے ہیں۔ بالمیک رامائن میں اس کا ذکر آیا ہے۔

"بیٹا رام! اٹھو اب!" تمبر ایسے میٹھے بول سے وشوامتر جی انھیں اٹھا رہے ہیں۔ کتنا سندر ہے یہ فعل اور بورڈنگ کا وہ جگانا کتنا کرخت ہے! بیچارے سوئے ہوئے لڑکے کو ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا سات جنم کا دشمن ہی جگانے آیا ہے۔ پہلے دھیرے دھیرے پکارو، پھر کچھ زور سے پکارو۔ لیکن کرختگی اور سختی بالکل نہ ہونی چاہئے۔ اگر نہ جاگے، تو پھر دس منٹ کے بعد جگاؤ۔ امید رکھو کہ آج نہیں تو کل اٹھے گا۔ اس کے اٹھانے کے لئے میٹھے میٹھے صبح کے گانے اور بھجن سناؤ۔ جگانے کا فعل معمولی ہے۔ لیکن ہم اسے کتنا شاعرانہ دل پسند اور سندر بنا سکتے ہیں۔ گویا بھگوان کو ہی اٹھانا ہے۔ پرمیشور کی مورت کو ہی آہستہ سے جگانا ہے۔ نیند سے کیسے جگانا؟ یہ بھی ایک ہنر ہے۔

اپنے جملہ کاروبار میں اس تصور کو داخل کرو۔ علم طریقہ تعلیم میں تو اس تصور کی بہت ہی ضرورت ہے۔ لڑکے کیا ہیں، ایشور مورتیاں ہیں۔ استاد کا یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ میں

ان دیوتاؤں کی ہی خدمت کر رہا ہوں تب وہ لڑکوں کو اس طرح نہیں جھڑکے گا —— چلا جا اپنے گھر! کھڑا رہ گھنٹہ بھر! ہاتھ لمبا کر! کیسے میلے کپڑے ہیں ؟ ناک کس بُری طرح بہہ رہی ہے ؟" بلکہ ہلکے ہاتھ سے ناک صاف کر دے گا، میلے کپڑے دھوئے گا، اور پھٹے کپڑوں کو سی دے گا۔ اگر استاد ایسا کرے، تو اس کا کتنا اچھا اثر ہوگا۔ مار پیٹ کر کہیں اچھا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے ؟ لڑکوں کو بھی چاہئے کہ وہ اسی پاکیزہ جذبے سے استاد کو دیکھیں۔ استاد یہ سمجھیں کہ شاگرد ہری کی مورت ہے، اور لڑکے استاد کو ایشور کی مورت مانیں۔ ایسا جذبہ آپس میں رکھکر اگر دونوں برتاؤ کریں، تو تعلیم پُرنور ہو جائے گی —— لڑکے بھی بھگوان اور استاد بھی بھگوان! اگر لڑکوں کا یہ خیال ہو گیا کہ یہ استاد نہیں بلکہ بھگوان شنکر کی مورت ہے، ہم ان سے گیان امرت چکھ رہے ہیں۔ ان کی سیوا کر کے گیان پا رہے ہیں، تو پھر بتلاؤ لڑکے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں گے ؟

(۴۷) گناہ کا کھٹکا نہیں رہ

ایشور سب جگہ موجود ہے، ایسا جذبہ دل میں سما جائے، تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ ہم کیسا برتاؤ کریں، یہ علم اخلاق ہمارے باطن میں خود بخود دھڑکنے لگے گا۔ علم پڑھنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ تب سب عیب دور ہو جائیں گے۔ گناہ فرار ہو جائیں گے۔ گناہوں کی تاریکی مٹ جائے گی۔ تکارام نے کہا ہے ——

"چل تجھے چھٹی دیتا ہوں۔ ہر سانس "وِٹھل" کا نام لے۔ تیرا ایسا ایک بھی پاپ نہیں، جو بھگوان کا نام لینے پر تیرے پاس بنا رہے ——"

اچھا چلو، تم کو گناہ کرنے کی چھٹی! میں دیکھتا ہوں کہ تم گناہ کرنے سے تھکتے ہو، یا بھگوان کا نام گناہ جلانے سے تھکتا ہے۔ ایسا کون سا زبردست اور مغرور گناہ ہے جو بھگوان کے نام کے سامنے ٹھہر سکتا ہے —— ؟ "کرو جتنے چاہو گناہ" —— کرو جتنے تم سے

گناہ ہو سکیں، کرو، تم کو عام اجازت ہے۔ ہونے دو ہری نام اور تمہارے گناہوں کی کشتی! ارے اس ہری نام میں اس جنم کی نہیں، بشمار جنموں کے گناہ پل بھر میں بھسم کر ڈالنے کی طاقت ہے۔ کسی کھوہ میں جگ جگ کی تاریکی بھری ہو، تو بھی ایک دیا سلائی جلانے سے وہ بھاگتی ہے۔ وہ تاریکی روشنی میں بدل جاتی ہے۔ گناہ جتنے پرانے، اتنے ہی جلدی وہ مٹ جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ مرنے کو ہی ہوتے ہیں۔ پرانی لکڑیوں کے خاک ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

رام نام کے نزدیک گناہ ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ بچے کہتے ہیں کہ رام کہتے ہی بھوت بھاگتا ہے۔ ہم بچپن میں رات کو شمشان ہو آتے تھے۔ وہاں جا کر میخ گاڑ آنے کی شرط لگایا کرتے۔ رات کو سانپ بھی رہتے، کانٹے بھی ہوتے۔ باہر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا، تو بھی کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ بھوت کبھی دکھائی ہی نہیں پڑے، تصور کے ہی تو بھوت، پھر دکھائی کیوں دیتے؟ ایک دس برس کے بچے میں رات کو شمشان ہو آنے کی طاقت کہاں سے آگئی؟ رام نام سے۔ وہ طاقت سچائی کے سرچشمہ پرمیشور کی تھی۔ اگر یہ خیال رہے کہ پرماتما میرے پاس ہے، تو ساری دنیا کے الٹ پڑنے پر بھی ہری کا غلام خوف زدہ نہ ہوگا۔ اسے کون ساز کشش کھا سکتا ہے؟ راکشش اس کے تن بدن کو کھا بھی ڈالے اور ہضم بھی کر جائے، لیکن اسے سچائی نہیں ہضم ہو سکے گی۔ سچائی کو ہضم کر ڈالنے کی طاقت دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ ایشور کے نام کے سامنے گناہ ذرا بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ اس لئے ایشور سے من لگاؤ۔ اس کی نوازش حاصل کرو۔ سب اعمال اس کی نذر کر دو۔ اسی کے ہو جاؤ۔ اپنے سب کاموں کا چڑھاوا خدا کی نذر کرنا ہے۔ اس تصور کو مسلسل تیز تر بناتے چلے جاؤ گے، تو یہ حقیر زندگی نورانی ہو جائیگی، خراب زندگی اچھی بن جائے گی۔

(۴۸) تھوڑا بھی میٹھا

پتا، پھول، پانی کچھ بھی ہو، اس کے ساتھ بھگتی بھاؤ ہو، تو کافی ہے۔ کتنا دیا، کتنا چڑھایا، یہ بھی معنا نہیں۔ کس جذبے سے دیا، بس یہی مدعا ہے۔ ایک بار ایک پروفیسر سے میری گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ علم طریقہ تعلیم کے متعلق تھی۔ ہم دونوں کے خیال جداگانہ تھے۔ بالآخر پروفیسر نے کہا ـــ "بھائی میں اٹھارہ سال سے کام کر رہا ہوں" پروفیسر کو چاہئے تھا کہ وہ مجھے قائل کرتے، لیکن ایسا نہ کرتے ہوئے جب انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اتنے سال سے تعلیم کا کام کر رہا ہوں، تو میں نے ان سے مذاق میں کہا ـــ ۱۸ سال سے اگر بیل مشین کے ساتھ گھومتا رہے تو کیا وہ علم مشین کا واقف کار ہو جائیگا؟ علم مشین کا واقف کار اور چیز ہے اور آنکھیں بند کر کے چکر کاٹنے والا بیل اور چیز ہے۔ عالم اور چیز ہے اور تعلیم کا بوجھا ڈھونے والا اور چیز ہے۔ جو عالم ہوگا وہ چھ مہینے میں ہی ایسا تجربہ حاصل کرے گا کہ جو اٹھارہ سال تک بوجھا ڈھونے والے مزدور کی عقل میں نہیں آسکے گا۔ مطلب یہ کہ اس پروفیسر نے مجھے اپنی داڑھی دکھائی کہ میں نے اتنے سال کام کیا ہے۔ لیکن داڑھی سے حقیقت ثابت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایشور کے سامنے کتنا ڈھیر لگا دیا، اس کی اہمیت نہیں ہے۔ سوال ناپ، مقدار یا قیمت کا نہیں ہے سوال جذبہ کا ہے۔ کتنا اور کیا نذر کیا اس سے غرض نہیں ہے، بلکہ کیسے کیا یہ سوال ہے۔ گیتا میں کل سات سو ہی اشلوک ہیں۔ مگر ایسی کتابیں بھی ہیں، جن میں دس دس ہزار اشلوک ہیں۔ چیز کی شکل بڑی ہونے سے اس کی اہمیت بھی زیادہ ہوگی ہی ایسا نہیں کہہ سکتے۔ تو زندگی میں افعال کتنے کئے، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ بھگوان کی رضا کے لئے اگر ایک بھی فعل کیا ہے، تو وہی ہمیں کافی فائدہ یا تجربہ حاصل کرا دے گا۔ کبھی کبھی کسی ایک ہی پاک لمحہ میں ہمیں ایسا تجربہ ہو جاتا ہے جیسا

بارہ بارہ برسوں میں بھی نہیں ہو سکتا۔

غرض یہ کہ زندگی کے سبھی افعال و اعمال کو پرمیشور کی نذر کر دو، تو اس سے زندگی میں طاقت آ جائے گی۔ ہم نجات حاصل کر لیں گے۔ کام کر کے بھی اس کا پھل نہ چھوڑ کر اسے ایشور کی نذر کر دینا، یہ "راج یوگ" ہوا۔ یہ کرم یوگ سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے۔ کرم یوگ کہتا ہے کہ ——"کام کرو، پھل چھوڑو، پھل کی امید نہ رکھو، یہاں کرم یوگ ختم ہو گیا۔ "راج یوگ" کہتا ہے —— "کام کے پھلوں کو چھوڑو نہیں، بلکہ سب کام ایشور کی نذر کر دو۔ وہ پھول ہیں، تمہیں آگے لے جانے والے ذریعے ہیں، انھیں اس مورتی پر چڑھا دو۔" ایک طرف سے کرم اور دوسری طرف سے بھکتی کا میل ملا کر زندگی کو حسین بناتے جاؤ۔ چھوڑو مت پھلوں کو۔ پھلوں کو پھینکنا نہیں بلکہ بھگوان سے جوڑ دینا ہے۔ کرم یوگ میں چھوڑا ہوا پھل راج یوگ میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ بونے اور پھینک دینے میں فرق ہے۔ بویا ہوا تھوڑا بھی کئی گنا ہو کر ملتا ہے۔ پھینکا ہوا یوں ہی برباد ہو جاتا ہے۔ جو کرم ایشور کی نذر کیا گیا ہے، اسے بویا ہوا سمجھو۔ اُس سے زندگی میں بے انتہا لطف سما جائے گا اور بے حد پاکیزگی چھا جائے گی۔

اتوار، ۱۷-۴-۳۲

دسواں باب

جلوۂ ایزدی کا تصور

(۴۹) گیتا کے نصف اول کا جائزہ

دوستو! گیتا کا اول نصف ختم ہو گیا۔ دوسرے نصف میں داخل ہونے کے پہلے جو حصہ ہم ختم کر چکے ہیں، اس کے خلاصہ پر ایک نظر ڈالیں تو اچھا رہے۔ پہلے ادھیائے میں یہ بتایا گیا ہے کہ گیتا موہ کو ختم کرنے اور سودھرم کا رجحان پیدا کرنے کے لئے ہے۔ دوسرے باب میں زندگی کے اصول کرم یوگ اور استھت پرگیہ کا دیدار ہمیں نصیب ہوا۔ تیسرے، چوتھے باب اور پانچویں باب میں کرم، وکرم اور اکرم کی وضاحت ہوئی۔ کرم کا مطلب ہے ـــ سودھرم پالن۔ وکرم کا مطلب ہے ـــ وہ قلبی جذبہ کا عمل جو اپنے فرض کا بیرونی کام کرتے ہوئے اس کی مدد کے لئے کیا جاتا ہے۔ کرم اور وکرم دونوں ایک روپ ہونے پر جب قلب کی پوری صفائی ہو جاتی ہے، سب طرح کی کدورت دور ہو جاتی ہے، خواہشات مٹ جاتی ہیں، خرابیاں دفع ہو جاتی ہیں، بھید بھاؤ معدوم ہو جاتا ہے، تب اکرم کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ اکرم کی حالت پھر دو قسم کی بتائی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ ایسا محسوس کیا جائے کہ دن رات کام کرتے ہوئے بھی گویا کچھ بھی کام نہ کر رہے ہوں۔ اس کے برعکس دوسری قسم یہ کہ کچھ بھی نہ کرتے

ہوئے متواتر کام کرتے رہنا۔ اس طور پر اکرم کی حالت دو طریقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ دو قسمیں یوں تو الگ الگ دکھائی دیتی ہیں، مگر ہیں پورے طور پر ایک ہی۔ ان کے نام اگرچہ الگ الگ کرم یوگ اور سنیاس بتائے گئے ہیں، پھر بھی اندرونی حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے۔ اکرم کی حالت آخری مقصد، آخری منزل ہے۔ اس حالت کو موکش۔ (نجات) کا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے پہلے پانچ باب میں زندگی کی پوری شرح مکمل طور پر پیش کی گئی ہے۔

اس کے بعد چھٹے باب سے اکرم کی آخری منزل پر پہونچنے کے لئے وکرم کے جو مختلف راستے ہیں، من کو اندر سے صاف کرنے کے جو مختلف ذریعے ہیں، ان میں سے کچھ خاص خاص طریقے بتانے کی ابتدا کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں یکسوئی قلب کے لئے دھیان یوگ بتا کر ابھیاس اور ویراگیہ کا سہارا اسے دیا گیا ہے۔ ساتویں ادھیائے میں بھکتی کا بلند اور وسیع طریقہ بتایا گیا ہے۔ تم ایشور کی طرف چاہے پریم بھاؤ سے جاؤ، چاہے تحقیق و تجسس کی خواہش سے جاؤ، چاہے دنیا کی بھلائی کے خیال سے جاؤ، چاہے نجی خواہشات لے کر جاؤ، کسی طریقے سے جاؤ، لیکن ایک بار اس کے دربار میں پہونچ ضرور جاؤ۔ اس باب کا نام میں نے "پرپتی یوگ" یعنی ایشور کی پناہ میں جانے کی ترغیب دینے والا جوگ دیا ہے۔ ساتویں میں "پرپتی یوگ" بتا کر آٹھویں میں "ساتتیہ یوگ" بتایا ہے۔ میں جو یہ نام بتا رہا ہوں وہ تمہیں کتاب میں نہیں ملیں گے۔ مجھے جو مناسب نام معلوم ہوئے وہی میں نے رکھ دئے۔ "ساتتیہ یوگ" کا مطلب ہے اپنی سادھنا کو آخر وقت تک مسلسل جاری رکھنا۔ جس راستہ پر ایک بار چل پڑے اسی پر ہمیشہ قدم بڑھاتے جانا۔ کبھی چلے، کبھی نہیں، ایسا کرنے سے منزل پر پہونچنے کی کبھی امید نہیں ہو سکتی۔ بیزار ہو کر مایوسی سے کبھی یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اب کہاں تک سادھنا جاری رکھیں۔ جب تک

پھل نہ ملے، تب تک سادھنا جاری رکھنی چاہیئے۔

اس "ساتتیہ یوگ" کا تعارف کرا کر نویں باب میں بہت معمولی لیکن زندگی کا سارا رنگ ہی بدل دینے والی ایک بات بھگوان نے بتائی ہے اور وہ ہے راج یوگ۔ نواں باب کہتا ہے کہ جو کچھ بھی کام تمہیں ہر گھڑی ہوتے ہیں وہ سب بھگوان کی نذر کر دو۔ اس ایک ہی بات میں سارے علم و ہنر اور سب کرم وکرم ڈوب گئے، یہ سب کرم اور سادھنا اس سمرپن یوگ میں گھل مل گئے، سمرپن یوگ کو ہی راج یوگ کہتے ہیں۔ یہاں سارے سادھن ختم ہو گئے بھگوان کو نذر کرنے کی آج ہمہ گیر اور وسیع سادھنا بظاہر بہت سادہ اور معمولی نظر آتی ہے لیکن ہے بڑی مشکل۔ یہ طریقہ سیدھا اس لیئے ہے کہ اپنے ہی گھر میں بیٹھ کر ایک گنوار جاہل سے لے کر عالم تک سب بلا مخصوص محنت کے اسے عمل میں لا سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ اتنا سیدھا طریقہ ہے پھر بھی اس پر عامل ہونے کے لیئے بہت بڑے فضل کی ضرورت ہے۔

"مختلف نیک اعمال کے جمع ہونے سے وِٹھل سے پریم پیدا ہوتا ہے"

جب بہت سے جنموں کی نیکی اکٹھا ہو جاتی ہے، تبھی الشعور کی طرف رجحان پیدا ہوتا ہے۔ ذرا کچھ ہو، تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں، لیکن بھگوان کا نام لینے پر آنکھوں میں دو بوند آنسو کبھی نہیں آتے؛ اس کی تدبیر کیا؟ سنتوں کے قول کے مطابق ایک طرح سے یہ سادھنا بہت ہی آسان ہے۔ لیکن دوسرے پہلو سے وہ مشکل بھی ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں تو اور بھی مشکل ہو گئی ہے۔

آج تو جہالت کا پردہ ہماری آنکھوں پر پڑا ہوا ہے۔ آج تو شروعات یہاں سے ہوتی ہے کہ الشعور کہیں ہے بھی؟ وہ کہیں بھی کسی کو محسوس ہی نہیں ہوتا۔ ساری زندگی خرابیوں، نفسانی خواہشوں اور ناہمواریوں سے بھری ہوئی ہے۔ فی زمانہ تو بڑے سے بڑے

فلسفی کے خیالات بھی اس بات سے آگے جا ہی نہیں سکتے کہ سب کو پیٹ بھر روٹی کیسے نصیب ہو گی؟ اس میں ان کا قصور نہیں ؛ کیوں آج حالت ایسی ہے کہ کثیر تعداد لوگوں کو کھانے کو بھی نہیں ملتا ۔ آج کا بڑا مسئلہ ہے روٹی ۔ اسی مسئلہ کو حل کرنے میں آج ساری عقل الجھ رہی ہے. سائن آچاریہ نے رودر (شنکر مراد قوتِ تخریب) کی تشریح کی ہے. "بھوکے لوگ ہی رودر کے اوتار ہیں" ان کی بھوک مٹانے کے لئے بہت سے فلسفے، مختلف ازم، اور کئی ایک سیاسی اصول، وجود میں آگئے ہیں. ان مسئلوں سے سر اٹھانے کی آج فرصت ہی نہیں ملتی ۔ آج ہماری ساری عظیم کوششیں اسی لئے ہو رہی ہیں کہ آپس میں نہ لڑتے ہوئے امن چین اور ہنسی خوشی سے دو لقمے روٹی کیسے کھائیں؟ جس زمانہ میں سماج کی ایسی عجیب حالت ہو رہی ہے کہ وہاں ایشور ارپنا جیسی سیدھی سادھی اور آسان بات بھی بہت مشکل معلوم ہو تو کیا تعجب! لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ دسویں باب میں آج ہم یہی دیکھنے والے ہیں کہ ایشور ارپن لوگ کیسے عمل میں لایا جا سکے اور کیسے آسان بنایا جائے؟

۵۰ خدا کو دیکھنے کی آسان تدبیر

چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لئے جو تدبیر ہم کرتے ہیں، ویسی ہی تدبیر اس باب میں اس لئے بیان کی گئی ہے کہ پرماتما کے درشن سب جگہ ہوں. بچوں کو حروف بھی دو طرح سے سکھلائے جاتے ہیں. ایک ترکیب پہلے بڑے بڑے حروف لکھ کر بتانے کی ہے. دوسرا پھر انہیں حروف کو چھوٹا لکھ لکھ کر بتانے کی ہے. وہی ک "وہی گ" لیکن پہلے یہ بڑے تھے اب چھوٹے ہو گئے. یہ ایک ترکیب ہوئی. دوسری ترکیب یہ کہ پہلے سیدھے سادے آسان حروف سکھائے جائیں، بعد میں پیچیدہ و مرکب حروف. ٹھیک اسی طرح پرمیشور کو دیکھنے کا فن سیکھنا چاہیئے. پہلے جسیم بڑی پرمیشور کو دیکھیں. سمندر، پہاڑ وغیرہ عظیم چیزوں میں ہویدا پرمیشور فوراً [illegible] آپ کا آتما سمجھ میں آجائے،

تو ایک بوند پانی میں اور مٹی کے ایک ذرّہ میں بھی وہی پرماتما موجود ہے، یہ بھی سمجھ میں میں آجائے گا۔ بڑے موٹے "ک" و چھوٹے پتلے "ک" میں کوئی فرق نہیں ہے جو موٹے میں، وہی باریک میں۔ یہ ایک طریقہ ہوا۔ اب دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سیدھے سادے سہج پرماتما کو پہلے دیکھ لیں، پھر اس کی پیچیدہ شکل کو۔ جس کسی میں پاک خدائی جلوہ فطری طریقے سے ظاہر ہوا ہے، وہ بہت جلد قبول کر لیا جا سکتا ہے، جیسے رام میں نمایاں پرمیشوری جلوہ فوراً دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ رام سیدھا حرف ہے، یہ بلا جھنجھٹ کا پرمیشور ہے۔ مگر راون؟ پیچیدہ حرف ہے۔ اس میں کچھ نہ کچھ آمیزش ہے۔ راون کی ریاضت اور عمل کی طاقت عظیم ہے۔ لیکن اس میں شقاوت ملی ہوئی ہے۔ پہلے رام نما سیدھے حرف کو سیکھ لو جس میں نوازش ہے، الفت ہے، پریم ہے، ایسا رام سیدھا پرمیشور ہے، وہ جھٹ پکڑ میں آجائے گا۔ راون میں رہنے والے پرمیشور کو سمجھنے میں ذرا دیر لگے گی۔ یعنی پہلے آسان پھر مرکب حروف۔ شریفوں میں پہلے پرماتما کو دیکھ کر آخر میں شریروں میں بھی اسے دیکھنے کی مشق کرنی چاہیئے۔ سمندر میں بیٹھا عظیم الشان پرمیشور ہی پانی کی ایک بوند میں ہے۔ رام چندر کے اندر کا پرمیشور ہی راون میں ہے۔ جو ایک موٹے میں ہے وہی باریک میں ہے۔ جو آسان میں ہے، وہی مشکل میں بھی۔ ان دو طریقوں سے ہمیں یہ سنسار نما کتاب پڑھنا سیکھنا ہے۔

یہ بے پایاں سنسار گویا ایشور کی کتاب ہے۔ آنکھوں پر گہرا پردہ پڑنے سے یہ کتاب ہمیں بند ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔ اس سنسار کی کتاب کے خوبصورت حرفوں میں پرمیشور ہر جگہ لکھا ہوا ہے۔ لیکن وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ ایشور کا دیدار ہونے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، وہ یہ کہ معمولی سیدھا، نزدیک کا ایشوری سروپ آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا، اور دور کا ایشور سروپ اسے علم نہیں ہوتا۔ اگر

ہم سے کہیں کہ اپنی ماں کے اندر ایشور کو دیکھو، تو وہ کہیں گے "ایشور اتنا سیدھا اور آسان ہے؟"
لیکن اگر تیجیز پرماتما ظاہر ہوا تو اس کا جلال ہم سہہ سکیں گے؟ کنتی کے من میں آیا کہ دور رہنے والا سورج مجھ سے ملنے آ کر بیٹھے، لیکن سورج کے قریب آتے ہی وہ جلنے لگی۔ اس کی تپش اس سے برداشت نہ ہوئی۔ خدا اپنی پوری شان کے ساتھ سامنے آ کر کھڑا ہو جائے تو وہ ہمیں برداشت نہیں ہو سکتا۔ لیکن الغفور اگر ماں کی حسین صورت میں آ کر کھڑا ہو جائے، تو وہ جچتا نہیں۔ یہ علامتیں ہیں بدقسمتی اور موت کی۔ ہمارے من کی ایسی بیمار حالت پرمیشور کے درشن میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس ذہنیت کو ترک کرنا چاہیے۔ پہلے ہم اپنے پاس کے جسیم اور آسان پرماتما کو پڑھ لیں، پھر باریک اور پیچیدہ پرماتما کو پڑھیں۔

(۱۵) انسان میں موجود پرمیشور

پرمیشور کی بالکل پہلی صورت جو ہمارے پاس ہے، وہ ہے خود ہماری ماں۔ سمرتی کہتی ہے "ماتا ایشور دیوی ہیں"۔ پیدا ہوتے ہی بچہ کو ماں کے سوا اور کون دکھائی دیتا ہے؟ پریم اور محبت کے روپ میں پرمیشور کی مورت اس میں موجود دکھائی دیتی ہے۔ اس ماتا کی ہی وسعت کو ہم بڑھائیں اور بندے ماترم کہہ کر مادرِ وطن کی اور پھر پرتھوی ماتا کی پوجا کریں۔ لیکن ابتدا میں سب سے اونچی پرمیشور کی پہلی شکل جو بچے کے سامنے آتی ہے، وہ ماں کی ہی صورت میں۔ ماتا کی پوجا کے ذریعہ موکش ملنا ناممکن نہیں ہے۔ ماں کی پوجا کیا ہے؟ گویا شفقت و پریم کے بل پر قائم پرمیشور کی پوجا ہے۔ ماں تو محض ایک وسیلہ ہے۔ پرمیشور اس میں اپنی شفقت انڈیل کر اسے نچاتا ہے۔ اس بےچاری کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اتنی شفقت و محبت

اندر سے کیوں امنڈتی ہے، کیا وہ یہ حساب لگا کر بچے کی پرورش کرتی ہے کہ بڑھاپے میں کام آئے گا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اس نے اس بچہ کو پیدا کیا ہے جس کی تکلیف اس نے اٹھائی ہے۔ ان تکلیفوں نے اسے اس بچہ کے لئے پاگل بنا دیا ہے۔ وہ تکلیفیں اسے شفیق بنا دیتی ہیں۔ وہ پیار کے بنا رہ ہی نہیں سکتی۔ وہ مجبور ہے۔ ماں گویا بے پایاں خدمت کی مورتی ہے۔ خدا کی اگر کوئی سب سے اعلیٰ پوجا ہے تو وہ ماں کی پوجا۔ ایشور کو ماں کے نام ہی سے پکارو۔ ماں سے بڑھ کر بلند لفظ ہے ہی کہاں؟ "ماں" یہ پہلا موٹا اکشر ہے۔ اس میں ایشور دیکھنا سیکھو۔ پھر باپ و استادان میں بھی دیکھو، استاد تعلیم دیتے ہیں۔ وہ ہمیں جانور سے انسان بناتے ہیں۔ کتنے ہیں ان کے احسانات! پہلے ماں، پھر باپ، پھر استاد، پھر مہربان سنت۔ ان سب بے شمار مورتی شکلوں میں نمایاں اس پرمیشور کو پہلے دیکھو۔ اگر پرمیشور یہاں نظر نہ آیا تو پھر نظر آئے گا کہاں؟

ماں، باپ، استاد، سنت ان میں پرماتما کو دیکھو، اسی طرح اگر چھوٹے بچوں میں بھی ہم پرماتما کو دیکھ سکیں تو کتنا مزہ آئے؟ دھرو، پرہلاد، نچکیتا، سنک سنندن، سنت کمار، یہ سب چھوٹے بچے ہی تو تھے، لیکن پُران کے مصنفوں اور ویاس وغیرہ کو ان سے اتنا پریم ہو گیا کہ اب انہیں کہاں رکھیں کہاں نہ رکھیں۔ سکھدیو، شنکر آچاریہ بچپن سے ویراگی تھے۔ گیان دیو کا بھی یہی حال تھا۔ سب کے سب بچے! لیکن ان میں پرمیشور جتنی صاف شکل میں نمودار ہوا ہے، اتنا کسی دوسری جگہ نہیں۔ عیسیٰ مسیح بچوں کو بہت پیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے شاگردوں نے ان سے پوچھا: آپ ہمیشہ خدائی سلطنت کا ذکر کرتے ہیں تو اس خدائی سلطنت میں آخر جا کون سکے گا؟ پاس ہی ایک بچہ بیٹھا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے اسے

میز پر کھڑا کر کے کہا: "جو اس بچے کی طرح ہوں گے وہی وہاں پہنچ سکیں گے۔" ان کا کہنا بالکل سچ تھا۔ رام داس سوامی ایک بار بچے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کچھ بوڑھوں کو تعجب ہوا۔ ایک نے ان سے پوچھا: "آج آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" سمرتھ نے جواب دیا۔ "عمر میں جو چھوٹے تھے، وہ بڑے ہو گئے اور عمر میں جو بڑے تھے، وہ چور ہو گئے۔"

جوں جوں عمر بڑھتی ہے۔ ویسے ویسے انسان کے من میں سینگ پھوٹتی ہے، خواہشات بڑھتی جاتی ہیں، پھر پرمیشور کی یاد کہاں؟ چھوٹے بچوں کے من پر کوئی لیپ نہیں رہتا۔ ان کی سمجھ خالص رہتی ہے۔ بچے کو ہم سکھاتے ہیں "جھوٹ مت بولو۔" وہ پوچھتا ہے: "جھوٹ کیسے کہتے ہیں؟" تب اُسے اصول بتاتے ہیں: "بات جیسی ہو ویسی ہی کہنی چاہیئے۔" لڑکا الجھن میں پڑ جاتا ہے: "کیا جیسا ہو ویسا کہنے کے علاوہ بھی کہنے کا کوئی دوسرا طریقہ ہے؟ جیسا نہیں ہے ویسا کیسے کہیں؟ چوکور کو چوکور کہو۔ گول مت کہو۔ ایسا ہی کہنے جیسا ہے۔ بچے کو تعجب ہوتا ہے ہنستے کیا ہیں؟ پاک پرمیشور کی مورتی ہیں بڑے لوگ انہیں غلط تعلیم دیتے ہیں۔ جو بھی ہو، ماں، باپ، استاد، سنت، بچے اگر ان میں پرماتما کو نہ دیکھ سکیں تو پھر کس شکل میں دیکھیں گے؟ اس سے اچھی شکل پرمیشور کی دوسری نہیں ہے۔ پرمیشور کی ان خوب صورت ساعقا اور حلیم شکلوں کو پہلے پہچانو۔ ان میں پرمیشور صاف اور موٹے حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔

(۵۴) کائنات میں موجود پرمیشور: مخصوص مثال

پہلے ہم انسان کی سب سے زیادہ نیک اور پاکیزہ مورتیوں میں پرماتما کو دیکھنا سیکھیں۔ اسی طرح قدرت میں جو جو وسیع و دلکش منظر ہیں، ان میں اس کے درشن پہلے

کریں۔ اوشا (شفق صبح) کو ہی تو طلوعِ آفتاب سے پہلے کی وہ روشنی۔ اس اوشا کو ہی گاتے گاتے ہوئے مست ہو کر رِشی ناچنے لگتے ہیں۔ انہوں نے اسے "اوشا تو پرمیشور کا پیغام لانے والی ملکوتی پیغامبر ہے، تو برف کے ذرّات سے نہا کر آئی ہے۔ تو لافانی حقیقت کی علمبردار ہے۔" ایسے حسین اور دلکش انداز سے رِشیوں نے اوشا کا تذکرہ کیا ہے۔ ویدک رِشی کہتے ہیں "جب کہ تو پرمیشور کا پیغام لانے والی ہے تو اگر تجھے دیکھ کر پرمیشور کا روپ نہ دکھائی دے، سمجھ میں نہ آئے تو پھر مجھے پرمیشور کا علم کون کرائے گا؟" اتنی خوب صورتی سے سج دھج کر یہ اوشا سامنے کھڑی ہے لیکن ہماری نظر اس پر جاتی کہاں ہے؟

اسی طرح سورج کو دیکھو۔ اس کے درشن گویا پرماتما کے ہی درشن ہیں، وہ مختلف قسم اور رنگ برنگ کی تصویریں آسمان میں کھینچتا ہے۔ مصوّر مہینوں برش اِدھر اُدھر گھما کر طلوعِ آفتاب کی تصویریں بناتے اور ان میں رنگ بھرتے ہیں۔ لیکن تم صبح کو اُٹھ کر پرمیشور کی اس کاریگری کو دیکھو! اس صنعتِ ملکوتی کے لئے اس انتہائی دلکش منظر کے لئے بھلا کون سی مثال دی جاسکتی ہے؟ لیکن دیکھتا کون ہے؟ اِدھر سُندر بھگوان کھڑا ہے، اور اُدھر یہ غافل منہ پر اور بھی رضائی تان کر نیند میں خراٹے بھرتا ہے۔ سورج کہتا ہے "ارے کاہل! تو تو پڑا ہی رہنا چاہتا ہے، لیکن میں تجھے ضرور اٹھاؤں گا۔" ایسا کہہ کر وہ اپنی نباتات بخش کرنیں کھڑکیوں میں سے بھیج کر اس کاہل کو جگا ہی دیتا ہے۔

سورج تمام ساکن و متحرک ہستیوں کی روح رواں ہے۔ متحرک و غیر متحرک ہستیوں کی بیخ و بنیاد ہے۔ رِشی نے اسے مِتر (دوست) کہا ہے "یہ دوست ہم لوگوں کو پکارتا ہے۔ انہیں کام کاج میں لگاتا ہے۔ وہ بہشت اور زمین کو تھامے ہوئے ہے۔"
سچ مچ، وہ سورج زندگی کی بنیاد ہے۔ اس میں پرماتما کے درشن کرو۔

اور وہ مقدس گنگا! جب میں بنارس میں تھا، گنگا کے کنارے جا بیٹھتا۔ رات کی تنہائی میں جاتا تھا۔ کتنی سندر اور خوش نما اس کی روانی تھی۔ اس کا وہ شاندار سنجیدہ بہاؤ، اور اس کے پیٹ میں اکٹھا وہ آسمان کے بے شمار تارے! میں بے زبان بن جاتا، شنکر کی جٹا جو سے نکلی یعنی اس ہمالیہ سے بہہ کر آنے والی وہ گنگا۔ جس کے کنارے راج پاٹ کو تنکے کی طرح پھینک کر راجہ لوگ تپ کرنے جاتے تھے، اس گنگا کا درشن کر کے مجھے بے حد سکون معلوم ہوتا تھا، اس سکون کو کن لفظوں میں بیان کروں؟ وہاں زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ ہندو کیوں یہ چاہتا ہے کہ مرنے پر کم سے کم میری ہڈی تو گنگا میں پڑ جائے؟ آپ ہنسئے آپ کے ہنسنے سے کچھ بگڑتا نہیں۔ لیکن مجھے یہ جذبات بہت پاک اور لائق قبول معلوم ہوتے ہیں۔ مرتے وقت گنگا کی دو بوند منہ میں ڈالتے ہیں۔ وہ دو بوند کیا ہیں؟ ان کی شکل میں گویا پرمیشور ہی منہ میں اتر آتا ہے۔ اس گنگا کو پرماتما ہی سمجھو وہ پرمیشور کی دیا بہہ رہی ہے۔ تمہارا سارا بھیتری اور باہری کوڑا کرکٹ وہ ماتا دھو رہی ہے اور بہا لیجا رہی ہے۔ اگر گنگا ماتا میں بھی پرمیشور کھلے طور پر نہ دکھائی دے تو کہاں دکھائی دے گا؟ آفتاب۔ ندیاں۔ دھو دھو کر کے لہریں مارنے والا یہ عظیم الشان سمندر، یہ سب پرمیشور کی شکلیں ہی تو ہیں!

اور وہ ہوا۔ کہاں سے آتی ہے، کہاں جاتی ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔ یہ بھگوان کی قاصد ہی ہے۔ ہندوستان میں کچھ ہوائیں عظیم ہمالیہ سے آتی ہیں، کچھ گہرے سمندر سے۔ یہ پاک ہوا ہمارے دل کو چھوتی ہے، ہمیں بیدار کرتی ہے، ہمارے کانوں میں گنگناتی ہے۔ لیکن اس ہوا کا پیغام سنتا کون ہے؟ جیل سے اپنا چار سطر کا خط نہ دیا تو ہمارا دل کھٹا ہو جاتا ہے۔ ارے کم بخت! کیا رنگ ڈھنگ اپنے ان چھٹی میں ہیں؟ پرمیشور کا جو یہ پیغام ہوا کے ساتھ ہر گھڑی آرہا ہے اس کو نہ سن!

اور ہمارے گھر کے ان روزانہ کام آنے والے جانوروں کو دیکھو۔ وہ گائے ماتا کتنی
شفقت کتنی محبت اور پریم سے پُر ہے۔ دوپہر، تین تین میل سے جنگل جھاڑیوں
سے اپنے بچھڑوں کے لئے کیسی دوڑ کر آتی ہے۔ [illegible] کو پہاڑوں، پربتوں
سے بہاتے پانی کو لے کر کل کل کرتی ہوئی آنے والی ندیاں دیکھ کر، اپنے بچھڑوں
کے لئے دودھ بھرے تھنوں سمیت رمبھاتی ہوئی آنے والی شفیق گایوں کی یاد
آجاتی ہے۔ وہ رشی ندی سے کہتا ہے: "اے دیوی! دودھ کی طرح پاک۔
مقدس اور شیریں پانی لانے والی تو گائے جیسی ہے، جیسے گائے جنگل میں ہی نہیں
رہ سکتی، ویسے ہی تو پربتوں میں نہیں رہ سکتی ———— تو سرپٹ دوڑتی
ہوئی پیارے بچوں سے ملنے کے لئے آئی ہے
شفیق گائے کی شکل میں بھگوان ہی دروازہ پر کھڑا ہے۔"

اور اس گھوڑے کو دیکھو، کتنا عمدہ، کتنا ایماندار، کتنا وفادار ہے۔ عرب اپنے
گھوڑے کو کتنا پیار کرتے ہیں! اس عرب کی کہانی تمہیں معلوم ہے نا؟ وہ مصیبت زدہ
عرب ایک سوداگر کے ہاتھ گھوڑا بیچنے کو تیار ہو گیا ہے۔ ہاتھ میں اشرفیوں کی تھیلی لیکر وہ اصطبل
میں جاتا ہے۔ گھوڑے کی سنہری اور محبت بھری آنکھوں پر اس کی نگاہ جا ٹھہری، تو وہ تھیلی پھینک دیتا
ہے اور کہتا ہے: "میری جان چلی جائے لیکن میں گھوڑا نہیں بیچوں گا۔ میرا جو کچھ ہونا ہو، ہو۔ گھوڑا
بیچ کر کل خدا میری مدد کرے گا؟" بیٹھو! تمہیں بتاتے ہی کیسا وہ پریم سے بھرا ہوا ہے:
کیسی بڑھیا اس کی ایال ہے۔ سچ مچ گھوڑے میں بیش قیمت [illegible] ۔ [illegible]
سائیکل میں کیا رکھا ہے؟ گھوڑے کو کھڑا کر دو۔ وہ تمہارے لئے جان دے دیگا۔
تمہارا ساتھی بن کر رہے گا۔ میرا ایک دوست گھوڑے پر چڑھنا سیکھ رہا تھا۔ گھوڑا اسے
گرا دیتا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا: "گھوڑا تو مجھے نیچے پٹک دیتا ہے۔" میں نے اس سے
کہا: "تم صرف گھوڑے پر بیٹھنا ہی چاہتے ہو، یا اس کی کچھ خدمت بھی کرتے ہو؟"

خدمت تو کرے دوسرا اور اس کی پیٹھ پر سواری کرو تم، یہ کیسا؟ تم خود اسے دانہ پانی دو، کھرا کرو اور پھر سواری کرو۔" اس نے ایسا ہی کیا، کچھ دن بعد مجھ سے آکر کہا۔ "اب گھوڑا نہیں گراتا ہے۔" گھوڑا تو پرمیشور ہے وہ بھگتوں کو کیوں گرائے گا؟ اس کی بھگتی دیکھ کر گھوڑا جھک گیا۔ گھوڑا جاننا چاہتا ہے کہ یہ بھگت ہے یا کوئی اور۔ بھگوان سری کرشن خود کھرا کرتے اور اپنے پیتامبر میں دانہ لا کر اسے کھلاتے تھے۔ ٹیکری آئی، نالا آیا، کیچڑ آئی کہ سائیکل رکی، مگر گھوڑا کودتا پھاندتا چلا ہی جاتا ہے۔ یہ خوبصورت محبت سے لبریز گھوڑا گویا پرمیشور کی سورتی ہی ہے۔

اور وہ شیرا۔ جسے میں بڑودہ میں تھا۔ صبح ہی صبح اس کی بھاری گرج کی آواز کانوں میں پڑتی۔ اس کی آواز اتنی وزن دار اور عمدہ ہوتی تھی کہ دل ڈولنے لگتا تھا۔ مندروں میں اندرونی گنبدوں میں جیسی آواز گونجتی ہے ویسی ہی وزن دار اس کی وہ اندر سے نکلنے والی گرج بھی تھی۔ اور شیر ببر کی وہ متحمل، دلیرانہ، عالی شان و بے باکانہ نشست اس کے وہ شاہی ڈھنگ اور شان۔ وہ بڑھیا خوبصورت ایال، گویا چنوری ہی اس شاہ جنگلات پر چنوری ہل رہی ہوں، بڑودہ کے ایک باغ میں یہ شیر تھا۔ وہاں وہ آزاد نہیں تھا۔ پنجرے میں وہ چکر کاٹتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ذرا بھی بے مہری نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ڈھنگ اور اس کی نگاہ میں، ہم دردی بھری ہوئی تھی۔ گویا دنیا کی اسے کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ اپنے ہی دھیان میں وہ مست دکھائی دیتا تھا۔ سچ سچ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا شیر پرمیشور کا ہی ایک پاک ظہور ہے۔ بچپن میں میں نے انڈروکلیز اور شیر کی کہانی پڑھی تھی۔ کتنی عمدہ کہانی ہے وہ۔ وہ بھوکا پیاسا شیر بر انڈروکلیز کے پہلے کے احسان کو یاد کر کے اس کا دوست ہو جاتا ہے۔ اور اس کے پاؤں چاٹنے لگتا ہے۔ اس کا کیا

راز ہے؟ انڈرڈ کلیر نے شیر پیر میں رہنے والے پرمیشور کا درشن کر لیا تھا بھگوان شنکر کے پاس ہمیشہ شیر رہتا ہے، شیر پرماتما کا ایک اک جلوہ ہے۔

اور باگھ کی بھی کیا کم شے ہے۔ اس میں کثرت سے خدائی جلال ظاہر ہوا ہے۔ اس سے دوستی رکھنا ناممکن نہیں، بھگوان پانینی جنگل میں بیٹھے شاگردوں کو پڑھا رہے تھے، اتنے میں باگھ آگیا۔ لڑکے گھبرا کر چلانے لگے "ویاگھر۔ ویاگھر" پانینی نے کہا: اچھا ویاگھر کا مطلب کیا ہے؟ جس کی قوت شامہ تیز ہو وہ "ویاگھر" ہے۔ بچوں کو اس سے کچھ ڈر لگا ہو۔ مگر بھگوان پانینی کے لئے تو وہ باگھ محض ایک غیر لفظ اور دی لطف آمیز لفظ ہو گیا تھا باگھ دیکھ کر وہ اس لفظ کی ابتدا اور مخرج بتانے لگے، باگھ پانینی کو کھا گیا، لیکن باگھ کے کھا جانے سے کیا ہوا، پانینی کے جسم کی میٹھی خوشبو اسے پسند آئی، اس کا من چل گیا اور اس نے پھاڑ کھایا۔ لیکن پانینی وہاں سے بھاگے نہیں، کیونکہ وہ برہم شید (اسم ذات) کے پجاری تھے ان کے لئے سب کچھ وحدانیت سے بھر گیا تھا۔ باگھ میں بھی وہ برہم شبد کا احساس کر رہے تھے۔ پانینی کے اس عظمت کے باعث تشریحات میں جہاں کہیں ان کا نام آیا ہے وہاں تعظیماً ان کا ذکر بھگوان پانینی کہہ کر کیا گیا ہے۔ وہ پانینی کا بہت بڑا احسان مانتے ہیں۔

بھگوان پانینی باگھ میں پرماتما کا درشن کر رہے ہیں۔

گیان دیو نے کہا ہے:۔

• پہلے ہی گھر میں سورگ اتر آئے یا باگھ آ کر چڑھائی کر دے، پھر بھی آتم بدھی (عقل سلیم) میں کوئی فرق نہ پڑے۔

ویسے ہی سانپ کو بھی سمجھو، سانپ سے لوگ بہت ڈرتے ہیں، لیکن سانپ گویا کٹر صفائی پسند برہمن ہی ہے۔ کتنا صاف! کتنا خوب صورت!

ذرا بھی گندگی اسے برداشت نہیں۔ گندے بھرنا کتنے ہی دکھائی دیتے ہیں،
لیکن گندہ سانپ کبھی کسی نے دیکھا ہے؟ گویا وہ خلوت نشیں فقیر ہی ہو۔ صاف،
صاحب جلال، خوشنما ہار کی طرح وہ سانپ! اس سے ڈرنے کی کیا ضرورت!
ہمارے آباؤ اجداد نے تو اس کی پرستش ہی قائم کر رکھی ہے۔ بھلے آپ کہیں
کہ ہندو دھرم میں نہ جانے کیا کیا وہم بھرے پڑے ہیں، لیکن ناگ پوجا کا
دستور اس میں ضرور ہے۔ بچپن میں میں اپنی ماں کے لئے چندن گھس کر
سانپ کی تصویر بنا دیا کرتا تھا۔ میں ماں سے کہتا: "بازار میں تو اچھی تصویر مل
جاتی ہے ماں!" وہ کہتی: "وہ ردی ہوتی ہے، مجھے وہ نہیں چاہیئے۔ اپنے بچے
کی بنائی ہوئی تصویر اچھی ہوتی ہے۔ پھر اس ناگ کی پوجا کی جاتی۔ یہ کیا
پاگل پن ہے؟ مگر ذرا غور کیجئے، وہ سانپ ساون کے مہینے میں مہمان بن کر ہمارے
گھر آتا ہے۔ برسات ہو جانے سے اس بچارے کے گھر میں پانی بھر جاتا ہے۔
تب وہ کیا کرے گا؟ دور تنہائی میں رہنے والا وہ رشی آپ کو فضول تکلیف نہ ہو،
اس خیال سے کسی چھپر کے نیچے کہیں [illegible] پڑا رہتا ہے۔ وہ کم سے کم جگہ گھیرتا
ہے لیکن ہم ڈنڈا لے کر دوڑتے ہیں۔ [illegible] مہمان اگر ہمارے گھر آ جائے
تو کیا اسے مارنا مناسب ہے؟ سنت فرانسس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ
جب جنگل میں سانپ دکھائی دیتا تو وہ اس سے بڑے شفقت آمیز لہجہ میں کہتا
"آ بھائی آ" سانپ اس کی گود میں کھیلتے، اس کے بدن پر ادھر ادھر چڑھ
جاتے۔ اسے جھوٹ نہ جانئے۔ پریم میں ضرور ایسی طاقت ہوتی ہے۔ سانپ
[illegible] سمجھتے ہیں کہ زہریلا ہے۔ لیکن آدمی کیا کم زہریلا ہے؟ سانپ تو کبھی کبھی کاٹتا
[illegible] نہیں کاٹتا۔ سو میں نوے تو زہریلے ہوتے ہی نہیں ہیں۔ تمہاری
[illegible] حفاظت کرتا ہے۔ کھیتی کو برباد کرنے والے لاتعداد کیڑوں

مکوڑوں کو کھا کر رہتا ہے۔ ایسا یہ حسن۔ پاک۔ صاحب جلال، خلوت پسند سانپ بھگوان کا روپ ہے ہمارے تمام دیوتاؤں میں کہیں نہ کہیں سانپ موجود آتا ہے گنیش جی کی کمر میں ہم نے سانپ کا کمربند باندھ دیا ہے۔ شنکر کے گلے میں سانپ لپیٹ دیئے ہیں اور بھگوان وشنو کو ناگ کا بستر ہی دے دیا ہے۔ اس کے راز اور اس کے لطف کو ذرا سمجھو۔ ان سب کا مطلب یہ ہے کہ ناگ کی شکل میں پرمیشور کا جلوہ ظہور میں آیا ہے۔ اس پرمیشور کا تعارف حاصل کرو۔

(۵۳) کائنات میں موجود پرمیشور کچھ اور مثالیں

ایسی کتنی مثالیں دوں؟ میں تو صرف ایک تصور پیش کر رہا ہوں۔ رامائن کا سارا نچوڑ اس طرح کے دل کش تصورات میں ہی ہے۔ رامائن میں باپ بیٹے کی محبت ماں بیٹے کا پیار، بھائی بھائی کی شفقت، شوہر بیوی کی الفت یہ سب کچھ ہے، لیکن مجھے رامائن اس واسطے پسند نہیں ہے بلکہ پسند اس لئے ہے کہ رام کی دوستی باندروں سے ہوئی۔ آج کل لوگ کہتے ہیں کہ وہ باندر تو ناگ فرقہ کے تھے۔ محققین کا کام یہی ہے، پرانی باتوں کی چھان بین کرنا۔ ان کے اس کام پر مجھے اعتراض نہیں ہے، لیکن اگر رام نے اصلی باندروں سے دوستی کی ہو تو اس میں ناممکن کیا ہے؟ رام کا اپنا وصف اور خوبی دراصل اسی بات میں ہے کہ رام اور باندر دوست ہو گئے۔ ایسا ہی، کرشن اور گایوں کا تعلق ہے یہی تصور ساری کرشن پوجا کی بنیاد ہے۔ شری کرشن کی کسی تصویر کو لیجئے۔ تو آپ کو اردگرد گائیں کھڑی ملیں گی تبھی گوپال کرشن! گوپال کرشن! اگر کرشن سے گایوں کو الگ کر دو تو پھر کرشن میں باقی کیا رہا؟ رام سے اگر باندر ہٹا دیئے جائیں تو پھر اس رام میں بھی کیا رام باقی رہا؟ رام نے باندروں میں بھی بھگوان کے درشن کئے اور ان کے ساتھ پریم اور گہری دوستی کا تعلق قائم کیا۔ یہ ہے رامائن کی کنجی! اس کنجی کو آپ بھول جائیں گے تو رامائن کی مٹھاس کھو دیں گے۔ باپ بیٹے کا

ماں بیٹے کا پریم تو اور جگہ بھی مل جائے گا، لیکن انسان اور باندروں کی یہ دوستی صرف رامائن میں ملے گی، اور کہیں نہیں۔ باندروں میں بیٹھے ہوئے بھگوان کو رامائن نے اپنے اندر پوری طرح سے جذب کر لیا ہے۔ باندروں کو دیکھ کر رشیوں کو بڑا اشتیاق ہوتا۔ ٹھیک رام ٹیک سے لے کر کرشنا کے کنارے تک زمین پر پیر نہ رکھتے ہوئے وہ باندر ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر کودتے پھاندتے اور تفریح کرتے گھومتے تھے ایسے اس گھنے بن کو اور اس میں تفریح کرنے والے باندروں کو دیکھ کر ان اہلِ دل رشیوں کے قلب میں جذباتِ شعری بیدار ہو جاتے اور مسرت حاصل ہوتی۔ خدا کی آنکھیں کیسی ہوتی ہیں؟ یہ بتاتے ہوئے اُپنشدوں نے بندروں کی آنکھوں کی مثال دی ہے۔ بندر کی آنکھیں بڑی چنچل ہوتی ہیں۔ چاروں طرف ان کی نگاہ دوڑتی ہے۔ برہم کی آنکھیں ایسی ہی ہونی چاہیئے۔ ایشور کا کام نگاہ کو ساکت رکھنے سے نہ چلے گا۔ ہم آپ دھیان لگا کر بیٹھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایشور بھی دھیان لگا کر بیٹھ جائے تو پھر دنیا کا کیا حال ہو؟ اسی لئے بندروں میں رشیوں کو ہر ایک کی فکر رکھنے والی برہم کی آنکھیں دکھائی دیتا ہیں۔ باندروں میں پرماتما کے درشن کرنا سیکھ لو۔

اور وہ مور! مہاراشٹر میں مور بہت نہیں ہیں، لیکن گجرات میں ان کی کثرت ہے۔ میں گجرات میں تھا۔ روز دس بارہ میل گھومنے کی میری عادت تھی۔ گھومتے ہوئے مجھے مور دکھائی دیتے تھے۔ جب آسمان میں بادل چھا رہے ہوں، مینہ برسنے کی تیاری ہو، آسمان کا رنگ گہرا کالا ہو گیا ہو۔ تب مور اپنی بولی سناتا ہے۔ دل کی گہرائی سے نکلنے والی اس کی وہ تیز پکار ایک بار سنو تو معلوم ہو۔ ہمارا سارا علمِ موسیقی مور کی اس آواز پر ہی رچا گیا ہے۔ مور کی آواز ہی کھرج ہے۔ یہ پہلا "کھرج" ہمیں مور ہی سے ملا۔ پھر گھٹا بڑھا کر دوسرے سُر ہم نے بٹھائے۔ بادل کی طرف جمی ہوئی اس کی وہ نگاہ، اس کی وہ گہری آواز بادل کی وہ گڑگڑاہٹ سنتے ہی پھیلنے والی اس

کی دُم کی وہ چھتری آہا! چھتری کی اس خوبصورتی کے سامنے انسان کی ساری شان چُور چُور ہو جاتی ہے۔ راجہ مہاراجہ بھی سمجھتے ہیں، لیکن مور دم کی چھتری کے سامنے وہ کیا سجیں گے؟ کیا اس کا وہ خوب صورت نظارہ، وہ ہزارہا آنکھیں، وہ طرح طرح کی رنگ برنگی آب و تاب، وہ انوکھی خوب صورت لطیف و دلکش کاریگری، وہ عمدہ بیل بوٹے۔ ذرا دیکھئے تو اس چھتری کو اور اس پرماتما کو بھی دیکھئے! یہ ساری خلقت اسی طرح سجی ہوئی ہے۔ ہر جگہ پرماتما درشن دیتا ہوا کھڑا ہے۔ لیکن اسے نہ دیکھنے والے ہم بدنصیب ہیں۔ تکارام نے کہا ہے "پرکھو سرو تر ہے سوکال ، ابھاگی کو اکال ہی" یعنی سنتوں کے لئے ہر جگہ خوشحالی ہے۔ مگر ہم بدنصیبوں کے لئے ہر جگہ قحط ہے۔

ویدوں میں آگ کی پوجا کا ذکر کیا گیا ہے۔ آگ نارائن ہے۔ کیسی اس کی جلوہ افروز شکل ہے! دو لکڑیوں کی رگڑ سے وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ کیا معلوم پہلے کہاں چھپی ہوئی تھی! کتنی گرم اور کتنا پرنور! ویدوں کی جو پہلی آواز نکلی وہ اگنی پوجا کی تھی "اے اگنی! تیرے گن گاتا ہوں"........

جس آگ کی پوجا سے ویدوں کی ابتدا ہوئی اسکی طرف تم دیکھو۔ اس کی وہ لپٹیں دیکھنے سے مجھے جان اور روح کا اضطراب یاد آجاتا ہے۔ وہ شعلے، وہ لپٹیں چاہے گھر کے چولھے کی ہوں، چاہے جنگل میں درختوں کی رگڑ سے ہوں ، جس کا ہیرا گی کے گھر بار ہی نہیں ہوتا۔ وہ لپٹیں جہاں ہوں گی وہاں ان کی وہ دوڑ دھوپ شروع ہی ہے۔ وہ برابر بے قرار رہتی ہے۔ وہ شعلے اور بھی اوپر جانے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ سائنس داں کہیں کہ ایتھر کے سبب یہ شعلے جلتے ہیں، ہوا کے دباؤ سے حرکت پذیر ہیں۔ لیکن کم سے کم میرا مطلب یہ ہے کہ وہ اوپر جو بیرا تھا ہے وہ بکھر کجلی، وہ آفتاب، قدس، وہ سورج نارائن جو اوپر ہے اس سے ملنے کے

لئے وہ برابر اچھل رہے ہیں۔ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک ان کی یہ دوڑ دھوپ جاری رہتی ہے۔ سورج کُل ہے اور یہ شعلے اس کے جُز ہیں۔ جُز کُل کی طرف جانے کے لئے بیقرار رہتا ہے۔ وہ شعلے بجھ جائیں گے تبھی یہ دوڑ دھوپ بند ہوگی۔ ورنہ نہیں یہ خیال بھی ان کے من میں نہیں آتا کہ ہم سورج سے بہت فاصلہ پر ہیں۔ شعلے تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی طاقت بھر وہ زمین سے اوپر اچھلتے چلے جائیں۔ ایسی یہ آگ کیا ہے۔ گویا اس کی شکل میں ایک روشن پرگت ہی نمودار ہوگیا ہے۔ اسی لئے وید کی پہلی آواز ہوئی "اگنی میلے"

اور میں اس کوئل کو کیسے بھلاؤں؟ کیسے پکارتی ہے وہ؟ گرمیوں میں ندی نالے سوکھ گئے لیکن درختوں میں کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ وہ یہ تو نہیں پوچھتی کہ کس نے اسے یہ دولت عطا کی؟ کہاں ہے اس کا وہ عطیہ دینے والا؟ کیسی تیز اور شیریں وہ کوک؟ ہندو دھرم میں کوئل کے برت کا تو دستور ہی ہے۔ عورتیں برت لیتی ہیں کہ کوئل کی آواز سنے بغیر وہ کھانا نہیں کھائیں گی۔ یہ ورت کوئل میں نمودار پرماتما کا درشن کرنا سکھلاتا ہے۔ وہ کوئل کتنی دل کش کوک لگاتی ہے، گویا اُپ نشد ہی گاتی ہے۔ اس کی کوہو کوہو تو کانوں میں سنائی دیتی ہے۔ لیکن وہ خود دکھائی نہیں دیتی انگریز شاعر "ورڈس ورتھ" اس کے پیچھے پاگل ہو کر جنگل جنگل اس کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ انگلستان کا اتنا بڑا شاعر کوئل کو ڈھونڈتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں عام طور سے گھریلو عورتیں کوئل کو دیکھے بغیر کھانا نہیں کھاتیں۔ اس کوئل برت کی بدولت ہندوستانی عورتوں نے شاعر اعظم کا درجہ حاصل کر لیا۔ جو کوئل انتہائی مسرت کی شیریں آواز سناتی ہے وہ اس کی شکل میں۔ سندر پرماتما ہی ظاہر ہو رہا ہے۔

کوئل تو خوب صورت ہے ہی۔ اور وہ کوا کیا بُرا ہے؟ کوے کی بھی عزت کرو۔ مجھے تو وہ بہت پیارا ہے۔ اس کا وہ گہرا کالا رنگ، وہ

تیز آواز کیا وہ بُری آواز ہے؟ نہیں، وہ بھی میٹھی ہے۔ وہ بازو پھڑپھڑاتا ہوا آتا ہے، تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ چھوٹے بچوں کی طبیعت رجوع کرلیتا ہے۔ ننھا بچہ بند گھر میں کھانا نہیں کھاتا، باہر آنگن میں بیٹھ کر اسے کھلایا جاتا ہے اور چڑیا، کوے کو دکھا کر نوالا اس کے منہ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ کوّے سے محبت رکھنے والا بچہ کیا پاگل ہے؟ وہ پاگل نہیں ہے، اس میں گیان بھرا ہے۔ کوّے میں نمودار پرمیشور سے وہ بچہ فوراً ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ ماں چاول پر چاہے دہی ڈالے، چاہے دودھ چاہے شکر، اس بچے کو اس میں کوئی لطف نہیں۔ اسے مزہ ہے کوّے کے بازو پھڑپھڑانے میں۔ اس کے منہ پھلانے میں۔ مخلوقات میں چھوٹے بچوں کو جو اتنا مزہ آتا ہے، اسی بنیاد پر تو ایسپ کی اخلاقی کہانیاں ترتیب دی گئی ہیں۔ ایسپ کو سب جگہ خدا دکھائی دیتا تھا۔ پسندیدہ کتابوں کی فہرست میں میں ایسپ کی اخلاقی کہانیوں کو سب سے آگے رکھوں گا، بھولوں گا نہیں۔ ایسپ کے راج میں دو ہاتھوں اور دو پیروں والا یہ آدمی ہی اکیلا جاندار نہیں ہے، اس میں گیدڑ، کتّے، کوّے، ہرن، خرگوش، کچھوے، سانپ، کینچوے، سبھی بات چیت کرتے ہیں، چلتے ہیں۔ ایک عظیم انجمن ہی سمجھئے۔ ایسپ سے ساری مخلوق ہی بات چیت کرتی ہے۔ اسے خدائی دیدار نصیب ہو گیا ہے۔ رامائن بھی اسی حقیقت، اسی نظریہ کے تحت تخلیق کی گئی ہے۔ تلسی داس نے رام کی بال لیلا کا ذکر کیا ہے۔ رام آنگن میں کھیل رہے ہیں۔ ایک کوّا پاس آتا ہے۔ رام اسے آہستہ سے پکڑنا چاہتے ہیں۔ کوّا پیچھے پھدک جاتا ہے۔ آخر میں رام تھک جاتے ہیں۔ لیکن انھیں ایک ترکیب سوجھتی ہے۔ مٹھائی کا ایک ٹکڑا لے کر رام کوّے کے پاس جاتے ہیں۔ ٹکڑا تھوڑا آگے بڑھاتے ہیں۔ کوّا کچھ نزدیک آتا ہے۔ اس طرح کے ذکر میں تلسی داس کئی سطریں لکھ جاتے

ہیں، کیونکہ وہ کوّا پرمیشور ہے۔ کوّا بھی ایشور کی مورت کا ایک حصہ ہی ہے۔ رام اور کوّے کی وہ پہچان گویا پرماتما سے پرماتما کی ملاقات ہے۔

(۵۴) بُرے لوگوں میں بھی پرمیشور کا دیدار

خلاصہ یہ کہ اسی طرح اس ساری خلقت میں مختلف شکلوں میں پاک ندیوں، عالی شان پہاڑوں و گہرے سمندر کی صورتوں میں، پریمی گوماتا، عمدہ گھوڑے، بہادر شیر کی شکل میں، حسین مور اور صفائی و خلوت پسند سانپ کے روپ میں، بازو پھڑپھڑانے والے کوّے، دوڑ دھوپ کرنے والے شعلوں اور خاموش ستاروں کی ہیئت میں سب جگہ پرماتما سمایا ہوا ہے۔ آنکھوں کو اسے دیکھنے کی مشق کرائی ہے۔ پہلے موٹے اور آسان حروف، پھر باریک اور مُرکّب حروف سیکھنے چاہئیں۔ جب تک مُرکّب حروف نہیں سیکھیں گے، پڑھنے میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ مُرکّب حروف قدم قدم پہ آئیں گے۔ بدنفسوں میں بھی پرماتما کو دیکھنا سیکھنا چاہیئے۔ رام سمجھ میں آتا ہے، لیکن راون بھی سمجھ میں آنا چاہیئے۔ پرہلاد سمجھتا ہے، تو ہرنیہ کشیپو بھی سمجھنا چاہیئے۔ ویدوں میں کہا ہے "اُن ڈاکوؤں کے سرداروں کو نمسکار! اُن سنگ دِلوں کو، اُن خونیوں کو نمسکار! یہ ٹھگ، یہ چور، یہ ڈاکو، سب ہی برہم ہیں، اُن سب کو نمسکار!"

اس کا مطلب کیا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسان حروف تو سیکھ گئے، اب مشکل حرفوں کو بھی سیکھو۔ کارلائیل نے "ہیرو ورشپ" نامی ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں اس نے نپولین کو بھی ایک ہیرو کہا ہے۔ یہاں خالص پرماتما نہیں ہے، ملاوٹ ہے۔ لیکن اس پرمیشور کو بھی جذب کر لینا چاہیئے۔ اسی لئے تلسی داس نے راون کو رام کی مخالفت کرنے والا بھگت کہا ہے۔ ہاں اس بھگت کے رنگ ڈھنگ ذرا مختلف ہیں۔ آگ سے جل جانے پر پاؤں سوج جاتا ہے، لیکن سوجن پر سینک کرنے سے وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

"دونوں جگہ تپش ایک ہی ہے، مگر مظاہرہ جدا جدا ہے۔ رام اور راون میں بظاہر جداگانہ دکھائی دیا، تو بھی وہ ایک ہی پرمیشور کا۔

کثیف اور لطیف، سادے اور مرکب، آسان اور پیچیدہ حروف سب سیکھو اور آخر میں یہ محسوس کرو کہ پرمیشور کے بغیر کوئی جگہ نہیں ہے۔ ذرّہ ذرّہ میں وہی جلوہ گر ہے۔ چیونٹی سے لے کر سارے برہمانڈ تک سب جگہ ایشور ہی سمایا ہوا ہے۔ سب کی یکساں فکر رکھنے والا مخزنِ علم، رحیم، شفیق، قادرِ مطلق، پاک اور جمیل پرمیشور ہمارے چاروں طرف ہر جگہ اور ہر طرف کھڑا ہے۔

اتوار، ۲۴-۴-۳۲

گیارہواں باب

دیدارِ خدا یہ شکلِ کائنات

(۵۵) اُسے دیکھنے کی ارجن کی شدید خواہش

بھائیو! پچھلی بار ہم نے اس بات کی مشق کی کہ اس کائنات کی بے شمار چیزوں میں سمائے ہوئے پرماتما کو ہم کیسے پہچانیں اور ہماری آنکھوں کو جو عظیم نمائش نظر آتی ہے، اسے اپنے میں کیسے جذب کریں۔ پہلے موٹے، پھر لطیف، پہلے سادے پھر مرکب، اس طریقے سے سب چیزوں میں بھگوان کو دیکھیں۔ اس کا دیدار حاصل کریں۔ دن رات مشق کر کے ساری کائنات کو ایشور کے روپ دیکھنا سیکھیں۔ یہ ہم نے پچھلے باب میں دیکھ لیا۔

آج گیارہویں باب پر نظر ڈالنی ہے۔ اس باب میں بھگوان نے اپنا کھلا روپ دکھا کر ارجن پر اپنی انتہائی عنایت فرمائی ہے۔ ارجن نے بھگوان سے کہا۔ "پربھو، میں آپ کا وہ مکمل روپ دیکھنا چاہتا ہوں، جس میں آپ کا سارا عظیم ترین جلال ظاہر ہوا ہو۔ وہ روپ مجھے آنکھوں سے دیکھنے کو ملے۔" ارجن کی یہ درخواست ساری کائنات کو بیک وقت دیکھنے کی تھی۔

ہم "کائنات" اور "عالم" ان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ "عالم" کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے کو بھی ہم سمجھ نہیں پاتے۔ ساری

کائنات کے لحاظ سے دیکھیں، تو یہ عالم جو ہمیں اتنا وسیع دکھائی دیتا ہے، انتہائی حقیر معلوم ہوگا۔ رات کے وقت آسمان کی طرف ذرا نگاہ گئی، تو بے شمار گولے نظر آتے ہیں۔ صحن فلک کی وہ رنگ آمیزیاں، وہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت پھول۔ وہ ٹمٹمانے والے لاکھوں تارے۔ ان سب کی ہیئت آپ جانتے ہیں؟ بظاہر چھوٹے چھوٹے نظر آنے والے یہ تارے بہت ہی بڑے ہیں۔ ان کے اندر لاتعداد سورج سما سکتے ہیں۔ یہ رسیلے، چمکیلے اور جلتے ہوئے مادّو نکے گولے ہیں۔ ایسے ان بے شمار گولوں کا حساب کون لگا سکے گا؟ نہ ان کی حد ہے، نہ پار۔ خالی آنکھوں سے ہی یہ ہزاروں دکھائی دیتے ہیں۔ دوربین سے دیکھیں، تو کروڑوں دکھائی دیتے ہیں اس سے بھی بڑی دوربین ہو، تو سنکھیا سنکھ نظر آئیں گے اور یہ سمجھ میں آنا مشکل ہوجائے گا کہ آخر اس کی انتہا کہاں ہے۔ یہ جو بے پایاں کائنات اوپر نیچے سب جگہ پھیلی ہوئی ہے، اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا "عالم" کہلاتا ہے۔ لیکن یہ عالم بھی کتنا لمبا چوڑا دکھائی پڑتا ہے!

یہ عظیم اور وسیع کائنات پرمیشور کے روپ کا ایک پہلو ہے۔ اب دوسرا پہلو دیکھو۔ وہ ہے کال (زمانہ)۔ اگر ہم گذشتہ زمانہ پر نظر ڈالیں تو تاریخ کی حد میں زیادہ سے زیادہ دس ہزار سال تک پیچھے جا سکیں گے۔ اس سے پیشتر کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ تاریخ کی انتہائی میعاد دس ہزار سال کی اور خود ہماری زندگی کی مدت تو مشکل سے سو سال ہے۔ درحقیقت زمانے کی نہ ابتدا ہے، نہ انتہا ہے۔ کتنا زمانہ گذرا ہے، اس کا کوئی حساب نہیں ہے۔ آگے کتنا زمانہ باقی ہے، اس کا کوئی قیاس نہیں۔ ہمارا عالم جیسے کائنات کے مقابلہ میں بالکل حقیر ہے، ویسے ہی تواریخ کے یہ دس ہزار سال زمانہ لامحدود کے مقابلہ میں بالکل بے وقعت ہیں۔ ماضی کی ابتدا نہیں، تو مستقبل کی بھی

انتہا نہیں۔ یہ چھوٹا سا زمانہ حال بات کرتے کرتے ماضی میں چلا جاتا ہے۔ زمانہ حال دراصل کہاں ہے، یہ بتانے لگتے ہیں، تب وہ ماضی میں چھپ جاتا ہے۔ ایسا بے انتہا چنچل یہ لمحہ بھر کا زمانہ حال ہے۔ میں ابھی بول رہا ہوں، لیکن لفظ منہ سے نکلا نہیں کہ وہ ماضی میں غائب ہوگیا۔ اس طرح یہ زمانہ کا بحرِ عظیم مسلسل رواں دواں ہے۔ نہ اس کے منبع کا پتہ ہے، نہ اس کے مخرج کا۔ بیچ کا بہاؤ میں ذرا سا دکھائی دیتا ہے۔

اس طرح ایک طرف کائنات کی بے پناہ وسعت ہے تو دوسری طرف زمانہ کی زبردست روانی۔ ان دونوں کے لحاظ سے اگر خلقت کی طرف دیکھیں، تو سمجھ جائیں گے کہ چاہے قیاس کو کتنا ہی طول دیں، پھر بھی اس کی حد نہیں آسکتی۔ ارجن کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ تینوں زمان و مکاں میں ماضی، حال اور مستقبل میں، نیچے اوپر اور یہاں وہاں سب جگہ محیط اور عظیم پرمیشور ایک ساتھ اور یک بارگی دکھائی دے۔ پرمیشور کا اس روپ میں دیدار ہو۔ اس خواہش کے ضمن میں یہ گیارہواں باب ظہور پذیر ہوا ہے۔

ارجن بھگوان کو بہت ہی پیارا تھا۔ کتنا پیارا تھا؟ دسویں باب میں یہ بتاتے ہوئے کہ کون کن شکلوں میں میرا دھیان کرو۔ بھگوان کہتے ہیں۔ "پانڈوں میں جو ارجن ہے، اس کی شکل میں میرا دھیان کرو"۔ شری کرشن کہتے ہیں۔ "پانڈوؤں میں میں ارجن ہوں"۔ اس سے زیادہ پریم کا پاگل پن اور محبت کا جنون کہاں ہوگا؟ یہ بات اس کی ایک مثال ہے کہ پریم کتنا پاگل ہو سکتا ہے! ارجن سے بھگوان کو بے انتہا محبت تھی۔ یہ گیارہواں باب اسی محبت کی برکت ہے۔ ارجن کی خواہشِ دیدارِ خدا کو بھگوان نے اسے چشمِ عرفان عطا کرکے پورا کیا۔ انھوں نے ارجن کو محبت کے عطیہ سے نوازا۔

(۵۶) چھوٹی شکلوں میں بھی کامل دیدار ممکن ہے

اُسی ایشوری روپ کا خوبصورت و شاندار تذکرہ اس باب میں کیا گیا ہے۔
اگرچہ یہ بات سچ ہے، تو بھی اس کائنات کے متعلق مجھے کوئی خاص ہوس نہیں
میں چھوٹی سی شکل پر ہی مطمئن ہوں۔ جو چھوٹا سا سُندر روپ مجھے نظر
آتا ہے، اس کی خوب صورتی کا احساس کرنا میں سیکھ گیا ہوں۔ پرمیشور مختلف ٹکڑوں
میں منقسم نہیں ہے۔ مجھے ایسا نہیں لگتا کہ پرمیشور کا جو روپ ہم دیکھتے ہیں، وہ اس کا
ایک ٹکڑا ہے اور باقی پرمیشور اس سے کہیں باہر ہے۔ بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ جو پرمیشور
اس وسیع اور عظیم کائنات میں سمایا ہوا ہے، وہی ہو بہو مکمل طور پر ایک چھوٹی سی
مورت میں، مٹی کے ایک ذرّہ میں بھی سمایا ہوا ہے اس میں کوئی کمی نہیں۔ امرت کے
سمندر میں جو مٹھاس ہے، وہی اس کی ایک بوند میں بھی ہوتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ
امرت کی ایک چھوٹی سی بوند مجھے مل گئی ہے۔ اس کی مٹھاس میں چکھتا ہوں۔ امرت
کی مثال میں نے جان بوجھ کر دی ہے، پانی یا دودھ کی نہیں۔ ایک پیالہ دودھ
میں جو ذائقہ ہے، وہی ایک لوٹے بھر دودھ میں ہوگا۔ لیکن ذائقہ چاہے وہی ہو،
مگر اتنا ہی طاقت بخش نہیں ہو سکتا۔ ایک بوند دودھ کے مقابلہ میں ایک پیالہ دودھ
میں طاقت زیادہ ہے۔ لیکن امرت کی مثال میں یہ بات نہیں ہے۔ امرت کے سمندر
کی مٹھاس اس کے ایک قطرہ میں بھی ہے۔ مگر اس کے علاوہ وہ اتنا ہی طاقت بخش
بھی ہے۔ بوند بھر امرت بھی اگر گلے کے نیچے اتر گیا، تو اس سے حیاتِ ابدی ہی ملے گی۔

اسی طرح جو نورانیت، جو پاکیزگی پرمیشور کے بہت بڑے روپ میں ہے،
وہی ایک چھوٹی سی مورت میں بھی ہے۔ اگر ایک مٹھی بھر گیہوں مجھے بطور نمونہ
دئیے جائیں اس سے اگر مجھے گیہوں کی پہچان نہ ہوئی، تو پھر بوری بھر گیہوں
بھی اگر میرے سامنے رکھ دئیے جائیں، تو پہچان کیسے ہو جائے گی؟ چھوٹے ایشور کا

جو نمونہ میری آنکھوں کے سامنے ہے، اس سے اگر پرمیشور کو میں نے نہیں پہچانا، تو پھر پرمیشور کا بہت بڑا روپ دیکھ کر بھی اسے کیسے پہچان لوں گا۔ چھوٹے بڑے کا سوال ان میں کیا؟ چھوٹے روپ کو پہچان لیا، تو بڑے کی پہچان ہو ہی گئی۔ اس لئے مجھے یہ ہوس نہیں ہے کہ ایشور اپنا بڑا روپ مجھے دکھائے۔ ارجن کی طرح کائناتی شکل کی، دیدار طلبی، کی اہلیت بھی مجھ میں نہیں ہے۔ پھر ایسی بات بھی نہیں ہے کہ جو کچھ مجھے نظر آتا ہے، وہ کائناتی شکل ایشور کا کوئی ٹکڑا ہے۔ کوئی شخص کسی تصویر کا ٹوٹا ٹکڑا لے کر آئے، تو اس سے ساری تصویر کا خیال بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن پرماتما اس قسم کے ٹکڑوں سے نہیں بنا ہے۔ پرماتما نہ ٹوٹا ہوا ہے، نہ منقسم ہے۔ ایک چھوٹی سی شکل میں بھی وہ بے پایاں پرمیشور کل کا کل سمایا ہوا ہے۔ چھوٹے فوٹو اور بڑے فوٹو میں کیا فرق ہے؟ جو باتیں بڑے فوٹو میں ہوتی ہیں، وہی سب ہو بہو چھوٹے فوٹو میں بھی ہوتی ہیں۔ چھوٹا فوٹو بڑے فوٹو کا ٹکڑا نہیں ہے۔ چھوٹے ٹائپ کے حروف ہوں، تو بھی وہی مطلب ہوگا اور بڑے ٹائپ کے ہوں، تو بھی وہی۔ ایسی بات نہیں کہ بڑے ٹائپ سے بڑا مطلب نکلے اور چھوٹے سے چھوٹا۔

یہی طرز تصور مورت کی پوجا کی بنیاد ہے۔ مورتی پوجا پر اب تک بہت لوگوں نے حملے کئے۔ باہر نیز یہاں کے بھی کچھ مفکروں نے مورت پوجا کو عیب تبلایا ہے۔ لیکن جتنا ہی میں غور کرتا ہوں، اسی قدر مورتی پوجا کی عظمت میرے سامنے بدیہی واضح ہو جاتی ہے۔ مورت پوجا کا مطلب کیا ہے؟ ایک چھوٹی سی چیز کے ذریعہ ساری کائنات کو محسوس کرنے کی حکمت مورت پوجا ہے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ساری کائنات کو دیکھنے کی تعلیم حاصل کرنا، کیا یہ بات غلط ہے؟ یہ محض تصور نہیں کھلے تجربہ کی بات ہے۔ بہت بڑے روپ میں جو کچھ ہے، وہی سب ایک چھوٹی سی مورت میں ہے۔ وہی ایک مٹی کے ذرہ میں ہے۔ اس مٹی کے ڈھیلے

کے اندر آم، کیلا، گیہوں، سونا، چاندی، تانبا سب ہی کچھ ہے۔ ساری کائنات اس ذرّہ کے اندر ہے۔ جس طرح کسی چھوٹی ناٹک منڈلی میں وہی ایکٹر بار بار مختلف بھیس بنا کر اسٹیج پر آتے ہیں، اسی طرح پرمیشور کو سمجھو۔ جیسے ایک ڈرامہ نویس خود ہی ایک ڈرامہ لکھتا ہے اور خود ہی ناٹک میں کام بھی کرتا ہے، اسی طرح پرماتما بھی بے شمار ناٹک لکھتا ہے اور خود بے شمار ایکٹروں کی شکل میں سج کر اسٹیج پر تماشہ کرتا ہے۔ اس لامحدود ناٹک کے ایک ایکٹر کو پہچان لیا، تو گویا سارے ایکٹروں کو پہچان لیا۔

شاعری کی تشبیہ اور مثال کے لئے جو وجہ جواز ہے، وہی مورت پوجا کے لئے بھی ہے۔ کسی گول چیز کو ہم دیکھتے ہیں، تو ہمیں لطف آتا ہے، کیونکہ اس میں ایک ترتیب ہوتی ہے۔ ترتیب ایشور کا سروپ ہے۔ خدا کی خلقت سرتاپا خوبصورت ہے۔ اس میں نظم و ترتیب ہے۔ وہ گول چیز یعنی ایشور کی ترتیب دادہ مورت ہے۔ لیکن جنگل خودرو ترچھے ٹیڑھے پیڑ بھی ایشور کی ہی مورت ہیں۔ اس میں ایشور کی مطلق العنانی ہے۔ اس پیڑ کو کوئی پابندی نہیں۔ ایشور کو کون پابندیوں میں جکڑے گا؟ پابندیوں سے مبّرا پرمیشور اس ٹیڑھے میڑھے پیڑ میں موجود ہے۔ کوئی سیدھا سادہ کھمبا دیکھتے ہیں، تو اس میں ایشور کی یکتائی نظر آتی ہے۔ نقاشی دار کھمبا دیکھیں تو اس میں آسمان میں ستارے کے جیسا بوٹے بنانے والا پرمیشور دکھائی دیتا ہے۔ کسی کٹے چھٹے ترتیب دیئے ہوئے باغ میں اعتدال رکھنے والے پرمیشور کا معتدل روپ دکھائی دیتا ہے تو کسی بڑے جنگل میں ایشور کی عظمت اور خود مختاری کے درشن ہوتے ہیں۔ جنگل میں بھی لطف ملتا ہے اور آراستہ و پیراستہ باغ میں بھی۔ تو پھر کیا ہم پاگل ہیں؟ نہیں، لطف دونوں میں ہی ملتا ہے، کیونکہ ایشوری وصف ہر ایک میں ظاہر ہوا ہے۔ چکنے سالگرام

کی ہڈّی میں جو جلوہ ہے، وہی نربدا کی ایک ناہموار شنکر کی ہڈّی میں ہے۔ اس لئے اگر وہ عظیم ہیئت علیحدہ نہ بھی دکھائی دے، تو مضائقہ نہیں۔

پرمیشور سب جگہ مختلف چیزوں میں مختلف خوبیوں کے ذریعہ ظاہر ہوا ہے۔ اور اسی سے ہمیں لطف ملتا ہے۔ اس چیز میں یگانگت ظاہر ہوتی ہے۔ جو مسرت حاصل ہوتی ہے، وہ بلا وجہ نہیں ہے۔ مسرت ہوتی کیوں ہے؟ اس سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ہوتا ہے۔ اسی سے مسرّت ہوتی ہے۔ بچہ کو دیکھتے ہی ماں کا دِل اچھلنے لگتا ہے، کیونکہ وہ رشتہ کو پہچانتی ہے۔ اسی طرح ہر چیز سے پرماتما کا ناتہ جوڑو۔ مجھ میں جو ایشور ہے، وہی اس چیز میں ہے، اس طرح تعلق بڑھانا ہی آنند بڑھانا ہے۔ آنند کی اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ آپ پریم کا ناتہ سب جگہ جوڑنے لگئے، پھر دیکھئے، کیا معجزہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس بے پایاں کائنات میں سمایا ہوا پرماتما ذرہ ذرہ میں دکھائی دے گا۔ ایک بار ایسی قوت باصرہ حاصل ہو جائے، تو پھر کیا کہنا! لیکن اس کے لئے اندریوں کو مشق ارتقاء، پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ خواہش عیش و عشرت ترک کر کے جب ہم پریم کی پاک نظر حاصل کر لیں گے، تو پھر ہر چیز میں ہمیں ایشور ہی دکھائی دے گا۔ اپنشدوں میں اس کا بہت عمدہ ذکر آیا ہے۔ آتما کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟ کیا رنگ بتایا جائے؟ رشی پریم بھرے الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ جو لال لال ریشم سا ملائم کیڑا بیربہوٹی ہے، اسی طرح آتما کا روپ ہے۔ اس کیڑے کو دیکھتے ہیں، تو کتنا آنند ہوتا ہے۔ یہ آنند کیوں ہوتا ہے، میرا اپنے لئے جو خیال ہے، وہی اس بیربہوٹی میں ہے۔ مجھ سے اس کا کچھ سروکار نہیں ہوتا، تو کیا آنند ہوتا؟ میرے اندر جو سمندر آتما ہے، وہی بیربہوٹی میں بھی ہے۔ اسی لئے اس کی تشبیہ دی۔ تشبیہ کیوں دیتے ہیں؟ اس سے آنند کیوں ہوتا ہے؟ ہم تشبیہ اسی لئے دیتے ہیں کہ ان دو چیزوں میں یکسانی ہوتی ہے اور اسی سے آنند ہوتا ہے۔ اگر وہ دونوں ایک

دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ ہوں، تو آنند نہیں آئے گا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ نمک مرچ کی طرح ہے، تو ہم اسے پاگل کہیں گے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ تارے پھول کی طرح ہیں، تو ان میں مناسبت دکھائی دینے سے آنند ہوگا۔ نمک مرچ کی طرح ہے، ایسا کہنے سے ہتائی کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کسی کی نگاہ اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ جو پرماتما نمک میں ہے، وہی مرچ میں ہے، ایسا درشن جس کو ہوا ہے وہ "نمک کیسا ہے، تو مرچ کی طرح" اس قول میں بھی لطف کا احساس کرلے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایشور کا روپ ہر شے میں لبالب بھرا ہوا ہے۔ اس کے لئے بہت بڑے جلوے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۵۷) عظیم کائناتی شکل ہضم بھی نہیں ہوگی

پھر اتنے بڑے جلوہ کی تاب بھی کیسے لاسکوں گا؟ ادنیٰ یا وصف لطیف وخوبصورت شکل کے لئے مجھے جو پریم معلوم ہوتا ہے، جو یگانگت محسوس ہوتی ہے، جو لطف آتا ہے، اس کا احساس کائناتی شکل دیکھنے میں شاید نہ ہو۔ یہی حالت ارجن کی ہو گئی۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے آخرکار کہتا ہے — "بھگوان! اپنا وہی پہلے والا دِل کش روپ دکھلائیے۔" ارجن اپنے ذاتی تجربہ سے کہتا ہے کہ بہت بڑا روپ دیکھنے کی خواہش نہ کرو۔ ایشور جو ہر سو زماں و مکاں میں سمایا ہوا ہے، یہی اچھا ہے۔ وہ تارا سمٹ کر دہکتا ہوا گولا بن کر اگر میرے سامنے آکھڑا ہو جائے تو میری کیا حالت ہو گی؟ یہ تارے کتنے پرسکون دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا اتنی دوری سے مجھ سے بات کر رہے ہیں۔ لیکن آنکھوں کو تراوٹ بخشنے والا وہی تارا اگر نزدیک آجائے تو؟ وہ دہکتی ہوئی آگ ہی ہے۔ میں جل کر خاک ہو جاؤں گا۔ ایشور کی یہ لامحدود کائنات جہاں ہے، وہاں ویسے ہی رہنے دیجئے۔ ان سب کو ایک کمرے میں اکٹھا کر دینے

میں کیا مزہ ہے۔ بمبئی کے کبوتر خانے میں ہزارہا کبوتر رہتے ہیں۔ وہاں انھیں کیا آزادی حاصل ہے؟ وہ نظارہ بڑا ناخوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ مزہ اسی میں ہے کہ یہ کائنات اوپر نیچے اور یہاں تین حصوں میں منقسم ہے۔ جو بات دنیائے مکانی کے لئے لاگو ہے، وہی دنیائے زمانی کے لئے بھی۔ ہمیں زمانۂ ماضی کی یاد نہیں رہتی اور مستقبل کا علم نہیں ہوتا۔ اس میں ہماری بہبودی ہے۔ قرآن شریف میں پانچ ایسی چیزیں بتائی گئی ہیں جن میں صرف پرمیشور کی قدرت ہے۔ انسانی مقدرت ان میں بالکل نہیں ہے۔ ان میں ایک ہے علمِ مستقبل۔ ہم اندازہ ضرور لگاتے ہیں، لیکن اندازہ کا مطلب گیان نہیں ہے۔ مستقبل کا جو علم ہمیں نہیں ہوتا، اس میں ہماری بھلائی ہے۔ اسی طرح زمانہ ماضی کی جو یاد ہمیں نہیں رہتی، یہ بھی فی الحقیقت بڑی اچھی بات ہے۔ کوئی شریر اگر شریف بن کر میرے سامنے آئے، تو اس کے زمانۂ ماضی کی یاد سے میرے دل میں کوئی عزت اس کے لئے نہ ہوگی۔ وہ کتنا ہی کہے اس کے پچھلے گناہوں کو یکایک فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سنسار اس کے گناہوں کو اس حالت میں بھول سکے گا، جبکہ وہ آدمی مر کر دوسری شکل میں ہمارے سامنے آئے گا۔

پچھلی یاد سے خرابیاں بڑھتی ہیں۔ اگر پیشتر کا یہ سارا گیان ہی ختم ہو گیا، تو پھر سب ختم۔ نیکی بدی کو بھول جانے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیئے۔ وہ تدبیر ہے موت۔ جب ہمارے لئے اس زندگی کی تکلیفیں ناقابلِ برداشت ہیں، تو پھر پچھلے جنم کے کوڑے کرکٹ کی تلاش کیوں کریں؟ اپنی موجودہ زندگی کے مکان میں کیا کچھ کم کوڑا کرکٹ ہے؟ اپنا بچپن بھی ہم بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ یہ فراموشی مفید ہی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے ماضی کے واقعات کو بھول جانا ہی ایک بہترین طریقہ ہے۔ اورنگ زیب نے بڑا ظلم ڈھایا، اس کو کب تک رٹتے رہو گے؟

گجراتی میں رتن بائی کا ایک گر یا گیت ہے۔ اسے ہم اکثر یہاں سنتے ہیں۔ اس کے آخر میں کہا گیا ہے " دنیا میں ہر ایک کی نیک کرداری ہی آخر میں باقی رہ جائے گی۔ پاپ کو لوگ بھول جائیں گے۔ زمانہ خود چھانتا جا رہا ہے۔" تاریخ میں جس قدر اچھا ہو اتنا لے لینا چاہیئے، جو برا ہو، اسے پھینک دینا چاہیئے۔ آدمی اگر برائی کو چھوڑ کر صرف اچھائی کو ہی یاد رکھے، تو کیا بہار ہو! لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے بھولنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایشور نے موت کی تخلیق کی ہے۔

غرض یہ کہ یہ عالم جیسا ہے ویسا ہی مبارک ہے۔ اس دنیائے زماں و مکاں کو ہر جگہ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ تعارف میں مزہ نہیں ہے۔ کچھ چیزوں سے رابطہ بڑھانا ہوتا ہے، تو کچھ چیزوں سے دور رہنا پڑتا ہے۔ استاد کے سامنے ادب سے دور بیٹھیں گے، لیکن ماں ہوگی تو گود میں جا بیٹھیں گے۔ جس ہستی کے ساتھ جیسا برتاؤ کرنے کی ضرورت ہو، ویسا ہی کرنا چاہیئے۔ پھول کو ہاتھ میں لیں، مگر آگ سے بچ کر رہیں۔ تارے دوری سے سندر لگتے ہیں۔ یہی حال خلقت کا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ بہت دور کی خلقت بہت نزدیک لانے سے ہمیں زیادہ آنند ہوگا۔ جو چیز جہاں ہے، اسے وہیں رہنے دینے میں لطف ہے۔ جو چیز دور سے دلکش معلوم ہوتی ہے، نزدیک لانے سے بھی دلکش معلوم ہوگی، ایسا نہیں کہہ سکتے۔ وہیں دور رکھ کر اس کے رس کو چکھنا چاہیئے۔ بے غیرت بن کر بہت رابطہ بڑھا کر زیادہ تعارف سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ تینوں زمانے ہمارے سامنے کھڑے نہیں ہیں، یہی اچھا ہے۔ ایسا نہیں کہہ سکتے کہ تینوں زمانوں کا علم ہو جانے سے لطف و شادمانی میسر ہی ہو جائے گی۔ ارجن نے محبت سے مجبور ہو کر پر اصرار التجا کی تو بھگوان نے اسے منظور کر لیا۔ انھوں نے اسے اپنی وہ کائناتی شکل دکھائی، لیکن مجھے تو بھگوان کا

چھوٹا سا روپ ہی کافی ہے۔ یہ چھوٹا روپ پرمیشور کا ٹکڑا تو ہے نہیں اور اگر ٹکڑا بھی ہو، تو اس بے پایاں اور عظیم ہستی کا ایک پیر یا پیر کی ایک انگلی ہی اگر مجھے دکھائی دے، تو بھی میں کہوں گا "زہے قسمت!" تجربہ سے میں نے یہ سیکھا ہے۔ جمنا لال جی نے جب وردھا میں لکشمی نارائن کا مندر ہریجنوں کے لئے کھول دیا، تو اس وقت میں درشن کے لئے گیا تھا۔ ۱۵ یا ۲۰ منٹ تک میں اس روپ کو دیکھتا رہا۔ محویت کی سی کیفیت ہونے لگی۔ بھگوان کا وہ منھ، وہ سینہ، وہ ہاتھ دیکھتے دیکھتے پاؤں تک پہنچا اور آخر میں چرنوں تک جاکر نگاہ جم گئی۔ " مدھر تیری چرن سیوا"۔ یہی تصور آخر میں رہ گیا۔ اگر چھوٹے سے روپ میں وہ بڑا سا پرمیشور نہ سما جاتا ہو، تو پھر اس عظیم ہستی کے قدموں کا دیدار ہی کافی ہے۔ ارجن نے ایشور سے التجا کی۔ اس کا حق بڑا تھا۔ اس کا کتنا اختلاط، کتنا پریم، کتنا مشفقانہ جذبہ تھا۔ میری اہلیت کیا۔ میری حد تو صرف چرنوں ہی تک ہے۔ میرا حق اتنا ہی ہے۔

(۵۸) سب کا نچوڑ

اس پرمیشور کی نورانی ہیت کا جو ذکر ہے، اس میں عقل دوڑانے کی مجھے خواہش نہیں۔ اس میں عقل دوڑانا گناہ ہے۔ اس سنسار روپ کے ذکر سے ان پاک اشلوکوں کو پڑھتے رہیں اور پاک بنیں۔ یہ مجھے نہیں بھاتا کہ عقل کو دخل دے کر پرمیشور کے اس روپ کے ٹکڑے کئے جائیں۔ وہ بڑی خوفناک عبادت ہو جائے گی۔ جیسے اگھور پنتھی لوگ اشمشان میں جاکر مردے چیرتے اور تنتر پوجا کرتے ہیں، ایسا ہی وہ عمل ہو جائے گا۔ پرمیشور کی وہ نورانی شکل "جس کے چاروں طرف آنکھیں ہیں اور جس کے چاروں طرف ہاتھ اور پاؤں ہیں" ایسی وہ وسیع، عظیم و لامحدود ہیئت جن اشلوکوں میں

اس کا ذکر ہے، انھیں گلا کر اپنے من کو پاک اور بے گناہ بنائیں۔

پرمیشور کے اس سارے تذکرہ میں صرف ایک ہی جگہ عقل سوچنے لگتی ہے۔ پرمیشور ارجن سے کہتے ہیں "ارجن یہ سب مرنے ہی والے ہیں، تو محض آلۂ کار بن، کرنے دھرنے والا تو سب کچھ میں ہوں۔ یہی صدا دِل میں گونجتی رہتی ہے۔ جب یہ خیال من میں آتا ہے کہ ہمیں ایشور کے ہاتھ کا ایک اوزار بننا ہے تو عقل سوچنے لگتی ہے کہ کیا اس کے ہاتھ کی مُرلی بنوں؟ وہ اپنے ہونٹ سے مجھے لگا لیں اور میٹھے سُر نکالیں۔ مجھے بجانے لگیں۔ یہ کیسے ہوگا؟ مرلی بننا یعنی کھوکھلا بننا۔ مگر مجھ میں تو برائیاں اور خواہشات ٹھسا ٹھس بھری ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں مجھ میں سے میٹھا سُر کیسے نکلے گا؟ میرا سُر تو ہے بھدّا۔ میں تو ایک ٹھوس بھری ہوئی شے ہوں۔ مجھ میں انانیت بھری ہوئی ہے۔ مجھے انانیت سے مبّرا ہونا چاہیئے۔ جب میں مکمل طور سے مبّرا اور کھوکھلا ہو جاؤں گا، تب ہی پرمیشور مجھے بجائے گا۔ مگر پرمیشور کے ہونٹوں کی مُرلی بننا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اگر اس کے پیروں کی جوتیاں بننا چاہوں، تو بھی وہ آسان نہیں۔ وہ ایسی ملائم جوتی ہونی چاہیئے کہ پرمیشور کے پاؤں میں ذرا بھی چھالے نہ پڑیں۔ پرمیشور کے پاؤں اور کانٹے کنکروں کے بیچ میں مجھے پڑ جانا ہے۔ مجھے اپنے کو کمانا ہوگا۔ اپنی کھال اتار کر اسے ہمیشہ کماتے رہنا ہوگا ملائم بنانا ہوگا۔ اس لئے پرمیشور کے پاؤں کی جوتی بننا بھی آسان نہیں ہے۔ پرمیشور کے ہاتھ کا اوزار بننا ہو، تو مجھے دس سیر وزن کے لوہے کا گولا نہیں بننا چاہیئے، ریاضت کی سان پر اپنے کو چڑھا کر تیز دھار لانی ہوگی۔ ایشور کے ہاتھ میں میری زندگی کی تلوار چمکنی چاہیئے۔ یہ کیفیت ہمیشہ میرے ذہن میں گونجنے لگتی ہے۔ بھگوان کے ہاتھ کا ایک اوزار بننا ہے،

اسی خیال میں محو ہو جاتا ہوں۔ اب وہ کیسے ہو؟ اس کی تدبیر خود بھگوان نے آخری اشلوک میں بتا دی ہے۔ شری شنکراچاریہ نے اپنی تفسیر میں اس اشلوک کو "سروارتھ سار" ساری گیتا کا نچوڑ کہا ہے۔ وہ کون سا شلوک ہے؟ وہ یہ ہے ــــ

"اے پانڈو! جو سب کرم مجھے سونپتا ہے، مجھ میں سمایا رہتا ہے، میرا بھگت بنتا ہے، خواہشات کو ترک کرتا ہے اور تمام مخلوق سے بیر نہیں رکھتا ہے، وہ مجھے پاتا ہے۔"

جس کا سنسار میں کسی سے بیر نہیں، تو غیر جانب دار رہ کر دنیا کی بے لوث خدمت کرتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے، مجھے نذر کر دیتا ہے، وہ میری بھگتی سے شرابور ہے۔ جو بھگت معاف کرنے والا، بے لوث، بے تعلق اور محبت سے بھرپور ہے، وہ پرمیشور کے ہاتھ کا اوزار بنتا ہے۔ بس یہی ساری گیتا کا نچوڑ ہے۔

اتوار ۱ـ۵ـ۳۲

بارہواں باب

سگن اور نرگن بھگتی

(۵۹) باب ۶ سے ۱۱ : یکسوئی سے ہمہ گیری

گنگا کا پانی یوں تو سبھی جگہ مقدس اور پاک ہے، لیکن ہردوار، کاشی، پریاگ جیسے مقامات زیادہ متبرک ہیں، جنھوں نے سارے عالم کو پاک کر دیا ہے بھگوت گیتا کا بھی حال ہے۔ یہ شروع سے آخر تک سبھی جگہ پاک ہے، لیکن بیچ میں کچھ باب ایسے ہیں جو زیارت گاہ بن گئے ہیں۔ آج جس باب کے متعلق ہمیں کہنا ہے وہ بہت متبرک تیرتھ کے جیسا بن گیا ہے۔ خود بھگوان اسے امرت دھارا کہتے ہیں۔

"جو اس امرت دھارا کو پا لیتے ہیں۔" ہے تو یہ چھوٹا سا بیس اشلوکوں کا باب، لیکن امرت کی دھارا ہے۔ اور امرت کی طرح شیریں اور حیات بخش بھی ہے۔ اس باب میں بھگوان نے اپنی زبان سے بھگتی رس کی عظمت اور حقیقت کا ذکر کیا ہے۔

درحقیقت چھٹے باب سے بھگتی کے فلسفہ کا بیان شروع ہو گیا ہے۔ پانچویں باب کے آخر تک جیون شاستر (علم زندگی) کے متعلق کہا گیا ہے فرائض منصبی کی ادائیگی، اس کی مدد کے لئے وِکرم (جذبۂ عمل) اور

ان دونوں کے عمل سے ہمارے کرموں کو مٹا دینے والی آخری اکرم کی سرزمین نے اتنی باتوں پر بحث شروع کے پانچ بابوں میں کی گئی۔ یہاں تک علم زندگی کی تکمیل ہوئی۔ چھٹے باب سے گیارہویں کے آخر تک بھگتی کے اصول کا ہی ذکر رہا۔ یکسوئی قلب سے ابتدا ہوئی۔ چھٹے باب میں یہ بتایا گیا کہ یکسوئی قلب کیسے حاصل ہو سکتی ہے، اس کے حصول کے کیا ذرائع ہیں اور اس کی کیوں ضرورت ہے؟ گیارہویں باب میں ہمہ گیری بتائی گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یکسوئی سے لے کر ہمہ گیری تک کی طویل منزل ہم نے کیسے طے کی؟

یکسوئی قلب سے ابتدا ہوئی۔ یکسوئی ہو جانے پر کسی بھی مسئلہ پر انسان خود غور کر سکتا ہے۔ یکسوئی قلب کے عمل کے لئے میری دلچسپی کا مضمون تو مطالعۂ علم ریاضی ہی ہو سکے گا۔ اس کا ثمرہ یقیناً اچھا ہوگا۔ لیکن یہ یکسوئی قلب کے لئے بہترین نصب العین نہیں ہے۔ علم ریاضی کے مطالعہ سے یکسوئی قلب کی پوری جانچ نہیں ہوتی۔ حساب یا دیگر شعبۂ علم میں اگرچہ یکسوئی سے کامیابی حاصل ہو جائے گی لیکن یہ صحیح معیار نہیں ہے۔ اس لئے ساتویں باب میں یہ بتایا گیا کہ ہماری نگاہ بھگوان کے چرنوں کی طرف ہونی چاہیئے۔ آٹھویں باب میں کہا گیا کہ بھگوان کے قدموں کا ہمیشہ دھیان رہے۔ ہماری زبان، کان، آنکھیں برابر اُسی میں لگی رہیں۔ اسلئے مرتے وقت تک کوشش کرنی چاہیئے سب اندریوں (حواسوں) کو اس کی مشق ہو جانی چاہیئے: سب اندریوں کو عادت پڑ گئی۔ اب دوسرا کوئی رجحان نہیں رہا۔" ایسا ہو جانا چاہیئے۔ سب اندریوں کو بھگوان کی دھن لگ جانی چاہیئے، ہمارے پاس چاہے کوئی رو رہا ہو یا بھجن گا رہا ہو، کوئی خواہشات کا جال بُن رہا ہو، تیاگی سنتوں کا اجتماع ہو رہا ہو، روشنی ہو یا اندھیرا ہو۔ وقت نزع پرمیشور دھیان میں سامنے ہی موجود رہے گا۔ اس طرح کی مشق زندگی بھر سب اندریوں

سے کرانا، یہ ہمیشگی کا سبق آٹھویں باب میں دیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں یکسوئی قلب، ساتویں میں مراقبہ یعنی مجذوبیت، آٹھویں میں مداومت، اور نویں میں گفونیش کی تعلیم دی گئی ہے۔ دسویں میں قدم بہ قدم معرفت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ایک قدم آگے چل کر ایشور کا روپ کیسے دل نشین کیا جائے اور بتایا گیا کہ چیونٹی سے لے کر برہمہ دیو تک سمائے ہوئے پرماتما کو قدم بہ قدم کس طرح مکینِ قلب بنایا جائے۔ گیارہویں باب میں سگرتا (ہمہ گیری) بتائی گئی۔ عالم روپ درشن کو ہی سگرتا یوگ کہتا ہوں، عالم روپ درشن کا مطلب ہے یہ محسوس کرنا کہ معمولی ذرہ میں بھی سارا عالم سمایا ہوا ہے۔ یہی عظیم فلسفہ ہے۔ چھٹے باب سے لے کر گیارہویں باب تک بھگتی رس کو اس طرح مختلف طریقوں سے نچوڑا گیا ہے۔

(۶۰) سگن عابد اور نرگن عابد: ماں کے دو بچے

اب بارہویں باب میں بھگتی کے سبق کی تکمیل کرنی ہے۔ ارجن نے اسی تکمیل کے سلسلے میں سوال پوچھا ہے۔ پانچویں باب میں سارے علوم زندگی کی چرچا ختم ہوتے وقت جیسا سوال ارجن نے کیا ویسا ہی یہاں بھی کیا ہے۔ ارجن پوچھتا ہے "بھگوان! کچھ لوگ سگن کی پرستش کرتے ہیں اور کچھ نرگن کی۔ بتائیے ان دونوں میں آپ کو کون پیارا ہے؟"

بھگوان اس کا کیا جواب دیں؟ کسی ماں کے دو بچے ہوں۔ اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے، ویسا ہی یہ سوال ہے۔ دو میں ایک بچہ چھوٹا ہو، وہ ماں کو بہت پیار کرتا ہو، ماں کو دیکھتے ہی خوش ہوتا ہو اور ماں اس کے ذرا دور جاتے ہی بے چین ہو جاتا ہو، وہ ماں سے دور جا ہی نہیں سکتا، اسے چھوڑ ہی نہیں سکتا، اس کی جدائی وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ ماں نہ ہو تو اس کے لئے

سنسار سونا ہے۔ ایک تو یہ چھوٹا بچہ ہے، دوسرا بڑا بچہ ہے، تو وہ بھی اسی طرح جذباتِ محبت سے لبریز، مگر سمجھ دار ہو گیا ہے، ماں سے دور رہ سکتا ہے۔ ۵-۶ ماہ بھی ماں سے ملاقات نہ ہو تو بھی گذر کر سکتا ہے وہ ماں کی خدمت کر سکتا ہے۔ ساری ذمہ داری اپنے سر پر ہی لے کر کام کرتا ہے۔ کام کاج میں لگ جانے سے ماں کی جدائی سہہ سکتا ہے۔ لوگوں میں اس کی عزت ہے اور چاروں طرف اس کا نام سن کر ماں کو بڑا سکھ ملتا ہے۔ ایسا یہ دوسرا بیٹا ہے۔ اس طرح کے دو لڑکوں کے بارے میں ماں سے سوال کیجئے کہ "اے ماتا! ان دو لڑکوں میں سے صرف ایک بیٹا ہی آپ کو دیا جائے گا۔ آپ جو چاہیں پسند کر لیں"۔ تو وہ کیا جواب دے گی؟ کس لڑکے کو وہ پسند کرے گی؟ کیا وہ دونوں لڑکوں کو ترازو میں رکھ کر تولے گی؟ ماں کی حالت پر غور کیجئے، اس کا فطری جواب کیا ہو گا؟ وہ بیقرار ہو کر کہے گی "اگر جدائی ہونی ہی ہے تو بڑے لڑکے کو لے جاؤ، اس کی جدائی میں برداشت کر لوں گی"! چھوٹے بچے کو چھاتی سے لگا لے گی اور اسے اپنے سے دور نہیں ہٹنے دے گی چھوٹے لڑکے کی خاص کشش کو دیکھ کر شاید وہ اس طرح کا کچھ جواب دے گی کہ "بڑا دور گیا تو حرج نہیں"۔ لیکن اسے زیادہ پیارا کون ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ نہ کچھ جواب دینا ہی تھا، اس لئے کچھ الفاظ اس کے منہ سے نکل گئے۔ لیکن ان الفاظ کی تہہ میں گھس کر اگر ان کا مطلب نکالنے لگیں تو مناسب ہو گا۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جیسے اس ماں کو پس و پیش ہو گا ٹھیک ویسے ہی کیفیت بھگوان کے من کی ہو گئی ہے۔ ارجن کہتا ہے "بھگوان آپ کے دو طرح کے بھگت ہیں۔ ایک آپ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ آپ کی ہمیشہ یاد کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں آپ کی پیاسی ہیں، کان آپ کے بھجن سننے کو بے قرار۔ ہاتھ پاؤں آپ کی خدمت و پوجا کیلئے بے چین رہتے ہیں۔ دوسرا ہے اپنے پر بھروسہ کرنے والا۔

اندریوں (حواس) کو ہمیشہ قابو میں رکھنے والا، سبھی کی بھلائی میں مست اور رات دن سماج کی بے لوث خدمت میں ایسا محو کہ گویا اسے پرمیشور کی یاد ہی نہیں، یہ ہے آپ کا وحدانیت پرست دوسرا بھگت۔ اب مجھے بتائیں کہ ان دونوں میں آپ کا پیارا بھگت کون ہے؟ ارجن کا بھگوان سے یہ سوال ہے۔ اب جس طرح اس بچے کی ماں نے جواب دیا تھا اسی طرح بھگوان نے اس کا جواب دیا ہے" وہ سگن بھگت مجھے پیارا ہے۔ وہ دوسرا وحدانیت پرست بھی میرا ہی ہے"۔ اسی طرح بھگوان پس و پیش میں پڑ گئے ہیں، لیکن کچھ نہ کچھ جواب دینا تھا۔ اس لئے دے ڈالا۔

دراصل بات بھی ایسی ہی ہے جرف بحرف دونوں بھگت ایک روپ ہیں۔ دونوں کی اصلیت ایک سی ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ پانچویں باب میں کرم کے بارے میں جیسا سوال ارجن نے پوچھا تھا ویسا ہی یہاں بھگتی کے متعلق کیا ہے۔ پانچویں باب میں کرم اور وکرم کی مدد سے انسان اکرم کی حالت حاصل کرتا ہے۔ یہ اکرم کی حالت دو شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کوئی رات دن کام کرتے رہتے ہوئے بھی کچھ کرم نہیں کرتا، اور دوسرا چوبیس گھنٹے میں ایک بھی کرم نہ کرتے ہوئے گویا دنیا بھر کی اکھاڑ پچھاڑ کرتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں اکرم کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اب ان کا توازن کیسے کیا جائے؟ کسی گولہ کے ایک طرف کا دوسری طرف سے مقابلہ کیجئے۔ ایک ہی گولے کے دو پہلو۔ ان کا موازنہ کریں کیسے؟ دونوں پہلو ایک ہی سی اہلیت اور ایک ہی سے اوصاف رکھتے ہیں، ایک ہی روپ ہیں۔ اکرم کی کیفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے بھگوان نے ایک کو سنیاس اور دوسرے کو یوگ کہا ہے۔ الفاظ بھلے ہی دو ہوں، مگر مطلب ایک ہی ہے۔ سنیاس اور یوگ دونوں کا اصل آخر ہوتے اور سادگی کے لحاظ سے ہی کیا ہے۔ سگن نرگن کا سوال بھی ایسا ہی ہے۔ ایک سگن بھگت اندریوں (حواس) کے ذریعہ پرمیشور کی سیوا کرتا ہے۔ دوسرا نرگن بھگت من سے بھو ودھنا کر کی

فکر رکھتا ہے۔ پہلا باہری سیوا میں مست دکھائی دیتا ہے لیکن اندر سے اس کا سمرن بچار ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ دوسرا کچھ بھی ظاہری خدمت کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اس کی باطنی اعلیٰ خدمت جاری ہے۔ اس طرح کے ان دو بھگتوں میں اب بڑا کون ہے؟ رات دن کرم کر کے بھی کچھ بھی کرم نہ کرنے والا سگن بھگت ہے۔ نرگن بھگت اندر سے سب کی بھلائی کا خیال اور سب کی فکر رکھتا ہے۔ یہ دونوں بھگت باطن سے ایک روپ ہی ہیں۔ البتہ باہر سے مختلف معلوم پڑتے ہیں۔ لیکن ہیں دونوں ایک سے ہی، دونوں بھگوان کے پیارے ہیں۔ پھر بھی ان میں سگن بھگتی زیادہ آسان ہے اس بارہ بھگوان نے پانچویں ادھیائے میں جو جواب دیا ہے، وہی یہاں بھی دیا ہے۔

(۶۱) سگن آسان اور محفوظ

سگن بھگتی یوگ میں براہِ راست اندریوں (حواس) سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اندریاں یا تو اس معاملے میں معاون ہیں یا مانع، یا دونوں ہیں۔ وہ یا تو برباد کرنے والی ہیں یا پار لگانے والی ہیں، یہ دیکھنے والے کی نگاہ پر منحصر ہے۔ مان لو کہ کسی کی ماتا بستر مرگ پر پڑی ہے۔ اور وہ اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہے۔ راستہ دور ۱۵ میل کا ہے۔ اس پر موٹر نہیں جا سکتی۔ ٹوٹی پھوٹی پگڈنڈی ہے۔ ایسے وقت یہ راستہ معاون ہے یا مانع؟ کوئی کہے گا: "کہاں کا یہ منحوس راستہ بیچ میں آ گیا، نہیں تو میں کبھی کا ماں سے جا کر مل لیتا۔" ایسے شخص کے لئے وہ راستہ دشمن ہی ہے، بہر حال راستہ طے کرتا ہوا، وہ جاتا تو ہے، مگر راستہ کو کوس رہا ہے۔ لیکن ماں کو دیکھنے کے لئے اسے ہر حالت میں جلدی جلدی قدم اٹھا کر جانا ضروری ہے۔ راستہ کو دشمن سمجھ کر اگر وہیں نیچے بیٹھ جائے گا تو پھر اس دشمن کی فتح ہو جائے گی۔ وہ سرپٹ چل کر ہی اس دشمن کو جیت سکتا ہے۔ دوسرا شخص کہتا ہے — اس بھاری جنگل میں اتنا راستہ تو کسی طرح بنا ہی ہوا ہے، یہی غنیمت ہے، کسی

نہ کسی طرح ماں تک پہنچ ہی جاؤں گا۔ یہ نہ ہوتا تو اس دشوار گذار پہاڑ سے کیسے گذر پاتا۔ یہ کہہ کر وہ اس پگڈنڈی کو ایک ذریعہ سمجھتے ہوئے تیزی سے قدم آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ راستہ کے لئے اس کے دل میں جذبۂ محبت ہوگا، اسے وہ دوست سمجھے گا۔ اب آپ اس راستے کو دوست سمجھیں یا دشمن، فرق ڈالنے والا کہیئے یا اسے کم کرنے والا کہیئے۔ جلد جلد قدم تو آپ کو اٹھانا ہی ہوگا۔ راستہ مانع ہے یا معاون۔ یہ تو ہر انسان کے اپنے اپنے نظریہ یا خیال پر منحصر ہے۔ یہی بات اندریوں کی ہے، وہ مزاحم ہیں یا معاون، یہ آپ کے نظریہ پر موقوف ہے۔

سگن بھگت کے لئے اندریاں ایک ذریعہ ہیں۔ اندریاں گویا پھول ہیں جنھیں اس پرماتما کو پیش کرنا ہے۔ آنکھوں سے اس پرمیشور کا روپ دیکھیں۔ کانوں سے بھگوان کی کتھا سنیں، زبان سے نام خدا ورد کریں۔ پاؤں سے طواف کریں ہاتھوں سے خدمت کریں، اسی طرح ساری اندریوں کو وہ پرمیشور کی نذر کر دیتا ہے۔ وہ اندریاں عیش و عشرت کے لئے نہیں رہ جاتیں۔ پھول تو بھگوان پر چڑھانے کے لئے ہوتے ہیں۔ پھول کی مالا خود اپنے گلے میں ڈالنے کے لئے نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح اندریوں کا استعمال خدمت خدا کے لئے کیا جائے، یہ ہوا سگن بھگت کا نظریہ۔ لیکن نرگن بھگت کو اندریاں رکاوٹ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ انہیں قابو میں رکھتا ہے۔ ان کی غذا بند کر دیتا ہے، ان پر پہرہ بٹھا دیتا ہے۔ لیکن سگن بھگت کو یہ سب نہیں کرنا پڑتا ـــ وہ تمام اندریوں کو ایشور کے قدموں پر نچھاور کر دیتا ہے۔ یہ دونوں طریقے اندریوں پر قابو رکھنے کے ہی ہیں۔ ضبطِ نفس کی ہی یہ دونوں قسمیں ہیں۔ آپ کسی بھی طریقہ پر چلیئے، لیکن اندریوں کو قابو میں رکھئے۔ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ انہیں عیش و نشاط میں نہ بھٹکنے دینا چاہیئے۔ ایک آسان طریقہ ہے، دوسرا مشکل

نرگن بھگت ساری خلقت کی بھلائی میں لگا رہتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ "سارے عالم کی بھلائی چاہنا" کہنے میں تو آسان ہے پر کرنا بہت مشکل ہے۔ جسے سارے عالم کی بھلائی کی فکر ہے، وہ اس فکر کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے نرگن بھکتی مشکل بتائی گئی ہے۔ سگن بھگتی اپنی اپنی طاقت کے مطابق مختلف طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں کی جہاں ہماری پیدائش ہوئی، خدمت کرنا اور ماں باپ کی خدمت کرنا سگن پوجا ہے۔ اس میں اتنا ہی دھیان رکھنا ہے کہ ہماری پوجا بہبودئ عالم کے خلاف نہ ہو۔ آپ کی خدمت کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، وہ اگر دوسروں کی بھلائی میں رکاوٹ نہ ڈالتی ہو، تو ضرور درجہ بھگتی تک پہنچ جائے گی، ورنہ وہ خدمت الفتِ دنیاوی کی شکل اختیار کرے گی۔ ہمارے ماں باپ ہوں، دکھی متعلقین ہوں، سادھو سنت ہوں، انہیں پرمیشور سمجھ کر ان کی سیوا کرنی چاہیئے۔ ان سب میں پرمیشور کی مورت کا تصور کر کے قناعت کیجئے۔ یہ سگن پوجا آسان ہے لیکن نرگن پوجا کہیں مشکل ہے۔ یوں دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ آسانی کے نقطۂ نگاہ سے سگن بھگتی بہتر ہے، بس!

آسانی کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے، نرگن بھگتی میں خطرہ ہے۔ نرگن گیان سے بھرا ہے، سگن محبت اور نیک جذبات سے لبریز ہے۔ سگن میں تری ہے۔ اس میں بھگت زیادہ محفوظ ہے، نرگن میں کچھ خطرہ ہے۔ ایک وقت ایسا تھا جب گیان پر مجھے زیادہ اعتقاد تھا، لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صرف گیان سے میرا مطلب نہیں چل سکتا۔ گیان سے من کا موٹا میل جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ لیکن باریک میل کو مٹانے کی طاقت اس میں نہیں ہے۔ خود اعتمادی، غور و فکر، قوتِ ممیزہ اور باغت، نفس کشی، ان سبھی

حرکتوں کو لیجئے، پھران کے ذریعہ من کا باریک میل نہیں مٹ سکتا۔ اب بھگتی کے بغیر یہ نجاست دحل نہیں سکتی بھگتی میں ہی یہ طاقت ہے۔ اسے آپ چاہیں، تو "پرا و لمبن" (دوسروں پر منحصر) کہہ دیجئے۔ لیکن "پر" کا مطلب دوسرا نہ اخذ کرکے صرف "خدائے برتر" لیجئے۔ اس کا سہارا یعنی اس خدا کا بھروسہ ذہن نشین کیجئے۔ پرماتما کا سہارا لئے بغیر دل کا میل دور نہیں ہوتا

اعتراض ہوسکتا ہے کہ یہاں "گیان" کے معنی کو تنگ و محدود کر دیا گیا ہے۔ اگر گیان سے نجاست قلبی دور نہیں ہو سکتی تو میں اس الزام کو قبول کرتا ہوں کہ پھر گیان کا درجہ کم ہو جاتا ہے۔ لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ خالص گیان اس مٹی کے پتلے میں رہتے ہوئے ہونا مشکل ہے۔ اس قالب میں رہتے ہوئے جو گیان ہوگا وہ کتنا ہی خالص کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ آلودگی اس میں ضرور ہوگی۔ اس جسم میں جو گیان پیدا ہوگا اس کی طاقت محدود ہی رہے گی۔ اگر صحیح گیان پیدا ہوگیا تو اس سے سارا میل دور ہو جائے گا۔ اس میں مجھے ذرہ برابر بھی شک نہیں۔ من کے ساتھ ساری نجاست کے جلا ڈالنے کی قوت گیان میں ہے۔ لیکن اس عیوب پذیر جسم میں گیان کا اثر کم پڑتا ہے۔ اس لئے اس کے ذریعہ باریک گندگی کا مٹنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا بھگتی کا سہارا لئے بغیر گندگیوں کو صاف نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے بھگتی میں آدمی زیادہ محفوظ ہے۔ لفظ "زیادہ" میری طرف سے اضافہ سمجھ لیجئے۔ سگن بھگتی آسان ہے۔ اس میں پرمیشور او لمبن" (پرمیشور کا سہارا) ہے۔ نرگن میں "سوا و لمبن" (اپنا سہارا) ہے۔ اس میں لفظ "سو" کا بھی کیا مطلب ہے؟ اپنے اندر موجود ایشور کا سہارا۔ یہی اس "سوا و لمبن" (خوداعتمادی) کا مطلب ہے۔ ایسا کوئی شخص نہیں مل سکتا جو صرف عقل کے سہارے شدھ (پاک) ہوگیا ہو۔ "سوا و لمبن"

(خود اعتمادی) سے یعنی اندرونی آتم گیان (علم روحانیت) سے صحیح گیان حاصل ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ نرگن بھگتی کی خود اعتمادی میں بھی آتما کا ہی سہارا ہے۔

(۶۳) نرگن کے بغیر سگن بھی ناقص

جیسے سگن بھگتی کی موافقت میں میں نے سہولت اور تحفظ کا وزن ڈال دیا ہے، ویسے ہی نرگن کے حق میں بھی ڈال سکتا ہوں۔ نرگن میں ایک حد ہوتی ہے۔ جیسے ہم مختلف کاموں کے لئے سیوا کے لئے ادارے قائم کرتے ہیں۔ ادارے اوّلاً شخصی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور قائم کرنے والے فرد کی خاص اہمیت رہتی ہے۔ ادارہ پہلے اسی فرد پر منحصر رہتا ہے۔ لیکن جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے تیوں تیوں وہ شخصیت سے آزاد ہوکر اصول پرست ہوتے جانا چاہئیے اگر اس میں ایسی اصول پرستی نہ پیدا ہوئی تو اس محرک ہستی کے غائب ہوتے ہی اس ادارہ میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں اپنی پسند کی مثال دوں چرخے کی مال ٹوٹتے ہی، سوت کاتنا تو درکنار، کتا ہوا سوت لپیٹنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسی ہی حالت اس بانی کا سہارا ختم ہوتے ہی ادارہ کی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ لاوارث ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر شخصی بھگتی سے اصول کی بھگتی پیدا ہوگئی تو پھر ایسا نہیں ہو سکتا۔ سگن کو نرگن کی مدد چاہئیے۔ کبھی نہ کبھی تو شخصیت اور سگن سے نکل کر باہر جانے کی مشق کرنی چاہئیے۔ گنگا ہمالیہ سے شنکر کی جٹا جوٹ سے نکلی۔ لیکن وہیں رک نہیں گئی۔ اس جٹا جوٹ سے نکل کر وہ ہمالیہ کے غاروں، گھاٹیوں، جنگلوں کو پار کرتی ہوئی، ہموار میدانوں میں بہتی ہوئی آئی، تبھی وہ انسان کے کام آسکی اس طرح ادارہ کو شخصی سہارا ختم ہو جانے پر بھی اصولوں کے مضبوط کھمبوں پر کھڑا رہنے کے لئے تیار رہنا چاہئیے۔ جب مکان میں ڈاٹ بناتے ہیں، تو پہلے اسے سہارا لگاتے ہیں۔ بعد میں اسے نکال دیتے ہیں۔ اس سہارے کو نکال ڈالنے پر اگر ڈاٹ

ٹکی رہے، تب ہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ سہارا ٹھیک تھا۔ اسی طرح تحریک کی روانی پہلے سگن سے چلی۔ لیکن آخر میں اس کی تکمیل اصول پرستی نرگن میں ہونی چاہیئے۔ بھگتی کے شکلم سے گیان کا ظہور ہونا چاہیئے۔ اور بھگتی کے بیل میں گیان کے پھول لگنے چاہئیں۔ بدھ دیو کے دھیان میں یہ بات آگئی تھی۔ اس لئے انہوں نے تین قسم کی عقیدتیں بنائیں۔ پہلے شخصی عقیدت ہو تو بھی اس میں سے اصولی عقیدت اور دیگا یک اصولی عقیدت نہ ہو، تو کم سے کم جماعتی عقیدت پیدا ہونا چاہیئے۔ ایک شخص کے لئے جو عزت تھی۔ ہی دس بندرہ کے لئے ہونی چاہیئے۔ جماعت کے لئے اگر اجتماعی محبت نہ ہوگی، تو آپس میں ان بن ہونے لگے گی۔ جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔ شخصی تحفظ ختم کر کے جماعتی تحفظ پیدا ہونا چاہیئے۔ اور پھر اصولی تحفظ ہونا چاہیئے۔ اسی لئے بدھ دھرم میں تین تحفظات بتلائے گئے ہیں۔

"میں بدھ کی پناہ میں جاتا ہوں۔ جماعت کی پناہ میں جاتا ہوں اور اصول کی پناہ میں جاتا ہوں۔"

پہلے فرد کے لئے، پھر جماعت کے لئے پریم، لیکن یہ دونوں اعتماد کمزور ہی ہیں۔ اس لئے جب آخر میں اصولی اعتماد پیدا ہوگا تب ہی ادارہ قائم رہ سکے گا اور تب ہی مفید ثابت ہو سکے گا۔ چشمہ تحریک کی ابتدا اگرچہ سگن سے ہوئی ہو تو بھی اسے نرگن ساگر میں جا کر ملنا چاہیئے۔ نرگن کی غیر موجودگی میں سگن میں خرابی آجاتی ہے۔ نرگن کی مدد سگن کو متوازی رکھتی ہے۔ اس کے لئے سگن نرگن کا احسان مند ہے۔

ہندو، عیسائی، اسلام وغیرہ سبھی مذہبوں میں مورتی پوجا کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ وہ نیچے درجہ کی مانی گئی ہو، لیکن اس کو ماننے منظور رہے ہیں اور اس کی عظمت ہے۔ لیکن جب تک مورتی پوجا نرگن کی حد میں رہتی ہے، تب ہی تک وہ بےعیب

رہتی ہے۔ اس حد سے گذرتے ہی سگن معیوب ہو جاتا ہے۔ سارے دھرموں کی سگن، نرگن کی عادم موجودگی میں تنزل پذیر ہو گئے ہیں۔ پہلے زمانہ میں جانوروں کی قربانی ہوتی تھی۔ آج بھی شاکت دیوی کو قربانی نذر کرتے ہیں۔ یہ مورت پوجا کا ظلم ہو گیا۔ اپنی حد کو چھوڑ کر مورت پوجا غلط راستہ پر چلی گئی لیکن اگر نرگن بھگتی کی حد قائم رہے، تو پھر یہ اندیشہ نہیں رہتا۔

(۶۳) رام کی زندگی سے مثالیں

سگن آسان اور محفوظ ہے۔ لیکن سگن کو نرگن کی ضرورت ہے۔ سگن کے عروج کے بعد اس میں نرگن اور اصول پرستی کے پھولوں کی بہار آنی چاہیے۔ نرگن سگن ایک دوسرے کے معاون ہیں، باہم مخالف نہیں۔ سگن سے نرگن کی منزل طے کرنی چاہیے اور نرگن کو بھی قلب کی باریک نجاستوں کو دھو ڈالنے کے لئے سگن کی تری چاہیئے۔ دونوں کی ایک دوسرے سے زیبائش ہے۔ یہ دونوں بھگتیاں رامائن میں بڑے اچھے ڈھنگ سے دکھائی گئی ہیں۔ اجودھیا کانڈ میں دونوں طرح کی بھگتیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انہیں دو بھگتیوں کی تشریح رامائن میں ہے۔ بھرت کی بھگتی پہلے قسم کی ہے۔ اور لکشمن کی دوسرے قسم کی۔ ان کی مثال سے نرگن بھگتی اور سگن بھگتی کی حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔

رام جب بن کو جانے لگے تو لکشمن کو ہمراہ لے جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ رام کو انہیں ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ انھوں نے لکشمن سے کہا، لکشمن! میں بن کو جا رہا ہوں۔ میرے لئے پتا جی کا ایسا ہی حکم ہے۔ تم گھر ہی رہو۔ میرے ساتھ چل کر اپنا دکھی ماتا پتا کو اور زیادہ دکھی نہ بناؤ۔ ان کی اور رعایا کی خدمت کرو۔ تم ان کے پاس بطور میرے نمائندہ کے رہو، تو میں بے فکر رہوں گا۔ میں بن جا رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی مصیبت میں

پڑ رہا ہوں۔ بلکہ رشیوں کے آشرموں میں جا رہا ہوں۔" اس طرح رام لکشمن کو سمجھا رہے تھے۔ لیکن لکشمن نے رام کی ساری باتیں ایک ہی لفظ میں اڑا دیں۔ کیا دو ٹوک جواب دیا۔ تلسی داس نے اس کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ لکشمن کہتے ہیں۔ "آپ نے مجھے اعلیٰ ویدانتی اخلاق بتایا ہے۔ دراصل مجھے اس پر عمل بھی کرنا چاہیئے لیکن یہ بارِ سیاست مجھ سے اٹھ نہیں سکے گا۔ آپ کے نمائندہ ہونے کی اہلیت مجھ میں نہیں ہے۔ میں تو بالک ہوں۔"

دینہ موہی سکھ نیک گوسائیں ۔ لاگی اگم اپنی کدرائی !
نر وور دھیر دھرم دھر دھاری ۔ نگم نیتی کے تے ادھیکاری
میں سسو پربھو سنیہ پرتی پالا ۔ مندر و میرو کہ لیہں مرالا ؟

(ہنس کیا میرو پہاڑ کا بھار اٹھا سکتا ہے؟) بھیا رام! میں تو آج تک آپ کے پریم سے پلا ہوں۔ آپ یہ سیاست کسی اور کو سکھائیں۔ میں تو ابھی بچہ ہوں۔ یہ کہہ کر لچھمن نے ساری بات ہی ختم کر دی۔

مچھلی جس طرح پانی سے جدا نہیں رہ سکتی ویسے ہی لکشمن کی حالت تھی۔ رام سے دور رہنے کی تاب اس میں نہ تھی، اس کے روئیں روئیں میں جذبۂ ہمدردی بھرا تھا۔ رام سوجاتیں تب بھی خود جاگتا رہے۔ ان کی سیوا کرے۔ اسی میں اس کو لطف آتا تھا۔ ہماری آنکھ پر اگر کوئی کنکر مارے تو جیسے فوراً ہاتھ اٹھ کر آنکھ پر آ جاتا ہے اور کنکر کی مار جھیل لیتا ہے اسی طرح لکشمن رام کا ہاتھ بن گیا تھا۔ رام پر اگر حملہ ہوتا تو پہلے لچھمن اسے سہتا۔ تلسی داس نے لکشمن کے لئے ایک عمدہ مثال دی ہے۔ جھنڈا اونچا لہراتا رہتا ہے۔ سب جھنڈے کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کے رنگ وغیرہ کے گیت گائے جاتے ہیں۔ لیکن اس سیدھے کھڑے ڈنڈے کو کون پوچھتا ہے۔ رام کی عظمت کا جو جھنڈا لہرا رہا ہے، اس کے سہارے کا ڈنڈا لکشمن

ہی تھا، جو سیدھا تنا کھڑا رہتا۔ جس طرح جھنڈے کا ڈنڈا کبھی نہیں جھک سکتا، اسی طرح رام کی عظمت کو قائم رکھنے والا ڈنڈا کبھی جھکا نہیں۔ عظمت کس کی؟ رام کی! دنیا کو جھنڈا دکھائی دیتا ہے۔ ڈنڈے کو کوئی نہیں گنتا۔ چوٹی نظر آتی ہے۔ بنیاد کسی کو نہیں دکھائی پڑتی۔ رام کی عظمت عالم میں پھیل رہی ہے، لیکن لکشمن کا کہیں پتہ نہیں۔ چودہ سال تک یہ ڈنڈا سیدھا ہی کھڑا رہا، ذرا بھی نہیں جھکا۔ خود پیچھے رہ کر وہ رام کی عظمت پھیلاتا رہا۔ رام بڑے بڑے مشکل کام لکشمن سے کرواتے۔ سیتا کو بن میں چھوڑنے کا کام بالآخر لکشمن ہی کو سونپا گیا۔ بیچارہ لکشمن سیتا کو پہنچا آیا۔ اس کا کوئی اپنا وجود ہی نہیں رہ گیا تھا۔ رام کی آنکھیں، رام کے ہاتھ پاؤں۔ رام کا من وہ بن گیا تھا۔ جس طرح ندی سمندر میں مل جاتی ہے۔ اسی طرح لکشمن کی سیوا رام میں مل گئی تھی۔ وہ رام کی پرچھائیں بن گیا تھا۔ لکشمن کی یہ بھگتی مگن تھی۔

بھرت نرگن بھگتی کرنے والا تھا۔ اس کا بھی مرقع تلسی داس نے خوب کھینچا ہے۔ جب رام بن کو گئے، بھرت اجودھیا میں نہیں تھا۔ جب وہ آیا، دشرتھ مر چکے تھے۔ بششٹ گرو اسے سمجھا رہے تھے کہ تم راج کرو۔ مگر بھرت نے کہا: "مجھے رام سے ملنا ہے۔ رام سے ملنے کے لئے وہ اندر سے چھٹ پٹا رہا تھا، لیکن ساتھ ہی انتظام سلطنت بھی کر رہا تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ راج رام کا ہے۔ اس کا انتظام کرنا رام کا ہی کام کرنا ہے۔ ساری جائداد مالک کی ہے۔ اس کا صرف انتظام کرنا اس کا فرض تھا۔ لکشمن کی طرح بھرت آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بھرت کی تمہید ہے۔ رام کی بھگتی کا مطلب یہ ہے کہ رام کا کام کرنا چاہیئے۔ ورنہ وہ بھگتی کس کام کی؟ راج کاج کا پورا بندوبست کر کے بھرت رام سے ملنے بن میں آیا ہے: "بھیا! یہ آپ کی سلطنت ہے۔ آپ ......" اتنا جوں ہی وہ کہتا ہے توں ہی رام اس سے کہتے ہیں: "بھرت!

نہیں راج کرو۔"

بھرت پس و پیش میں پڑ جاتا ہے ۔ وہ کہتا ہے "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" رام جو کہیں وہ منظور۔ اس نے اپنا سب کچھ رام پر نچھاور کر رکھا تھا ۔ واپس جا کر وہ راج کاج کرنے لگا ۔ لیکن تعریف کہ اجودھیا سے دو میل دور تپ کرتے ہوئے رہائش اختیار کی ۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہوئے راج کاج چلایا ۔ آخر کو جب رام بھرت سے ملے تو یہ پہچاننا مشکل تھا کہ ان میں بن میں رہ کر تپ کرنے والا سچ مچ تپسوی کون ہے ؟ دونوں کے ایک سے چہرے ، تھوڑا سا عمر میں فرق ۔ پیشانی سے زہد نمایاں دونوں کو دیکھ کر پہچان نہیں سکتے کہ ان میں رام کون اور بھرت کون ؟ اگر کوئی مصور ایسی تصویر کھینچے تو وہ کتنی پاکیزہ تصویر ہوگی ؟ اسی طرح بھرت اگرچہ جسمانی طور پر رام سے دور تھا تو بھی من سے وہ لمحہ بھر کے لئے بھی دور نہیں تھا ۔ اگرچہ وہ ایک طرف راج کاج کر رہا تھا تو بھی من سے وہ رام کے پاس ہی تھا ۔ نرگن میں سگن بھگتی لبالب بھری رہتی ہے ۔ اس لئے جدائی کا لفظ منہ سے نکلے ہی کیسے ؟ اس لئے بھرت کو رام کی جدائی محسوس ہی نہیں ہوئی ۔ اور وہ اپنے مالک کا کام کر رہا تھا ۔

آج کل کے نوجوان کہتے ہیں — رام کا نام ، رام کی بھگتی ، رام کی پوجا ، یہ سب ہماری سمجھ میں نہیں آتے ۔ ہم تو بھگوان کا کام کریں گے ! " لیکن بھگوان کا کام کیسے کرنا چاہیئے ؟ اس کا نمونہ بھرت نے دکھلا دیا ہے ۔ بھگوان کا کام کر کے بھرت نے جدائی کو جذب کر لیا ہے ۔ بھگوان کا کام کرتے ہوئے ان کی جدائی کا احساس کرنے کی بھی فرصت نہ رہنا ایک بات ہے ۔ اور جس کو بھگوان سے کچھ لینا دینا نہیں اس کا دعویٰ کرنا دوسری بات ہے ۔ بھگوان کا کام کرتے ہوئے اتقا کی زندگی بسر کرنا مشکل بات ہے ۔ اگرچہ بھرت کا یہ رجحان نرگن طریقے سے کام کرنے کا تھا، تاہم سگن کا سہارا ٹوٹ نہیں گیا تھا : پربھو رام ! آپ کا حکم مجھے بسر و چشم تسلیم ہے ۔ آپ جو کہیں گے۔

اس میں مجھے کچھ بھی شبہ نہ ہوگا"۔ ایسا کہہ کر جونہی بھرت لوٹنے لگا، تو پھر پیچھے مڑ کر رام کی طرف دیکھا اور کہا: "بھگوان! من کو سکون نہیں آتا۔ کچھ نہ کچھ بھولا ہوا سا معلوم ہوتا ہے"۔ رام نے فوراً اس کا جذبہ پہچان لیا اور کہا: "یہ کھڑاؤں لے جاؤ"۔ بالآخر سگن کی عزت قائم رہی۔ نرگن کو سگن نے بالآخر تری پہنچا ہی دی۔ لکشمن کو کھڑاؤں لینے سے اطمینان نہ ہوا ہوتا۔ اس کی نگاہ میں یہ دودھ کی بھوک مٹھے سے مٹانے جیسی ہوتی۔ لیکن بھرت کا پس منظر اس سے جداگانہ تھا۔ وہ باہر سے دور رہ کر کام کر رہا لیکن دل سے رام میں محو تھا۔ بھرت اگرچہ فرض کی ادائگی میں ہی رام بھگتی مانتا تھا تاہم اسے کھڑاؤں کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ ان کی غیر موجودگی میں وہ راج کاج نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں کھڑاؤں کا حکم سمجھ کر وہ اپنی ادائگیِ فرض کر رہا تھا۔ جیسا لکشمن رام کا بھگت تھا، ویسا ہی بھرت تھا۔ دونوں کا پس منظر بظاہر مختلف تھا۔ بھرت اگرچہ فرض گذار دحقائق شعار تھا پھر بھی اس کی حقائق شعاری کو کھڑاؤں کی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی۔

(۶۴) کرشن کی زندگی سے مثالیں

ایشور بھگتی کی لگن ضرور ہونی چاہیئے۔ اس لئے بھگوان نے ارجن سے بار بار کہا ہے: "ارجن! مجھ سے لگن لگا" یعنی "ارجن! مجھ سے اسکت (لگاؤ) رکھ۔ میرے پریم کا سہارا لے اور کرم کرتا رہ"۔ جس بھگوت گیتا کو لفظ "اسکت" یعنی لگاؤ نہ تو سوجھتا ہے نہ بھاتا ہی ہے، جس نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ بلا لگاؤ کام کرو، غصہ و نفرت کو دور رکھ کر بے لوثی سے کام کرو۔ "اناسکتی" (عدم فریفتگی) "نہ سنگتا" (غیر ملوث) جس کا سر پیر ہے، وہی کہتی ہے "ارجن! مجھ سے لگن لگا"۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بھگوان سے لگاؤ ہونا بہت اونچی بات ہے۔ وہ کسی دنیاوی شے کی چاہ نہیں ہے۔ سگن اور نرگن دونوں ایک دوسرے

میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ سگن نرگن کا سہارا چھوڑ نہیں سکتا اور نرگن کو سگن کے رس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو آدمی ہمیشہ ادائی فرض میں لگا رہتا ہے وہ اسی شکل میں پوجا ہی کر رہا ہے۔ لیکن پوجا کے ساتھ رس اور تری بھی چاہئے۔ میری یاد رکھ کر لڑتا رہ۔" میری یاد رکھ کر کام کر۔ کام خود بھی ایک پوجا ہی ہے۔ لیکن قلبی جذبہ بیدار رہنا چاہیئے، محض پھول چڑھا دینا ہی پوجا نہیں ہے۔ اس میں جذبۂ عقیدت لازمی ہے۔ پھول چڑھانا پوجا کا ایک طریقہ ہے۔ نیک اعمال کرنا پوجا کا دوسرا طریقہ ہے۔ لیکن دونوں میں جذبۂ عقیدت کا رس ضروری ہے۔ پھول چڑھاتے وقت اگر قلبی عقیدت نہیں ہے تو وہ پھول پتھر پر ہی چڑھے۔ اس لئے اصل چیز عقیدت ہے۔ سگن اور نرگن، کرم اور پریم، گیان اور بھگتی، یہ سب چیزیں ہم شکل ہی ہیں۔ اور دونوں کا آخری تجربہ ایک ہی ہے۔

اودھو اور ارجن کی بات لو۔ راماین سے میں ایک دم مہابھارت میں آ کودا۔ اس کا مجھے اختیار بھی ہے، کیونکہ رام اور کرشن دونوں ہم شکل ہی ہیں۔ جیسے بھرت اور لکشمن ہیں ویسے اودھو اور ارجن ہیں۔ جہاں کرشن، وہاں اودھو موجود ہی ہے۔ اودھو کو کرشن کی جدائی لمحہ بھر بھی برداشت نہیں۔ وہ ہمیشہ کرشن کی خدمت میں مصروف رہتا ہے۔ کرشن کے بغیر سارا سنسار اسے پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ ارجن بھی کرشن کا دوست ہے۔ لیکن وہ دور دِلّی میں رہتا تھا۔ ارجن کرشن کا کام کرنے والا تھا۔ لیکن کرشن دوارکا میں تو ارجن ہستناپور میں! اس طرح کا دونوں میں تعلق تھا۔ جب کرشن کو قالب انسانی چھوڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو انہوں نے اودھو سے کہا۔ "اودھو! اب میں جا رہا ہوں۔" اودھو نے پوچھا۔ "کیا مجھے اپنے ساتھ نہیں لے چلیں گے؟ ہم دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔" لیکن کرشن نے کہا۔ "مجھے یہ پسند نہیں۔ سورج اپنی تجلی آگ میں رکھ جاتا ہے اسی طرح میں اپنی روشنی تجھ میں چھوڑے

جاتا ہوں"۔ اس طرح بھگوان نے آخری وصیت کی اور اسے گیان دے کر روانہ کیا۔ دورانِ سفر میں ادھو کو میترے رشی سے معلوم ہوا کہ بھگوان اپنے لوک کو چلے گئے، مگر اس کے قلب پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا، گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہے

"گرو مرا تو چیلا رو دیا، اس طرح دونوں نے احساس کھو دیا۔"

ایسا حال ان کا نہیں تھا۔ گویا جدائی ہوئی ہی نہیں۔ اس نے زندگی بھر سگن بھگتی کی تھی۔ پرمیشور کے پاس ہی رہتا تھا۔ مگر اب اسے نرگن میں مزہ آنے لگا تھا۔ اس طرح اسے نرگن کی منزل طے کرنی پڑی۔ پہلے سگن کی، پھر نرگن کی سیڑھی آنی ہی چاہیے۔ نہیں تو تکمیل نہیں ہوگی۔

ارجن کا حال اس سے مختلف تھا۔ شری کرشن نے اسے کیا کہنے کے لئے کہا تھا؟ اپنے بعد سب عورتوں کی حفاظت کا بار انہوں نے ارجن پر ہی ڈالا۔ ارجن دلی سے آیا اور دوارکا سے شری کرشن کے گھر کی عورتوں کو لے کر چلا۔ راستہ میں حصار کے پاس پنجاب کے چوروں نے اسے لوٹ لیا۔ جو ارجن اس زمانہ میں واحد مرد کہلاتا تھا، بہت بڑا بہادر شہسوار تھا، جو شکست جانتا ہی نہ تھا، اس نے جے (فتح) نام سے ہی مشہور ہو گیا تھا، جس نے دو بدو شنکر سے مقابلہ کیا اور انہیں جھکا دیا، وہی اجمیر کے پاس بھاگتے بھاگتے بچا۔ کرشن کے چلے جانے کا بڑا اثر اس کے من پر ہوا تھا۔ گویا اس کی جان ہی چلی گئی، اور غیر محفوظ اور بے جان جسم ہی باقی رہ گیا۔ مطلب یہ کہ ہمیشہ کام کرنے والے، کرشن سے دور رہنے والے نرگن بھگت ارجن کو آخر میں یہ جدائی ناقابلِ برداشت اور گراں گزری۔ اس کے نرگن کو آخر میں جدائی کی زبان اختیار کرنی پڑی۔ اس کا سارا کام ہی گویا ختم ہو گیا اور بالآخر اس کے نرگن کو سگن کا تجربہ ہوا۔ خلاصہ یہ کہ سگن کو نرگن میں جانا پڑتا ہے اور نرگن کو سگن میں آنا پڑتا ہے۔ اس طرح دونوں کی ایک دوسرے سے تکمیل ہوتی ہے۔

(۶۵) دونوں ایک ہی ہیں: ذاتی تجربہ

اس لئے جب یہ کہنے کی نوبت آتی ہے کہ سگن بھگت اور نرگن بھگت میں کیا فرق ہے تو زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ سگن اور نرگن آخر میں ایک ہو جاتے ہیں ـــ چشمۂ بھکتی سگن سے اگر پہلے نکلا ہو تو بھی بالآخر وہ نرگن تک جا پہنچتا ہے۔ پرانی بات ہے، میں وائیکم کا ستیاگرہ دیکھنے گیا تھا۔ مالابار کے کنارے شنکر آچاریہ کی جائے پیدائش ہے۔ اس جغرافیہ کی بات کا مجھے دھیان تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جدھر سے میں جا رہا تھا وہیں کہیں پاس ہی بھگوان شنکر آچاریہ کا "کالڑی" گاؤں ہوگا۔ میں نے اپنے ساتھی ملیالی سے پوچھا تو اس نے کہا۔ وہ یہاں سے دس بارہ میل پر ہی ہے۔ آپ جانا چاہتے ہیں کیا؟ میں نے انکار کر دیا۔ میں جا رہا تھا ستیہ گرہ دیکھنے کے لئے، اس لئے مجھے کہیں اور جانا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ میں اس وقت اس گاؤں کو دیکھنے نہیں گیا۔ مجھے اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کر کے میں نے اچھا ہی کیا۔ مگر رات کو جب میں سونے لگا تو وہ کالڑی گاؤں اور شنکر آچاریہ کی وہ صورت میری آنکھوں کے سامنے بار بار آنے لگتی اور میری نیند اڑ جاتی۔ وہ احساس مجھے آج بھی جیوں کا تیوں ہو رہا ہے۔ شنکر آچاریہ کا وہ گیان کا تاثر ہے۔ ان کا وہ روحانی وحدانیت کا عقیدہ، سامنے پھیلے ہوئے سنسار کو جھوٹا ٹھہرانے والا ان کا وہ عجیب اور زبردست بیراگ، ان کی وہ سنجیدہ گفتگو۔ اور مجھ پر ان کے بے شمار احسانات۔ ان سب کی رہ رہ کر مجھے یاد آنے لگی۔ رات کو یہ سب تصورات میرے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ نرگن میں سگن کیسے لبالب بھرا ہوا ہے۔ دو بدو ملاقات ہونے میں بھی اتنا پریم نہیں ہوتا۔ نرگن میں بھی سگن کی اعلیٰ فضیلت کھرے طور پر بھری ہوئی ہے۔ اکثر میں خیر و عافیت وغیرہ کے خط نہیں لکھتا، مگر کسی

دوست کو خط نہ لکھنے پر بھی اندر سے اس کی یاد ہمیشہ رہتی ہے۔ خط نہ لکھتے ہوئے بھی اس کی یاد دل میں لبالب بھری رہتی ہے، جس طرح نرگن میں سگن چھپا رہتا ہے۔ سگن اور نرگن دونوں ایک ہی روپ ہیں۔ ظاہرہ مورتی کو لے کر پوجا کرنا عیاں طور سے سیوا کرنا، اور اندر سے ہمیشہ سنسار کی بہبودی کی فکر رکھتے ہوئے باہر سے عملِ عبادت کا دکھائی نہ دینا۔ ان دونوں کی قیمت اور اہمیت یکساں ہے۔

(۴۶) اس لئے بھگت کی صفات پیدا کریں

آخر میں مجھے کہنا یہ ہے کہ سگن کیا اور نرگن کیا، اس کا فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ ایک لحاظ سے جو سگن ہے، دوسرے نقطۂ نظر سے نرگن ٹھہر سکتا ہے۔ سگن کی سیوا ایک پتھر کو لے کر کی جاتی ہے۔ اس پتھر میں بھگوان کا تصور کر لیتے ہیں۔ ہمارے ماتا اور دوسرے سنتوں میں بھی صاف طور پر ایشور ظاہر ہوا ہے۔ ان میں گیان، پریم اور صدقِ دلی صاف طور پر نظر آتی ہے، مگر انکو پرماتما مان کر انکی پوجا نہیں کرتے۔ یہ ایشور بھری ہستیاں تو سب کو دکھائی دیتی ہیں اس لئے ان کی سیوا کرنی چاہیئے۔ ان میں سگن پرماتما کے درشن کرنا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہ کرتے ہوئے لوگ پتھر میں ایشور دیکھتے ہیں۔ اب ایک طرح سے پتھر میں ایشور کو دیکھنا انتہا درجہ کی نرگن بھگتی ہے۔ سنت، ماں باپ، پڑوسی ان میں محبت، گیان اور فہم نیک ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں ایشور کو ماننا تو آسان ہے، لیکن پتھر میں ایشور ماننا مشکل ہے۔ اس نربدا کے پتھر کو ہم شنکر مانتے ہیں۔ یہ کیا نرگن پوجا نہیں ہے؟ اس کے برعکس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر پتھر میں ایشور کا قائم نہ کیا جائے، تو پھر کہاں کیا جائے؟ بھگوان کی مورتی ہونے کے لائق وہ پتھر ہی ہے۔ وہ بے عیب ہے، پُرسکون ہے۔ اندھیرا ہو، روشنی ہو۔ گرمی ہو، سردی ہو، وہ پتھر جیوں کا تیوں ہی رہتا ہے۔ ایسا یہ بے عیب

پتھر ہی پرمیشور کی علامت ہونے کے لائق ہے۔ ماں باپ، اڑوسی پڑوسی، یہ سب عیبوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یعنی ان میں کچھ نہ کچھ خرابی مل ہی جاتی ہے۔ اس لئے پتھر کی پوجا کرنے کے بہ نسبت ان کی خدمت کرنا ایک لحاظ سے مشکل ہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ سگن و نرگن ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ سگن آسان ہے۔ نرگن مشکل ہے۔ مگر دوسری طرح سے سگن بھی مشکل ہے اور نرگن بھی آسان ہے۔ دونوں کے ذریعہ ایک ہی مقصد حاصل ہوتا ہے۔ پانچویں ادھیائے میں جیساکہ بتایا ہے ۲۴ گھنٹہ کام کرکے بھی ذرا بھی کام نہ کرنے والا اور ۲۴ گھنٹے کچھ بھی کام نہ کرکے سبھی کام کرنے والا ایسے یوگی اور سنیاسی دونوں ایک روپ ہی ہیں۔ ویسے ہی یہاں بھی ہے۔ سگن کرم کی کیفیت اور نرگن سنیاس یوگ دونوں ایک ہی روپ ہیں۔ سنیاس یوگ افضل ہے یا کرم یوگ۔ اس کا جواب دینے میں جیسے بھگوان کو مشکل پڑی، ویسی ہی دقت یہاں بھی ہوئی ہے۔ آخر میں آسان اور مشکل کے لحاظ سے جواب دینا پڑا، ورنہ کیا کرم یوگ اور کیا سنیاس یوگ، کیا سگن اور کیا نرگن دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ آخر میں بھگوان کہتے ہیں:—

"ارجن تم چاہے سگن رہو یا نرگن لیکن بھکت ضرور رہو۔ گول مٹول پتھر مت رہو" یہ کہہ کر آخر میں بھگت کی علامتیں بتا دی ہیں۔ امرت میٹھا ہوگا، مگر ہمیں اس کی مٹھاس چکھنے کا موقع نہیں ملا تاہم یہ علامتیں براہِ راست شیریں ہیں۔ اس میں تصور کی ضرورت نہیں ہے۔ ان علامتوں کا ہم احساس اور تجربہ کریں۔ بارھویں باب کے ان بھگت کی علامتوں کا "استھت پرگیہ" (قائم العقل) کی علامتوں کی

طرح ہمیشہ ہمیں استعمال کرتے رہنا چاہیئے۔ ان پر غور وفکر کرنا چاہیئے اور انہیں تھوڑا تھوڑا اپنے جیون میں لاکر قوت حاصل کرنی چاہیئے اور اس طرح دھیرے دھیرے ہمیں اپنی زندگی پرمیشور کی طرف لے جانی چاہیئے۔

اتوار ۸ - ۵ - ۳۴

تیرہواں باب

روح اور غیر روح کا امتیاز

(۶۷) روح اور جسم کا امتیاز کرم یوگ میں معاون

ویاس دیو نے اپنی زندگی کا نچوڑ بھگوت گیتا میں رکھ دیا ہے۔ انہوں نے شرح وبسط کے ساتھ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اکیلے مہابھارت میں لاکھ سوا لاکھ اشلوک (اشعار) ہیں۔ سنسکرت میں لفظ ویاس کے معنی ہی ہیں "وسعت"۔ لیکن بھگوت گیتا میں ان کا رجحان وسعت کی طرف نہیں ہے۔ علم اقلیدس میں جس طرح اقلیدس نے اصول اور قیاسات بتا دیے ہیں، اسی طرح زندگی کے لئے مفید باتیں گیتا میں ویاس نے بعد دیگرے لکھ دیے ہیں۔ بھگوت گیتا میں نہ تو خاص طور پر وضاحت کی ہے، نہ تشریح ہی۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ جو باتیں گیتا میں کہی گئی ہیں انہیں ہر شخص اپنی زندگی ہی میں آزما سکتا ہے۔ وہ اس لئے کہی گئی ہیں کہ لوگ ان کی جانچ پڑتال کر سکیں۔ جتنی باتیں زندگی کے لئے مفید اور کارآمد ہیں، اتنی ہی گیتا میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے کہنے کا مقصد بھی اتنا ہی تھا، اس لئے انہوں نے تھوڑے میں اصول بتا کر قناعت کیا ہے۔ ان کی قناعت میں ہمیں ان کی صداقت اور روحانی تجربات کا اعتقاد کامل دکھائی دے جاتا ہے۔ جو بات صحیح ہے

اس کی تائید کے لئے زیادہ دلائل کام میں لانے کی ضرورت نہیں رہتی۔
ہم جو گیتا کی طرف دھیان لگائے رہتے ہیں اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ زندگی میں جب جب ہمیں کسی مدد یا سہارے کی ضرورت محسوس ہو تو وہ ہمیں گیتا سے ملتی رہے۔ اور وہ ہمیں ہمیشہ مل سکتی ہے۔ گیتا زندگی کی ایک کارآمد کتاب ہے۔ اور اس لئے اس میں سودھرم (فرائضِ منصبی) پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کا بڑا سہارا اگر کچھ ہے، تو وہ سودھرم، آچرن (ادائے فرضِ منصبی) ہی ہے۔ انسانی زندگی کی ساری عمارت اسی بنیاد پر کھڑی کرنی ہے۔ یہ پایہ جتنا مضبوط ہوگا، اتنی ہی یہ عمارت زیادہ پائیدار اور مضبوط ہوگی۔ اس سودھرم آچرن (ادائے فرضِ منصبی) کو گیتا میں کرم کہا گیا ہے۔ اس ادائے فرضِ منصبی کے عمل کے ارد گرد گیتا میں بہت سے عنوان قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے مختلف وکرم (جذباتِ باطنی) بھی بتا دیئے گئے ہیں۔ سودھرم آچرن کو آراستہ کرنے، اسے خوبصورت اور کامیاب بنانے کے لئے جن جن سہاروں اور امداد کی ضرورت ہے، وہ سب اسے دینا ضروری ہیں، اس لئے اب تک ایسی بہت سی چیزیں ہم نے دیکھیں۔ ان میں بہت سی بھگتی کے روپ میں تھیں۔ آج تیرہویں باب میں جو چیز ہمیں دیکھنی ہے وہ بھی سودھرم آچرن میں بہت فائدہ مند ہے۔ اس کا تعلق تصورات سے ہے۔

گیتا میں یہ بات خاص طریقہ سے ہر جگہ کہی گئی ہے کہ سودھرم آچرن کے عامل کو پھل تیاگ (ترکِ ثمر) کرنا چاہیئے۔ کام تو کریں، مگر اس کا پھل چھوڑ دیں۔ پیڑ کو پانی پلاؤ، اس کی پرورش کرو، لیکن اس کے سایہ اور پھل پھول کی اپنے لئے خواہش مت رکھو۔ یہ سودھرم آچرن کی شکل

کرم یوگ ہے۔ کرم یوگ کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ کام کرتے رہو۔ کام تو اس دنیا میں ہر جگہ ہو ہی رہا ہے، اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ لیکن سودھرم آچرن والا کام محض کام نہیں ہے۔ اچھی طرح کام کر کے اس کا پھل چھوڑ دینا، یہ بات کہنے اور سمجھنے میں بڑی سہل معلوم ہوتی ہے کہ لیکن عمل میں مشکل ہے کیونکہ کسی کام کی محرک طاقت ہی خواہشِ ثمر بانی گئی ہے۔ خواہشِ ثمر کو چھوڑ کر کام کرنا الٹا راستہ ہے۔ بیوہار یا دنیا کے معمول کے خلاف یہ کام ہے۔ جو کوئی بہت کام کرتا ہے، اسکی زندگی میں گیتا کا کرم یوگ ہے۔ ہم اکثر کہتے ہیں کہ بہت کام کرنے والے کی زندگی کرم یوگ سے پُر ہے۔ لیکن اس قول میں وسعت ہے۔ گیتا کی تشریح کے مطابق وہ کرم یوگ نہیں ہے۔ لاکھوں کرنے والوں میں نہ صرف کام ہی بلکہ سودھرم آچرن والا کام کرنے والے لاکھوں لوگوں میں بھی گیتا کے کرم یوگ کا عامل شاذو نادر ہی ملے گا۔ کرم یوگ کے لطیف اور حقیقی معنی میں دیکھا جائے تو ایسا مکمل کرم یوگی شاید ہی کہیں ملے۔ کام کرنا، لیکن اس کے پھل کو چھوڑ دینا، غیر معمولی بات ہے۔ اب تک گیتا میں یہی تجزیہ اور یہی تفریق ظاہر کی گئی ہے۔

اس تجزیہ یا تفریق کے لئے ہی ایک دوسری امتیازی علامت اس تیرہویں باب میں بتائی گئی ہے۔ کام کریں اور اس کے پھل کی چاہ چھوڑ دیں اس تجزیہ کا معاون ایک اعلیٰ تفریق "جسم اور روح کی علیحدگی" ہے۔ یہی تیرہویں باب میں بتایا گیا ہے۔ آنکھوں سے ہم جس شکل کو دیکھتے ہیں، اسے ہم صورت، آکار اور جسم کہتے ہیں۔ اگرچہ بیرونی صورت کا احساس ہماری آنکھوں کو ہو گیا تو بھی شے کے باطن میں ہمیں داخل ہونا پڑتا ہے۔ پھل کا اوپری چھلکا نکال کر اس کا اندرونی گودا چکھنا ہی پڑتا ہے۔ ناریل کو بھی توڑ کر اندر سے دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ کٹہل پر کانٹے لگے رہتے ہیں، تاہم اندر بڑھیا اور رسیلا گودا بھرا رہتا ہے۔ ہم چاہے

اپنی طرف دیکھیں، چاہے دوسروں کی طرف، یہ اندر اور باہر کی تفریق کرنا ضروری ہو جاتا ہے تو پھر چھلکا الگ کرنے کا مطلب کیا؟ اس کا یہی مطلب ہے کہ ہر چیز کے اندرونی گودے کو اس کی بیرونی شکل سے علیحدہ کیا جائے، بیرونی جسم اور اندرونی روح۔ اس طرح ہر چیز کی دوہری ہیئت ہے۔ کرم میں بھی یہی بات ہے۔ بیرونی ثمر فعل کا قالب ہے اور فعل کی بدولت جو قلبی صفائی ہوتی ہے۔ وہ اس فعل کی آتما۔ روح ہے۔ سودھرم آچرن کے بیرونی ثمر کے قالب کو چھوڑ کر قلبی پاکیزگی کی شکل میں اندرونی آتما۔ روح کو ہم قبول کریں۔ اور محیطِ قلب کرلیں۔ اس طرح دیکھنے کی عادت قالب کو ہٹا کر ہر چیز کی روح قبول کرنے کی حقیقت گیر نگاہ ہمیں حاصل کرنی چاہیئے۔ آنکھوں کو من کو اور تصورات کو ایسی ہی تعلیم، عادت اور مشق کرا دینی چاہیئے۔ ہر بات میں جسم کو الگ کر کے آتما کی پوجا کرنی چاہیئے۔ ہمارے غور و خوض کے لئے یہی تفریق کرنے کی اشق تیرھویں باب میں بتائی گئی ہے۔

(۶۸) سُدھار کا سنگِ بنیاد

اس حقیقت گیر نظریہ کو اپنانے کا خیال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر بچپن سے ہی ہم ایسی عادت ڈال لیں تو کتنا اچھا ہو! یہ مضمون ہضم کر لینے اور یہ نظریہ قبول کر لینے کے لائق ہے۔ بہت لوگوں کا خیال ہے کہ علمِ روحانیت کا زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا ایسا بھی خیال ہے کہ اگر کوئی واسطہ ہو بھی تو وہ نہ ہونا چاہیئے۔ جسم سے روح کو الگ سمجھنے کی تعلیم کا بچپن سے ہی بندوبست کیا جا سکے، تو وہ بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ یہ علمِ تربیت کا مضمون ہے۔ آج کل بری تعلیم کی وجہ سے بہت برے اثرات بچوں کی محبت پر پڑ رہے ہیں۔ "میں صرف جسم ہوں" یہ تعلیم ہمیں اس کے آگے نہیں لے جاتی۔ سب بچے نچلے جسم ہی کے پجاری رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جسم کو جو ہیئت حاصل ہونا

چاہیئے، جو شکل دینی چاہیئے، وہ تو کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اس طرح جسم کی یہ فضول پوجا ہو رہی ہے۔ روحانی مٹھاس کی طرف دھیان ہی نہیں ہے۔ یہ حالت ہماری موجودہ طرزِ تعلیم کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ اسی طرح جسم کی پوجا کی مشق دن رات کرائی جاتی ہے۔

بلکہ بچپن ہی سے ہمیں اس جسم دیوتا کی پوجا کرنی سکھائی جاتی ہے۔ ذرا کہیں پاؤں میں ٹھوکر لگ جاتی ہے، تو مٹی لگا لینے سے کام چل جاتا ہے، بچہ کا اتنے سے کام بن جاتا ہے۔ یا مٹی لگانے کی بھی ضرورت اسے نہیں معلوم ہوتی۔ تھوڑی بہت چوٹ خراش کی، تو وہ پرواہ بھی نہیں کرے گا۔ لیکن اس بچے کا جو نگہبان یا سرپرست ہے، وہ اتنے سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ بچّہ کو پاس بلا کر، پچکار کر کہے گا "چوٹ لگ گئی؟ کیسے لگی؟ کہاں لگی؟ ارے بہت چوٹ لگی معلوم ہوتی ہے۔ ارے! ارے! خون نکل آیا!" ایسا کہہ کر وہ بچہ نہ روتا ہو تو اُلٹا اُسے رُلا دیتے ہیں۔ نہ رونے والے بچہ کو رُلانے کی ان حرکتوں کو کیا کہا جائے۔ انہیں صرف جسم پر ہی دھیان دینے والی یکطرفہ تعلیم دی جاتی ہے کہ کود پھاند مت کرو۔ کھیلنے مت جاؤ۔ دیکھو گر پڑو گے۔ چوٹ لگ جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ!

بچہ کا اگر لاڈ پیار بھی کرنا ہو، تو وہ بھی اس کے جسم ہی کے لحاظ سے، اس کی بُرائی بھی جسم ہی کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ کہتے ہیں "کیا گندہ ہے رے! اس سے بچہ کو کتنی چوٹ لگتی ہے! کیسا جھوٹا الزام ہے! یہاں گندگی ہے، یہ صحیح ہے۔ اسے صاف کرنا چاہیئے یہ بھی صحیح ہے۔ لیکن اس گندگی کو آسانی سے صاف نہ کر کے اس بچہ پر کتنا جبر کیا جاتا ہے؟ بچہ اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بڑا دکھی ہو جاتا ہے۔ اس کے باطن میں

روح میں صفائی و پاکیزگی بھری ہے، تو بھی اس پر گندہ رہنے کا یہ کتنا بیکار الزام ہے۔ حقیقت میں وہ لڑکا گندہ نہیں ہے، بلکہ جو انتہائی خوب صورت، شیریں، پاک اور پیارا پرماتما ہے، وہی وہ ہے۔ اسی کا جزو اس میں موجود ہے، لیکن اسے کہتے ہیں گندا۔ اس گندگی سے اس کا تعلق کیا ہے، بچہ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا اور اسی لئے وہ اس جبر کو برداشت نہیں کر پاتا۔ اس کے من میں دکھ ہوتا ہے۔ اور جب دکھ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اصلاح نہیں ہو سکتی، اس لئے اسے اچھی طرح سمجھا کر صاف ستھرا رکھنا چاہیئے۔

اس کے برخلاف عمل کر کے ہم اس لڑکے کے من پر یہ نقش کرتے ہیں کہ وہ جسم ہے۔ علمِ تربیت کا یہ ایک اہم اصول سمجھنا چاہیئے کہ استاد کے دل میں یہ جذبہ ہونا چاہیئے کہ میں جسے پڑھا رہا ہوں وہ پورے طور سے اچھا ہے۔ علمِ حساب کے سوال میں بھول ہو گئی تو گال پر طمانچہ لگاتے ہیں۔ اس طمانچہ سے اور سوال کی بھول سے کیا تعلق ہے؟ مدرسہ میں دیر سے آیا، تو لگایا چانٹا! اس سے اس کے چہرہ پر خون کا دباؤ تیز ہونے لگے گا۔ مگر اس سے کیا وہ جلدی آئے گا؟ خون کی یہ تیزی کیا اسے بتا سکے گی کہ اس وقت کیا بجا ہے؟ سچ پوچھیئے تو اس طرح مار پیٹ سے ہم اس بچہ کی حیوانیت کو ہی بڑھاتے ہیں۔ "تم یہ جسم ہی ہو"۔ یہ جذبہ مضبوط کرتے ہیں۔ اس کی زندگی ہراس خوف کی دیوار پر کھڑی کر رہے ہیں۔ اگر واقعی ہمیں سدھار کرنا ہے، تو اس طرح زبردستی کر کے جسمانی لگاؤ بڑھانے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ جب میں یہ سمجھ لوں گا کہ میں جسم سے علیحدہ ہوں، تب ہی میرا سدھار ہو سکے گا۔

جسمانی یا قلبی عیوب کا علم ہو جانا برا نہیں ہے۔ اس سے ان عیوب کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات صاف طور سے معلوم رہنی چاہیئے

کہ میں جسم نہیں ہوں" ۔ "میں" جو ہوں، وہ اس جسم سے بالکل الگ، جدا، نہایت عمدہ، صاف اور بے عیب ہوں۔ اپنے عیبوں کو دور کرنے کے لئے جو شخص باطنی تنقیہ کرتا ہے، وہ بھی تو اپنے کو جسم سے الگ کر کے ہی ایسا کرتا ہے۔ اس لئے جب کوئی اسے اس کا عیب دکھاتا ہے تو وہ برا نہیں مانتا، غصہ نہیں کرتا۔ بلکہ یہ سوچ کر کہ اس جسمانی اور دماغی مشین میں کیا خرابی ہے اس عیب کو دور کرتا ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص جسم کو اپنے سے الگ نہیں مانتا، وہ سدھار کر ہی نہیں سکتا ہے۔ یہ جسم، یہ قالب، یہ مٹی کا پتلا، بس یہی حقیقت ہے میری، ایسا جو مانے گا، وہ اپنی اصلاح کیسے کرے گا؟ اصلاح اسی وقت ہو سکے گی، جب ہم یہ مانیں گے کہ یہ جسم بطور وسیلہ کے مجھے ملا ہے۔ چرخہ میں اگر کسی نے کوئی کمی یا نقص دکھایا، تو کیا مجھے غصہ آتا ہے؟ بلکہ اگر واقعی کوئی خرابی ہوتی ہے تو میں اسے دور کرتا ہوں۔ یہی حالت جسم کی سمجھئے۔ جیسے کھیتی کے اوزار ویسا ہی یہ جسم سمجھو۔ یہ جسم بھگوان کے گھر کی کھیتی کرنے کا ایک آلہ ہی ہے۔ یہ آلہ اگر خراب ہو جائے، تو اسے ضرور بنانا، سدھارنا چاہیئے۔ یہ جسم ایک وسیلہ کی شکل میں موجود ہے۔ اس لئے اس جسم سے اپنے کو علیحدہ رکھ کر برائیوں سے دور رہنے کی کوشش ہمیں کرنی چاہیئے۔ اس جسمانی وسیلہ سے میں جدا ہوں، میں مالک ہوں، میں آقا ہوں، اس جسم سے کام کرانے والا، اس سے اعلیٰ خدمت لینے والا میں ہوں۔ بچپن ہی سے اس طرح جسم سے الگ رہنے کا جذبہ بیدار کرنا چاہیئے۔

کھیل سے الگ رہنے والے غیر متعلقین یا غیر جانبدار جس طرح کھیل کی غلطیوں اور خوبیوں کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں، اسی طرح ہم بھی دیہہ، من اور بدھی سے اپنے کو الگ رکھ کر ہی ان کے عیوب و اوصاف کی جانچ کر سکیں گے۔ بعض لوگ

کہتے ہیں کہ "اب ذرا میری یادداشت خراب ہو گئی ہے۔ اس کا کوئی علاج بتلائیے"۔ جب انسان ایسا کہتا ہے تو اس وقت صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ قوتِ حافظہ سے جدا ہے۔ وہ کہتا ہے "میری قوتِ حافظہ خراب ہو گئی ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی ذریعہ اوزار بگڑ گیا ہے۔ کسی کا لڑکا کھو جاتا ہے، کسی کی کتاب گم ہو جاتی ہے، مگر کوئی خود نہیں کھو جاتا۔ آخر میں مرتے وقت اس کا جسم ہی سب طرح سے برباد ہو جاتا ہے، بیکار ہو جاتا ہے۔ مگر وہ خود اندر سے جیوں کا تیوں رہتا ہے۔ وہ بے عیب اور تندرست رہتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کے لائق ہے۔ اگر سمجھ میں آجائے، تو اس سے بہتیری الجھنوں اور جھنجھٹوں سے نجات حاصل ہو جائے گی،

(۶۹) جسمانی محبت سے زندگی میں رکاوٹ

جسم ہی میں ہوں، یہ خیال جو ہر طرف پھیل رہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نے بلا سوچے ہی جسمانی طاقت بڑھانے کے لئے مختلف قسم کے وسیلے اختیار کر لئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر بڑا خوف معلوم ہوتا ہے۔ انسان ایسے بھی سوچا کرتا ہے کہ گو یہ جسم پرانا ہو گیا ہے، لاغر و بے مصرف ہو گیا ہے "تاہم کسی نہ کسی طرح اسے قائم ہی رکھنا چاہیئے۔ لیکن اس جسم کو اس قالب کو آخرکار آپ کب تک قائم رکھ سکیں گے؟ صرف مرنے تک ہی! جب موت کا وارنٹ آجائے گا تو پل بھر بھی یہ جسم قائم نہیں رہ سکے گا۔ موت کے آگے سارا گھمنڈ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اس ناچیز و فانی جسم کے لئے انسان مختلف قسم کے ذرائع اختیار کرتا ہے دن رات اس جسم کی فکر کرتا ہے۔ اب کہتے ہیں کہ بدن کی حفاظت کے لئے ماس (گوشت) کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ گویا آدمی کا بدن بڑا قیمتی ہے جو اسے بچانے کے لئے گوشت کھائیں؟ جانور کا جسم کم قیمت ہے — یہ کیوں؟

آدمی کا جسم قیمتی کیوں ہوا؟ کیا سبب ہے؟ جانور جو چاہے کھا سکتا ہے۔ سوائے خود غرضی کے اسے دوسرا خیال ہی نہیں ہوتا۔ مگر انسان کے لئے ایسی بات نہیں ہے۔ انسان اپنے پاس پڑوس کی مخلوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اس لئے انسانی جسم کی قیمت ہے، وہ قیمتی ہے۔ لیکن جس وجہ سے آدمی کا جسم قیمتی ثابت ہوا، اسی کو ہم گوشت کھا کر ضائع کر دیتے ہیں۔ بندۂ خدا! کیا تمہاری عظمت اسی بات پر موقوف نہیں ہے کہ تم تقویٰ اور پرہیزگاری سے رہتے ہو، دوسرے جانداروں کی حفاظت اور بہبودی کے لئے کوشش کرتے ہو؟ اپنی اصلیت سنبھال کر رکھنے کی خواہش تمہارے اندر ہے۔ جانوروں سے مختلف جو یہ خصوصیت تم میں ہے، اسی سے تو انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ اسی لئے قالب انسانی مشکل الحصول مانا گیا ہے۔ لیکن جس بنیاد پر انسان اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے، اگر اسی بنیاد کو وہ اکھاڑنے لگے، تو پھر اس کی فضیلت کی عمارت کیسے قائم رہ سکے گی؟ معمولی جانور جو دوسرے جانوروں کا گوشت کھا کر زندہ رہتے ہیں، وہی حرکت اگر آدمی بلا جھجک کرنے لگے، تو پھر اس کی فضیلت کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ تو وہی بات ہوگی کہ جس ڈال پر میں بیٹھا ہوں اسی کو کاٹ رہا ہوں۔

آج کل طبی دنیا میں طرح طرح کے کرشمے دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ زندہ جانور کے جسم کو بھونک کر اس میں امراض کے جراثیم داخل کئے جاتے ہیں، تاکہ تجربہ کر سکیں کہ ان امراض کا اس پر کیا اثر ہوا۔ زندہ جانور کو اس طرح انتہائی تکلیف دے کر جو علم حاصل کیا جاتا ہے، اس کا استعمال اس حقیر انسانی جسم کو بچانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور یہ سب حرکتیں ہمدردیٔ خلق کے نام پر کی جاتی ہیں۔ جانوروں

کے بدن میں جراثیم پیدا کر کے ان کا سیرم نکال کر انسانی جسم میں داخل کرتے ہیں۔ ایسے مختلف قسم کے خوفناک کام ہو رہے ہیں۔ جس جسم کے لئے ہم یہ سب کچھ کرتے ہیں وہ تو ایک کچے کانچ کی طرح پل بھر میں پھوٹ سکتا ہے۔ وہ کب پھوٹے گا، اس کا ذرا بھی اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انسانی جسم کی حفاظت کے لئے یہ ساری کوششیں ہو رہی ہیں، پھر بھی آخر میں انجام کیا ہوتا ہے؟ جوں جوں اس نازک جسم کو سنبھالنے کی تدبیر کی جاتی ہے تیوں تیوں اس کی بربادی زیادہ سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ایسا تجربہ ہمیں ہوتا رہا ہے، پھر بھی اس جسم کو موٹا تازہ کرنے اور اس کی عظمت بڑھانے کی کوشش برابر جاری ہے۔

ہمارا دھیان کبھی اس طرف نہیں جاتا کہ کس قسم کی غذا کھانے سے ہماری سمجھ ساتوک (اچھی) ہوگی۔ انسان اس بات کو قطعی نہیں دیکھ رہا ہے کہ من کو اچھا بنانے کے لئے، سمجھ کو صاف اور تیز رکھنے کے لئے کس چیز کی مدد لینی چاہیئے وہ تو صرف یہی دیکھتا ہے کہ جسم کا وزن کس طرح بڑھے گا۔ اور اس کو بھی فکر رہتی ہے کہ زمین کی مٹی اٹھا کر کس طرح اس کے بدن پر چپک جائے۔ مٹی کے لوندے اس کے جسم پر کیسے تھپ جائیں۔ پر جیسے تھوپا ہوا گوبر کا کنڈا سوکھنے پر پھر نیچے گر پڑتا ہے، اسی طرح بدن پر چڑھایا ہوا مٹی کا لیپ۔ یہ چربی آخر گل جاتی ہے اور جسم پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ آخر اس کا مطلب کیا؟ کہ جسم پر اتنی مٹی چڑھالیں، اتنا وزن بڑھالیں کہ جسم اس کا بوجھ ہی نہ سنبھال سکے۔ جسم کو فضول اتنا موٹا بنایا ہی کیوں جائے؟ بیشک یہ جسم ہمارا ایک وسیلہ ہے اس لئے اسے ٹھیک رکھنے کے لئے جو ضروری ہے وہ سب ہمیں کرنا چاہیئے، مشین سے کام لینا چاہیئے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ مشین کا بھی گھمنڈ ہو تو پھر اس جسمانی مشین کے بارے میں بھی ہم اسی طرح کیوں نہ سوچیں؟

خلاصہ یہ کہ جسم مدعا نہیں ہے بلکہ ایک وسیلہ ہے۔ اگر ہمارا یہ خیال

مضبوط ہوجائے، تو پھر جسم کا جو اتنا طومار باندھا جاتا ہے، قائم نہ رہے گا۔ ہمیں زندگی کچھ اور ہی دکھائی دے گی۔ اس جسم کو سجانے میں ہمیں ناز نہ ہوگا۔ سچ پوچھئے تو اس جسم کے لئے ایک معمولی سادہ کپڑا ہی کافی ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ نرم ملائم ہو، اس کا رنگ بڑھیا ہو، خوب صورت چھپائی ہو، اچھے کنارے بیل بوٹے ہوں، کلابتو ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے ہم مختلف لوگوں سے طرح طرح کی محنت اور مشقت کراتے ہیں۔ آخر یہ سب کیوں؟ اس بھگوان کو کیا عقل نہ تھی؟ اگر اس جسم کے لئے سندر بیل بوٹوں اور نقاشی کی ضرورت ہوتی، تو جیسے شیر کے جسم پر اس نے کاریگری کی کرامت دکھائی ہے، کیا تمہارے ہمارے جسم پر نہ دکھاتا؟ کیا اس کے لئے یہ ناممکن تھا؟ مور کی طرح ہمارے بھی خوب صورت پونچھ لگا سکتا تھا۔ لیکن انسان کو خدا نے ایک ہی رنگ دیا ہے۔ اس میں ذرا بھی داغ پڑجاتا ہے، تو اس کا تمام حسن ضائع ہوجاتا ہے۔ انسان جیسا ہے، ویسا ہی خوبصورت ہے۔ خدا کا ہرگز یہ منشاء نہیں معلوم ہوتا کہ انسان اپنے جسم کو سجائے۔ کائنات میں کیا کم خوبصورتی ہے؟ انسان کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہے، لیکن وہ راستہ بھول گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جرمنی نے ہمارے رنگ کو مار دیا۔ ارے بھائی! تمہارے من کا رنگ تو پہلے ہی مرچکا۔ اب تمہیں اس بناوٹی رنگ کا شوق پیدا ہوا۔ اسی کی بدولت تم دوسروں کے محتاج ہوگئے۔ بلا وجہ تم اس حیوانی سجاوٹ کے چکر میں پڑ گئے۔ من کی سجاوٹ، فہم کی تیزی و خوبیٔ قلب تو درکنار۔

(۷۰) وہ تو ہی ہے!

اس لئے بھگوان نے اس تیرہویں باب میں جو خیال ہمیں دیا ہے، وہ بڑا قیمتی ہے۔ "تو جسم نہیں، آتما ہے"۔ "وہ آتما روپ تو ہی ہے"۔ یہ بڑا بلند اور پاکیزہ

خیال سب سے بڑا مقدس اور اونچا مقولہ ہے۔ سنسکرت ادب میں یہ خیال ایک اعلیٰ خیال مانا گیا ہے۔ "یہ اوپر کا ڈھکن، چھلکا، ڈھانچہ، تو نہیں ہے۔ وہ اصلی، لازوال ثمر تو ہے۔" جس لمحہ انسان کے دل میں یہ خیال دوڑے گا کہ "سو تو ہے" "یہ جسم میں نہیں، وہ پرماتما میں ہوں" جب یہ خیال من میں جم جائے گا، اسی وقت اس کے من میں ایک بے اندازہ لطف پیدا ہونے لگے گا۔ میرے اس روپ کو مٹانے اور برباد کر ڈالنے کی طاقت، دنیا کی کسی چیز میں نہیں ہے، کسی میں بھی ایسی قوت نہیں ہے۔ یہ لطیف خیال اس مقولہ میں سمایا ہوا ہے۔

اس جسم سے الگ غیر فانی و بے عیب پرماتما ہے، وہ میں ہوں۔ اسی پرماتما کے لئے مجھے یہ جسم ملا ہے۔ جب جب اس ایشوری حقیقت پر گندگی آجانے کا اندیشہ ہو گا، تب تب میں اسے بچانے کے لئے اس جسم کو پھینک دوں گا۔ اس ایشوری حقیقت کو صاف و روشن رکھنے کے لئے اس جسم کو [illegible] پر میں ہر وقت تیار رہوں گا۔ میں جو اس جسم پر سوار ہو کر آیا ہوں، تو کیا اس لئے کہ اپنی فضیحت کراؤں؟ جسم پر میرا حکم چلنا چاہیئے۔ میں اس جسم کا استعمال کروں گا اور اس کے ذریعہ بہبودی کو ترقی دوں گا۔ ہر سہ مکان میں آنند بھر دوں گا۔ اعلیٰ اصولوں کی خاطر میں اس جسم کو قربان کر دوں گا اور ایشور کی عظمت کے گن گاؤں گا۔ رئیس ایک کپڑے کو میلا ہوتے ہی اسے پھینک دیتا ہے اور دوسرا پہن لیتا ہے۔ ویسا ہی میں بھی کروں گا۔ کام کے لئے اس جسم کی ضرورت ہے۔ جب یہ جسم کام کے قابل نہ رہ جائے گا، اس وقت اسے پھینک دینے میں مجھے کیا پس و پیش ہو سکتا ہے۔

ستیاگرہ کے ذریعہ ہمیں یہی تعلیم ملی ہے۔ جسم اور روح الگ الگ چیزیں ہیں۔ جس دن آدمی اس راز کو سمجھ لے گا، اسی دن اس کی سچی تعلیم اور اصلی

ترقی کی ابتدا ہوگی۔ اسی وقت ہمیں ستیاگرہ راس آئے گی اس لئے ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اس خیال کو اپنے دل میں نقش کرے۔ جسم تو برائے نام ایک ذریعہ ہے، پرمیشور کا دیا ایک آلہ ہے۔ جس دن اس کی ضرورت نہ رہے گی، اسی دن اسے پھینک دینا پڑے گا۔ سردیوں کے گرم کپڑے ہم گرمیوں میں اتار دیتے ہیں۔ رات کو اوڑھا ہوا کمبل صبح ہٹا دیتے ہیں، صبح کے کپڑے دوپہر کو بدل دیتے ہیں، اسی طرح اس جسم کو سمجھو۔ جب تک جسم کارآمد ہے، تب تک اسے رکھیں گے۔ جب وہ بے کار ہو جائے گا، اسی دن یہ جسمانی لبادہ پھینک دیں گے۔ روحانی ترقی کے لئے بھگوان یہ ترکیب ہمیں بتا رہے ہیں۔

(۷۱) ظالموں کا اقتدار ختم

جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں گے کہ جسم سے میں علیحدہ ہوں، تب تک ظالم ہم پر ظلم ڈھاتے رہیں گے۔ ہمیں بندہ و غلام بناتے رہیں گے اور نہ جانے کیا کیا خوف دلاتے رہیں گے۔ خوف کے باعث ہی ظلم ممکن ہو سکتا ہے۔ ایک راکشش نے ایک آدمی کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اس سے برابر کام لیتا رہتا تھا اور جب کبھی وہ کام نہیں کرتا، تو راکشش کہتا "کھا جاؤں گا تجھے، ختم کر دوں گا۔" شروع میں وہ آدمی ڈرتا رہا۔ لیکن جب وہ دھمکی ناقابل برداشت ہو گئی، تو اس نے کہا۔ "لے کھا ڈال۔ کھانا ہو تو کھا جا۔" لیکن راکشش اسے کھا جانے والا تھوڑا ہی تھا؟ اسے تو ایک بندہ اور غلام چاہیئے تھا۔ کھا جانے پر اس کا کام کون کرتا؟ وہ تو صرف اسے کھا جانے کی دھمکی دیا کرتا تھا۔ لیکن جیوں ہی یہ جواب ملا کہ "لے کھا جا۔" تو اس کا ظلم بند ہو گیا۔ ظالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ لوگ جسم کے بندے اسی سے چپکے رہنے والے ہیں۔ ان کے جسم کو ذرا تکلیف پہنچی نہیں کہ یہ غلام ہو کر دبک کر بیٹھ جائیں گے۔ لیکن جہاں آپ نے جسم کی

الفت چھوڑ دی کہ فوراً شہنشاہ ہو جائیں گے۔ آزاد ہو جائیں گے اور ساری طاقت آپ کے ہاتھ میں آجائے گی۔ پھر کوئی آپ پر حکم نہیں چلا سکتا۔ ظلم کرنے کا سہارا ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ "جسم میں ہوں"۔ وے سمجھتے ہیں کہ ان کے جسم کو ستایا نہیں کہ یہ بس میں ہوئے نہیں۔ اسی لئے وہ دھمکی کی زبان بولتے ہیں۔

"میں جسم ہوں"۔ اس خیال کے باعث ہی دوسروں کو مجھ پر ظلم کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن انگلستان کے شہید کرنیمر نے کیا کہا تھا۔ مجھے جلاتے ہو، اچھا جلا ڈالو۔ لو یہ پہلے دایاں ہاتھ جلاؤ۔ اسی طرح روڈلے اور لیٹیمر نے کیا کہا تھا "ہمیں جلانا چاہتے ہو؟ ہمیں کون جلا سکتا ہے؟ ہم تو دھرم کی ایسی شمع روشن کر رہے ہیں کہ اسے کوئی بجھا نہیں سکتا۔ اس جسمانی موم بتی کو، اس چربی کو جلا کر حقائق کی شمع روشن کرنا، تو ہمارا فرض ہی ہے۔ جسم مٹ جائے گا، وہ تو مٹنے ہی والا ہے۔" سقراط کو زہر دے کر مارنے کی سزا دی گئی۔ تب اس نے کہا "میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ چار دن کے بعد جسم چھوٹنے ہی والا تھا۔ جو مرنے ہی والا تھا، اسے مار کر آپ لوگ کون سی بہادری کر رہے ہیں؟ ذرا سوچو تو، یہ جسم ایک دن ضرور مرنے والا ہے، جو فانی ہے، اسے مارنے میں کون سی تعریف ہے؟" جس دن سقراط کو زہر دیا جانے والا تھا، اس سے پہلی رات وہ اپنے شاگردوں کو روح کی لافانیت کی تلقین دے رہا تھا۔ جسم پر زہر داخل ہونے پر اسے کیا کیا تکلیفیں ہوں گی، اس کا ذکر وہ موج سے کر رہا تھا۔ اسے کوئی بھی فکر دامن گیر نہیں تھی۔ روح کی لافانیت کا ذکر ختم ہونے پر اس کے ایک شاگرد نے پوچھا۔ مرنے پر آپ کی تجہیز و تکفین کیسے کی جائے؟" اس نے جواب دیا۔ "خوب! ماریں گے وہ اور گاڑ دو گے تم! تو کیا وہ مارنے والے میرے دشمن ہیں اور تم گاڑنے والے مجھے

بہت چاہنے والے ہو؟ وہ عقلمندی سے مجھے ماریں گے اور تم سمجھداری سے مجھے گاڑو گے؟ تم کون ہو مجھے گاڑنے والے؟ میں تم سب کو پورا پڑنے والا ہوں! تم کس میں مجھے گاڑو گے، مٹی میں یا ناس میں؟ مجھے نہ کوئی مار سکتا ہے نہ گاڑ ہی سکتا ہے۔ اب تک میں نے کیا سمجھایا تم لوگوں کو؟ سدح لافانی ہے۔ اسے کون مار سکتا ہے اور کون گاڑ سکتا ہے؟" اور سچ مچ آج ۲½ ہزار برسوں سے وہ بزرگ سقراط سب کو گاڑ کر باقی ہے۔

(۷۲) پرماتما کی قوت پر یقین

خلاصہ یہ کہ جب تک جسم کا موہ ہے، ڈر ہے، تب تک صحیح تحفظ نہیں ہو سکتا۔ تب تک برابر ڈر لگتا رہے گا۔ ذرا آنکھ لگی نہیں کہ کھٹکا رہے گا کہ کہیں سانپ تو آکر نہ کاٹ کھائے، چور تو آکر وار نہ کر جائے۔ انسان سرہانے ڈنڈا رکھ کر سوتا ہے، آخر کیوں؟ کہتا ہے — "ساتھ رکھنا اچھا ہے، کہیں چور وور نہ آجائے۔" اے نیک بخت اگر وہی ڈنڈا چور تمہارے سر پر مار دے تب؟ چور اگر ڈنڈا لانا بھول گیا، تو تم پہلے سے ہی اس کے لئے تیاری کر رکھتے ہو۔ تم کس کے بھروسے پر سوتے ہو۔ اس وقت تم دنیا کے ہاتھ میں رہتے ہو۔ تم جاگ رہے ہو گے، تب ہی تو اپنی حفاظت کرو گے۔ نیند میں تمہاری حفاظت کون کرے گا؟

میں کسی نہ کسی قوت پر بھروسہ کرکے سوتا ہوں۔ جس قوت کے سہارے شیر، گائے وغیرہ سوتے ہیں، اسی کے بھروسہ میں بھی سوتا ہوں۔ شیر کو بھی نیند آتی ہے۔ شیر جو دنیا کی حصومت کے باعث لمحہ لمحہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہتا ہے، وہ بھی سوتا ہے۔ اس قوت پر اگر بھروسہ نہ ہو، تو کچھ شیر سوتے اور کچھ جاگ کر پہرہ دیتے۔ ایسا انتظام انھیں کرنا پڑتا۔ جس قوت پر بھروسہ کرکے شیر، بھیڑیا وغیرہ خوفناک درندے سوتے ہیں، اسی عالمگیر طاقت کی گود میں، میں بھی سو رہا ہوں۔ ماں کی گود میں بچہ بڑی بے فکری

سے سوتا ہے، گویا اس وقت وہ دنیا کا بادشاہ ہی ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم، آپ بھی اسی مادر عالم پرورد کی گود میں اسی طرح پریم، اعتقاد و ادراک کے ساتھ سونے کی عادت ڈالیں۔ جس قوت کے بل بوتے پر میرا یہ سارا جیون چل رہا ہے، اس سے زیادہ سے زیادہ تعارف حاصل کر لینا چاہیئے۔ اس قوت کا مجھے تدریج احساس ہوتا رہنا چاہیئے، اس قوت پر مجھے جتنا اعتقاد ہوتا جائے گا، اتنا ہی زیادہ میرا تحفظ ہو سکے گا۔ جوں جوں مجھے اس قوت کا تجربہ ہوتا جائے گا، تیوں تیوں میری ترقی ہوتی جائے گی۔ اس تیرہویں باب میں اس کا تھوڑا سا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

(۷۳) پرماتما کی طاقت کا تدریج احساس

جب تک جسم میں مقیم روح کا خیال من میں نہیں آتا ہے، تب تک انسان معمولی کاموں میں پھنسا رہتا ہے۔ بھوک لگی، تو کھا لیا۔ پیاس معلوم ہوئی، تو پانی پی لیا۔ نیند آگئی تو سو گئے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ ان ہی باتوں کے لئے وہ لڑے گا۔ انھیں کے پانے کا لالچ وہ من میں رکھے گا۔ اس طرح ان جسمانی کاموں میں ہی وہ محو رہتا ہے۔ ترقی کی ابتدا تو اس کے بعد سے ہی ہوتی ہے۔ اس وقت تک آتما صرف دیکھتی رہتی ہے۔ ماں جس طرح کنوئیں کی طرف رینگتے جانے والے بچے کے پیچھے ہمیشہ چوکنی کھڑی رہتی ہے اسی طرح آتما، روح ہم پر نگاہ جمائے کھڑی رہتی ہے۔ اطمینان کے ساتھ وہ سب حرکتوں کو دیکھتی رہتی ہے۔ ایسی حالت میں آتما شاہد حال کہلاتی ہے۔

اس حالت میں آتما دیکھتی ہے۔ مگر ابھی وہ رائے یا منظوری نہیں دیتی ہے۔ لیکن یہ جاندار، جو اپنے کو محض جسم سمجھ کر اب تک ہر قسم کی حرکتوں میں مبتلا رہتا ہے، آگے چل کر جاگتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ ہائے میں حیوان کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ذی روح جب اس طرح غور کرنے لگتا ہے، تو اخلاقی منزل کا آغاز ہوتا ہے۔

تب قدم قدم پر وہ مناسب اور غیر مناسب کا خیال کرتا ہے۔ قوت ممیزہ سے کام لینے لگتا ہے۔ اس کی تنقیدی عقل بیدار ہوتی ہے۔ من مانے اعمال رک جاتے ہیں۔ بے ضابطگی کی جگہ ضبط و تابو آجاتا ہے۔ جب ذی روح اس اخلاقی منزل میں قدم رکھتا ہے، تو آتما محض شاہد بے غرض رہ کر نہیں دیکھتی، وہ اندر سے تائید کرتی ہے "شاباش" "خوب" ایسی آواز اندر سے آتی ہے۔ روح صرف شاہد نہ رہ کر مشیر کار بن جاتی ہے۔

کوئی بھوکا مہمان دروازہ پر آجائے اور آپ اپنے دستر خوان کا کھانا اُسے دے دیں اور پھر رات کو اپنے اس نیک کام کی یاد آئے، تو دیکھئے کتنا آنند آتا ہے۔ اندر سے آتما کی ہلکی آواز کانوں میں گونجتی ہے "اچھا کام کیا"۔ ماں جب بچہ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہے " اچھا کیا بیٹا" تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ گویا سارے عالم کی بخشش اسے مل گئی۔ اسی طرح ہمارے قلب نشین بھگوان کے الفاظ "شاباش بیٹا" ہماری ہمت افزائی کرتے ہیں۔ اس وقت عیش و عشرت کی زندگی ترک کر کے انسان اخلاقی زندگی کی منزل میں قدم رکھتا ہے۔

اس کے بعد کی منزل یہ ہے کہ اخلاقی زندگی میں جب انسان فرائض منصبی کو انجام دے کر اپنے سارے اندرونی عیوب کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ کام کرتے کرتے تکان محسوس کرنے لگتا ہے۔ تب وہ اندر سے دعا کرتا ہے کہ "اے خدا میری سعی و طاقت کی اب حد ہو گئی ہے، مجھے مزید قوت دے"۔ جب تک انسان کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ بلا مدد اکیلا کامیاب نہیں ہو سکتا، تب تک عبادت کا راز اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اپنی پوری آزمودہ طاقت جب اسے ناکافی ثابت ہوتی ہے، تب وہ بےکسی میں دردمند کی طرح پرماتما کو پکارتا ہے۔ خدا کی مہر و امداد کا سرچشمہ ہمیشہ رواں رہتا ہے جس کسی کو پیاس لگ رہی ہو، وہ اپنا حق سمجھ کر اس میں سے شیر مادر سمجھ کر

پی سکتا ہے جب کمی محسوس ہوتی ہو، وہ مانگ لے، اس طرح کا رشتہ تیسری منزل میں پیدا ہوتا ہے۔ پرماتما زیادہ نزدیک آجاتا ہے۔ اور محض زبانی شاباشی نہ دیتے ہوئے مدد کرنے کے لئے آتا ہے۔

پہلے پرمیشور دور کھڑا تھا اور جس طرح استاد شاگرد سے دور کھڑا ہو کر کہتا ہے "سوال حل کرو" اسی طرح جب تک انسان عیش و عشرت میں پھنسا رہتا ہے تب تک، پرماتما دور کھڑا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ٹھیک ہے، چلنے دو اپنے تجربہ پر" پھر ذی روح اخلاقی منزل میں قدم رکھتا ہے، تب پرماتما محض شاہد بے غرض نہیں رہ سکتا۔ انسان کی نیک کرداری کو دیکھ کر ایشور دھیرے سے جھانکتا ہے اور کہتا ہے "شاباش" اس طرح نیک کام کرتے ہوئے جب من کے کثیف اور موٹے میل دُھل جاتے ہیں اور لطیف میل دُھلنے کا وقت آتا ہے اور اس کی تمام کوششیں ناکام ہونے لگتی ہیں، تب وہ پرماتما کو پکارتا ہے اور وہ "آیا" کہہ کر دوڑتا ہے۔ بھگت کا جوش کم پڑتے ہی وہ وہاں آموجود ہوتا ہے۔ سارے جگت کی خدمت کرنے والا آفتاب ہمیشہ آپ کے دروازے پر کھڑا رہتا ہے اور وہ بند دروازہ کو توڑ کر اندر داخل نہیں ہوگا، کیونکہ وہ خادم ہے۔ وہ خادم اور مالک کے رشتے کو نبھاتا ہے، دروازے کو نہیں کھٹکھٹاتا۔ اندر مالک سویا ہو، تو بھی خادم، آفتاب دروازہ کے باہر رہتا ہے۔ دروازہ کھولتے ہی وہ ساری روشنی لے کر اندر گھس آتا ہے اور اندھیرا دور کر دیتا ہے۔ بھگوان کی بھی یہی مثال سمجھو۔ بھیما کے کنارے (پنڈھر پور) میں کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ تیار ہی کھڑا ہے۔ "اُٹھا کے تو مجھ کو کہے، پربھو آجا۔" ایسا ذکر تُکارام وغیرہ نے کیا ہے۔ ناک کھولئے کہ ہوا اندر آہی جاتی ہے۔ دروازہ کھولئے کہ روشنی اندر گھس ہی پڑتی ہے۔ ہوا اور روشنی کی مثالیں بھی مجھے ناکافی معلوم ہوتی ہیں ان کی بہ نسبت

پرماتما زیادہ نزدیک اور زیادہ مستعد ہے۔ شاہد محض و مشیر کار نہ رہ کر اب وہ پھر (مددگار) بن جاتا ہے۔ قلبی گندگی مٹانے کے لئے لاچار ہو کر جب ہم اسے پکارتے ہیں "ماری ناؤ تمارے ہاتھے پربھو سنبھال جو رے"۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ " تو ہی میرا مددگار ہے، تیرا ہی آسرا مجھے درکار ہے"۔ تب پھر وہ منبع رحم و کرم کیسے دور رہے گا۔ بھگت کی مدد کرنے والا، وہ بھگوان، ادھورے کو پورا کرنے والا وہ بھگوان دوڑ آتا ہے۔ تب ریداس بھگت کے چمڑے کو دھوتا ہے، سجن قصائی کا گوشت بیچتا ہے، کبیر کی چادر بنتا ہے اور جنا بائی کے ساتھ چکی پیستا ہے۔

اس کے بعد کی سیڑھی ہے یہ تفضلِ خدا افعال کا جو ثمرہ ملا اسے خود نہ لے کر اسی کی نذر کر دینا۔ اس منزل میں انسان خدا سے کہتا ہے " اپنے پھل کی لذت آپ ہی لیجئے۔" نام دیو دھرنا دیکر بیٹھ گئے کہ " پربھو دودھ پینا ہی پڑے گا۔" کیسا شیریں یہ ذکر ہے۔ سارا دودھ بہ شکلِ ثمرۂ اعمال نام دیو بھگوان کی نذر کر رہا ہے۔ اس طرح زندگی کی ساری پونجی، ساری کمائی، جو خدا کی مہربانی سے حاصل ہوئی، اسی کو وہ نذر کر دیتا ہے۔ دھرم راج بہشت میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ کے کتے کو اندر جانے کی اجازت نہ ملی، تو انھوں نے اپنی ساری زندگی کی نیکیوں کا ثمرہ بہشت ایک لمحہ میں چھوڑ دیا۔ اسی طرح بھگت بھی سارا ثمرۂ عمل خدا کی نذر کر دیتا ہے۔ "شاہد" "مشیر کار" "مددگار" ان شکلوں میں ظاہر ہونے والا بھگوان آپ بھوگتا، بھوگنے والا ہو جاتا ہے۔ اب انسان اس منزل پر آتا ہے، جہاں بھگوان ہی اس جسم میں لذت کو چکھتا ہے۔

اس کے بعد اب اپنے عزم ہی کو ترک کر دینا ہے۔ افعال کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ پہلے ہم عزم کرتے ہیں، پھر فعل انجام دیتے ہیں اور بعد میں پھل ملتا ہے۔ فعل کے لئے بھگوان مدد دے کر جو پھل ملا، وہ بھی اسی کو نذر کر دیا۔ فعل

انجام دینے والا، پرمیشور پھل دالا بھی پرمیشور، اب اس فعل کا عزم کرنے والا بھی پرمیشور ہی کو ہو جانے دو۔ اس طرح فعل کے شروع، بیچ و آخر میں سب جگہ ایشور ہی ہو جانے دو۔ گیان دیو نے کہا ہے ــــ "مالی جدھر لے جائے، ادھر ہی چپ چاپ چلے جانے والے پانی کی طرح بنو۔" مالی پانی کو جدھر لیجانا چاہتا ہے ادھر وہ بلا عذر چلا جاتا ہے۔ مالی جس پھول اور پھل کے پودوں کو چاہتا ہے، انھیں وہ پانی نشو و نما اور ترقی دیتا ہے۔ اسی طرح میرے ہاتھوں جو کچھ ہوتا ہے' وہ اُسی کو طے کرنے دو۔ اپنے من کے جملہ ارادوں کی ذمہ داری اسی پر جانے دو۔ اگر میں نے اپنا سارا بوجھ گھوڑے پر ڈال ہی دیا ہے، تو باقی بوجھ میں اپنے سر پر کیوں لادوں؟ وہ بھی گھوڑے کی پیٹھ پر ہی کیوں نہ لادوں؟ اپنے سر پر بوجھ رکھ کر اگر میں گھوڑے پر بیٹھا، تو بھی بوجھ گھوڑے پر ہی پڑے گا۔ تو سارا بوجھ اسی کی پیٹھ پر کیوں نہ لادوں؟ اس طرح زندگی کی تمام شورش اُٹھک پٹک، ثمر آوری بالآخر پرماتما ہی ہو جاتا ہے۔ میری زیست کا وہ ہیشور مالک عظیم ہی ہو جاتا ہے۔ اس طرح ترقی کرتے کرتے ساری زندگی ہی ایشور روپ ہو جاتی ہے۔ صرف جسم کا پردہ ہی باقی بچ رہتا ہے۔ وہ جب مٹ جاتا ہے، تب جیواد شیو آتما اور پرماتما ایک ہی ہو جاتا ہے۔

اس طرح اس شکل میں ہمیں بھگوان کا تدریج احساس کرنا ہے۔ وہ پہلے غیر جانبدار رہ کر دیکھتا ہے۔ پھر جب اخلاقی زندگی کی ابتدا ہونے پر ہم سے نیک اعمال ہونے لگتے ہیں، تو ہمیں شاباشی دیتا ہے۔ پھر من کی لطیف گندگی دور کرنے کے لئے اپنی کوششوں کو ناکافی سمجھ کر بھگت جب پکارتا ہے، تب وہ بیکسوں کا چارہ گر مدد کے لئے دوڑ پڑتا ہے۔ اس کے بعد پھل کو بھی اس کی نذر کرکے اسے ہی "بھوگنے والا" بنا دینا اور بالآخر سارے عزم اسی کے نذر کرکے

ساری زندگی محو خدا کر دینا ہے۔ یہی اِنسان کی آخری منزل ہے۔ کرم یوگ اور بھگت یوگ کے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہوئے عامل کو آخری منزل تک پہنچنا ہے۔

(۴۷) بنیادی طریقۂ عبادت

ان سب کو حاصل کرنے کے لئے اخلاقی وسیلہ کے مضبوط بنیاد کی ضرورت ہے۔ ستیہ (حق) استیہ (ناحق) کا امتیاز کر کے ستیہ ہی اختیار کرنا چاہیئے۔ اصل اور غیر اصل کا امتیاز کر کے اصل کو لے لینا چاہیئے۔ سیپ کو چھوڑ کر موتی کو لینا چاہیئے۔ اس طرح زندگی کی شروعات ہونی چاہیئے۔ پھر اپنی کوشش اور پرماتما کی عنایت کے سہارے اوپر چڑھتے جانا ہے۔ اس ساری کوشش میں اگر ہم نے جسم سے آتما کو الگ کرنے کی مشق کر لی ہوگی، تو ہمیں بڑی مدد ملے گی۔ ایسے موقع پر مجھے حضرت عیسیٰؑ کی قربانی یاد آجاتی ہے۔ انھیں کیلیں ٹھوک ٹھوک کر مار رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت ان کے منھ سے یہ الفاظ نکلے:۔۔۔ "بھگوان! اتنی تکلیف کیوں دیتے ہیں؟" لیکن فوراً ہی حضرت عیسیٰؑ نے اپنا قلبی توازن قائم کر کے کہا۔۔۔" اچھا، جو تیری مرضی۔ اپنی ہی مرضی پوری ہونے دے۔ ان لوگوں کو معاف کر۔ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔" حضرت عیسیٰؑ کی اس مثال میں بڑا راز ہے۔ جسم سے روح کو کتنا الگ کرنا چاہیئے، اس کی یہ علامت ہے۔ کہاں تک منزل طے کرنی چاہیئے اور کہاں تک وہ طے کی جاسکتی ہے، یہ حضرت عیسیٰ مسیح کی زندگی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ جسم ایک اوپری ڈھانچہ، ایک چھلکے کی طرح الگ ہو رہا ہے، یہاں تک منزل آپہنچی ہے۔ جب جب آتما کو جسم سے الگ کرنے کا خیال میرے من میں آتا ہے، تب تب حضرت عیسیٰؑ کا یہ جیون، یہ نظارہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جسم سے پورے طور پر علیحدگی، گویا اس کے قطع تعلق ہو جانے کا نمونہ حضرت

عیسیٰ مسیح کی زندگی ہے۔

جسم اور آتما کی علیحدگی اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک ستیہ (حق) اور استیہ (ناحق) کا امتیاز نہ کیا جائے یہ امتیاز، یہ گیان، ہماری رگ رگ میں پھیل جانا چاہیئے۔ گیان کے معنی ہم لیتے ہیں "جاننا" لیکن بُدھی سے جاننا گیان نہیں ہے۔ منھ میں نوالہ رکھ لینا، کھانا کھا لینا نہیں ہے۔ لقمہ چَب کر حلق کے نیچے جانا چاہیئے۔ اور وہاں سے پیٹ میں جا کر ہضم ہو کر اس کا رقیق خون سارے جسم میں پہنچ کر غذائیت ملنی چاہیئے۔ تب ہی وہ ٹھیک ٹھیک کھانا ہوگا۔ اسی طرح محض علم ادراک سے کام نہیں چل سکتا۔ وہ علم، وہ گیان ساری زندگی میں پیوست ہو جانا چاہیئے، دِل میں جذب ہو جانا چاہیئے۔ ہمارے حواس ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ کے ذریعہ وہ گیان ظاہر ہونا چاہیئے اور ایسی حالت ہو جانی چاہیئے، گویا ساری گیان اندریاں (حواسِ ادراک) اور کرم اندریاں (حواس اعمال) یہ ہمہ تصور ہی سارے کام میں مشغول ہیں۔ اس لئے اس تیرہویں باب میں بھگوان نے گیان کی بہت اچھی تشریح کی ہے۔ اِستھت پرگیہ (قائم العقل) انسان کی علامت کی طرح ہی گیان کی یہ علامات ہیں۔ یعنی انکساری، عدم تکبر، عدم تشدد، سادہ لوحی، عفو وغیرہ بیس اوصاف بھگوان نے بتلائے ہیں۔ انھوں نے صرف یہ کہہ کر اکتفا نہیں کی کہ اِن صفات کو گیان کہتے ہیں، بلکہ یہ بھی صاف طور سے بتلایا گیا ہے کہ اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ اگیان (جہل) ہے۔ گیان حاصل کرنے کا جو طریقہ بتایا، اسی کا مطلب ہے گیان، عرفان۔ سقراط کہتا ہے کہ سدگن نکوئی کو ہی میں گیان، عرفان مانتا ہوں۔ وسیلہ اور مدعا دونوں ایک روپ ہی ہیں۔

گیتا کے ان بیس طریقوں کو گیان دیو نے ۱۸ ہی کر دیا ہے۔ انھوں نے اس کی تشریح بڑی امنگ سے کی ہے۔ ان صفات سے تعلق رکھنے والے صرف

پانچ ہی اشلوک بھگوت گیتا میں ہیں۔ لیکن گیان دیو نے اپنی تصنیف گیانیشوری میں ان پر سات سو اوویاں لکھی ہیں۔ وہ اس بات کے بہت خواہش مند تھے کہ سماج میں نیک کرداری کی ترقی ہو۔ حقیقت رو پرمیشور کی عظمت پھیلے۔ ان صفات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اپنا سارا تجربہ ان اوویوں میں انڈیل دیا ہے۔ مرہٹی پڑھنے والوں پر ان کا یہ بڑا بھاری احسان ہے۔ گیان دیو کے روئیں روئیں میں یہ گُن (اوصاف سمائے ہوئے تھے۔ بھینسے کو جو چابک لگائی گئی، تو اس کا نشان گیان دیو کی پیٹھ پر اُٹھ آیا۔ ذی روح کے لئے اتنی ہمدردی ان میں تھی۔ گیان دیو کے ایسے مہر آمیز قلب سے گیانیشوری ظہور پذیر ہوئی۔ ان صفات کی انھوں نے تشریح کی جو گُن (اوصاف) ان میں بیان کئے، وہ پڑھنے، غور کرنے اور دل میں جاگزیں کرنے لائق ہیں۔ گیان دیو کی اس شیریں کلامی سے میں نے لُطف اٹھایا اور اپنے کو خوش قسمت سمجھا۔ کاش کہ ان کی شیریں زبان میرے منھ میں آکر بیٹھ جائے۔ اس کے لئے اگر مجھے دوبارہ جنم لینا پڑے، تو اسے مبارک سمجھوں گا۔ خلاصہ یہ کہ درجہ بدرجہ اپنی ترقی کرتے ہوئے آتما (روح) کو جسم سے علیحدہ سمجھتے ہوئے، سب لوگ اپنی زندگی کو محو خدا کر دینے کی کوشش کریں۔

اتوار ۱۵-۵-۳۲

چودھواں باب

گنوں کا عروج اور اُن سے نجات

(۷۵) فطرت کا تجزیہ

بھائیو! آج کا چودھواں باب ایک لحاظ سے پچھلے باب کا تتمہ ہے۔ دراصل آتما کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بذاتِ خود مکمل ہے۔ آتما کی رفتار قدرتاً بلندی کی طرف ہے۔ جس طرح کسی چیز کے ساتھ کوئی بھاری وزن باندھ دیا جاتا ہے، تو وہ نیچے کھنچتی چلی جاتی ہے، اسی طرح جسم کا یہ بوجھ آتما کو نیچے کھینچ لے جاتا ہے۔ پچھلے باب میں ہم نے یہ دیکھا کہ اگر کسی ترکیب سے جسم اور روح علیحدہ کر سکیں، تو ہماری ترقی ہو سکتی ہے۔ یہ بات چاہے کٹھن ہی ہو، لیکن اس کا انجام بھی عظیم الشان ہوگا۔ آتما کے پاؤں کی یہ جسمانی بیڑی اگر ہم کاٹ سکیں تو بڑا لطف آئے گا۔ تب انسان جسم کے دکھ سے دکھی نہ ہوگا۔ وہ آزاد ہو جائے گا۔ اگر انسان اس جسم پر قابو پا جائے تو پھر اس دنیا میں اس پر کون حکمرانی کر سکتا ہے؟ وہ شہنشاہ عالم ہو جاتا ہے۔ اس لئے جسم کا جو اقتدار روح پر غالب ہو گیا ہے، اسے ہٹا دو۔ جسم کے یہ جو دکھ سکھ ہیں، سب بدیسی اور خارجی ہیں۔ روح سے ان کا ذرا بھی تعلق نہیں ہے۔

ان سب دکھوں کو کس حد تک جسم سے الگ کیا جائے اس کا تصور میں لانے

حضرت عیسیٰ کی مثال سے بتایا ہے۔ انھوں نے دکھا دیا ہے کہ جسم کے زوال کے باوجود کس طرح خوش نودی مزاج وسکونِ قلب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس طرح جسم کو روح سے الگ رکھنا اگر ایک طرف علم ادراک کا کام ہے، تو دوسری طرف ضبطِ نفس اور تعوذ ہی کا کام بھی ہے۔

تکارام نے کہا ہے ——— قوتِ ادراک اور بے لوثی دونوں کی ضرورت ہے۔ ویراگ (بے لوثی) ایک طرح کا ضبط اور تیاگ ہے۔ اس چودھویں باب میں ضبط کا رخ ظاہر کیا گیا ہے۔ ناؤ کے کھیلنے کا کام تو بلیاں کرتی ہیں، مگر رخ دکھانے کا کام تپوار کرتی ہے بلیاں اور تپوار دونوں چاہیئے۔ اسی طرح جسم کے ... سے روح کو الگ رکھنے کے لئے قوتِ امتیاز وضبط دونوں کی ضرورت ہے۔

جس طرح ڈاکٹر مریض کا مزاج دیکھ کر دوا بتاتا ہے، اسی طرح بھگوان نے چودھویں باب میں ہمیں مزاجوں کی جانچ کر کے ہمیں علیحدہ علیحدہ بتایا ہے کہ کون کون سی بیماریاں ہیں۔ اس میں مزاجوں کی ٹھیک ٹھیک تقسیم کی گئی ہے۔ علمِ سیاست میں تفریق کا ایک بڑا اصول ہے۔ جو دشمن سامنے ہے اس کی فوج میں اگر تفرقہ ڈالا جا سکے، تو اس کو جلد شکست دی جا سکتی ہے۔ بھگوان نے یہاں ایسا ہی کیا ہے۔

میری، آپ کی اور سارے جانداروں کی جو فطرت ہے، اس میں تین گن ہیں۔ جس طرح آیوروید میں بات، پت، کف، ہے، اسی طرح یہاں ستو، رج، تم، یہ تین صفاتِ فطرت میں موجود ہیں۔ سب جگہ ان ہی تین گنوں کا مسالہ بھرا ہوا ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ، اتنا ہی فرق ہے۔ جب ان تینوں سے آتما کو الگ کرلیں گے، تب ہی آتما کو جسم سے الگ کیا جا سکے گا۔ جسم سے روح کو علیحدہ کرنے کا طریقہ یہی ان تینوں صفات کا تجزیہ کر کے ان پر

قابو پالینا ہے۔ ضبط کے ذریعہ ایک ایک کو جیت کر آخر میں حقیقت تک جا پہنچتا ہے۔

۷۶) تموگن اور اس کا علاج: جسم کی مشقت

پہلے ہم تموگن کو لیں۔ سماج کی موجودہ حالت میں ہمیں تموگن کا انجام بڑا خوفناک دکھائی دیتا ہے۔ اس کا خاص نتیجہ ہے کاہلی۔ اسی سے نیند اور غفلت کا جنم ہوتا ہے۔ ان تینوں باتوں کو جیت لیا، تو پھر تموگن کو جیت لیا ہی سمجھو۔ ان میں کاہلی تو بڑی ہی خوفناک ہے۔ اچھے سے اچھا آدمی بھی کاہلی کے باعث بے کار ہو جاتا ہے۔ سماج کے سارے سکھ اور شانتی کو مٹا دینے والا یہ دشمن ہے۔ یہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب کو بگاڑ دیتا ہے۔ اس دشمن نے سب کو پکڑ رکھا ہے۔ وہ ہم پر حاوی ہونے کے لئے گھات لگا کر بیٹھا ہی رہتا ہے۔ ذرا سا موقع ملا کہ اندر گھس بیٹھا۔ ذرا کھانا زیادہ کھایا کہ اس نے لیٹنے پر مجبور کیا۔ جہاں ذرا زیادہ لیٹے گویا آنکھوں سے کاہلی ٹپکتی ہے جب تک اسے مغلوب نہ کریں گے تب تک ساری کوشش بیکار ہے۔ مگر ہم تو کاہلی کے لئے بے قرار رہتے ہیں۔ ہر وقت یہی خواہش رہتی ہے کہ ایک بار دن رات محنت کر کے روپیہ اکٹھا کر لیں، تو پھر زندگی چین سے کٹے گی۔ بہت روپیہ کمانے کا مطلب ہے آئندہ کے لئے کاہلی کی تیاری کر رکھنا۔ ہم لوگ عام طور پر مانتے ہیں کہ بڑھاپے میں آرام کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اگر ہم زندگی میں ٹھیک طرح سے رہیں، تو بڑھاپے میں بھی کام کرتے رہیں گے، بلکہ زیادہ تجربہ کاری کے باعث بڑھاپے میں زیادہ کار آمد ثابت ہوں گے اور اسی وقت ہم کہتے ہیں گے آرام کریں گے۔ اسی قدر چوکنّا رہنا چاہیے کہ کاہلی کو بالکل ہی موقع نہ ملے۔ راجہ نل نفاست پسند تھا، پھر بھی پاؤں دھوتے وقت ذرا سا حصہ بے دھلا رہ گیا تو کہتے ہیں کہ اسی میں سے

کلجگ اندر گھس گیا۔ راجہ نل تو تھا ہر طرح پاک و صاف، لیکن ذرا سا جسم سوکھا رہ گیا کہ آلس کو موقع ملا اور فوراً کلجگ اندر گھس گیا۔ ہمارا تو سارے کا سارا جسم کھلا پڑا ہے۔ کہیں سے بھی آلس ہمارے اندر گھس سکتا ہے۔ بدن میں آلس آیا کہ دل و دماغ میں بھی وہ آبیٹھا۔ موجودہ سماج کی زیبت آلس پر ہی قائم ہے اس سے بیشمار مصائب پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر ہم اس آلس کو نکال سکیں تو سب نہیں تو بہت سے دکھوں کو دور کر سکیں گے۔

فی زمانہ سماج سدھار کے تذکرے ہوتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ معمولی آدمی کو بھی کم سے کم اتنا آرام ملنا چاہیئے اور اس کے لیے فلاں طرح کی سماج کی تنظیم ہونی چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ ایک طرف کمال درجہ کا سکھ تو دوسری طرف انتہائی درجہ کا دکھ۔ ایک طرف سرمایہ کا ڈھیر تو دوسری طرف مفلسی کی گہری خندق۔ یہ سماجی تفریق کیسے دور ہو؟ تمام ضرور آرام بآسانی حاصل کرنے کی ایک ہی تدبیر ہے اور وہ ہے آلس چھوڑ کر محنت و مشقت کرنے کو تیار رہوں۔ ہماری پریشانی خاص موجب آلس ہی ہے۔ اگر سب لوگ جسمانی محنت کرنے کا تہیہ کر لیں تو یہ دکھ دور ہو جائے۔

لیکن آج سماج میں ہمیں کیا دکھائی دیتا ہے؟ ایک طرف زنگ خوردہ بیکار لوگ دکھائی پڑتے ہیں۔ ریشوں کی اندریاں زنگ کھا رہی ہیں ان کے جسم کا استعمال ہی نہیں ہو رہا ہے، دوسری طرف اتنا زیادہ کام پڑ رہا ہے کہ سارا جسم گھس گھس کر گل گیا ہے۔ سارے سماج میں جسمانی محنت سے بچنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ جو جانفشانی سے جسمانی محنت کرتے ہیں وہ بھی خوشی خوشی ایسا نہیں کرتے ہیں بلکہ بوجہ مجبوری کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے سمجھدار انسان محنت سے بچنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے بناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے "فضول جسمانی محنت میں کیوں وقت گنوائیں۔" لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ "یہ نیند کیوں فضول نہیں؟ کھانے میں وقت کیوں برباد کریں!

"بھوک لگتی ہے تو کھا لیتے ہیں۔ نیند آتی ہے تو سو جاتے ہیں لیکن جب جسمانی محنت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو البتہ ہم کہتے ہیں " فضول اس میں کیوں وقت ضائع کریں؟ کیوں اپنے جسم کو تکلیف دیں؟ ہم تو دماغی محنت کر ہی لیتے ہیں تو جناب! اگر دماغی کام کرتے ہیں تو دماغی کھانا بھی کھائیے اور نیند بھی دماغی سو لیجئے۔ دماغی نیند اور دماغی کھانے کا بھی انتظام کیوں نہ کر لیجئے؟

اس طرح سماج میں دو طرح کے لوگ ہو گئے ہیں ایک تو وہ جو دن رات پسینے مرتے ہیں، دوسرے وہ جن کو ہاتھ بھی ہلانا نہیں پڑتا۔ میرے ایک دوست نے ایک روز کہا "کچھ رُنڈ اور کچھ مُنڈ" ایک طرف دھڑ ہے تو دوسری طرف سر۔ دھڑ صرف مرتا کھپتا ہے اور سر صرف سوچتا رہے۔ اس طرح ملک میں راہو، کیتو، رُنڈ اور مُنڈ دو اقسام ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر واقعی یہ رُنڈ اور مُنڈ ہوتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ تب اندھے اور لنگڑے کی مثال سے ہی کوئی نظام قائم ہو سکتا تھا۔ لنگڑا اندھے کو راستہ دکھائے اور اندھا لنگڑے کو کندھے پر بٹھائے۔ لیکن اُن رُنڈ مُنڈوں کی طرح کے الگ ٹکڑے یا جماعتیں نہیں ہیں۔ ہر کسی میں یہ رُنڈ مُنڈ دونوں ہیں۔ یہ جڑے رُنڈ مُنڈ سب جگہ ہیں اس سے اور مجبوری ہے اس لئے ہر شخص کو چاہیئے کہ کاہلی سے باز آئے۔

کاہلی سے نجات پانے کے لئے جسمانی محنت کرنی چاہیئے۔ کاہلی کو جیتنے کا بھی ایک طریقہ ہے۔ اگر جسم سے کام نہیں لیا گیا تو اس کو سزا بھی قدرت کی طرف سے ضرور ملے گی۔ بیماریوں یا سستی اور تکلیف کی شکل میں وہ سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔ جب ہمیں جسم ملا ہے تو محنت بھی ہمیں کرنی ہی پڑے گی۔ جسمانی محنت میں جو وقت لگتا ہے وہ بیکار نہیں جاتا۔ اس کا بدلہ ضرور ملتا ہے۔ اچھی صحت ملتی ہے۔ فہم تیز، پاکیزہ اور عمدہ ہو جاتی ہے۔ مفکرین میں سے بہتوں

کے تصور میں اللہ کے درد شکم وہ درد سر کا عکس نمایاں ہو جاتا ہے۔ اہل خیال اگر دھوپ میں کھلی ہوا میں، قدرت کی گود میں بیٹھ کر محنت کریں گے تو ان کے خیالات بھی روشن ہو جائیں گے۔ جسمانی بیماریوں کا جیسے مزاج پر اثر پڑتا ہے اسی طرح جسمانی صحت کا بھی۔ یہ تجربہ سے ثابت ہے۔ بعد میں تپ دق ہو جانے پر بھوالی یا کسی اور پہاڑ پر صاف ہوا میں جا کر رہنے یا سورج کی شعاعوں کا استعمال کرنے کے پہلے ہی اگر باہر کدال لے کر کھودنے یا باغ میں پیڑوں کو پانی پلانے اور لکڑی کاٹنے کا کام کریں تو کیا برا ہے؟

(۷۷) تموگن کا ایک اور علاج

کاہلی پر فتح حاصل کرنا یہ ایک بات ہوئی دوسری بات ہے نیند کو جیتنا۔ نیند در اصل ایک پاک شے ہے۔ خدمت کرتے کرتے تھکے ہوئے سادھو، سنتوں کی نیند بھی عبادت ہی ہے۔ اس طرح کی گہری اور اطمینان بخش نیند بڑے خوش نصیب لوگوں کو ملتی ہے۔ نیند گہری اور گاڑھی ہونی چاہیے۔ نیند کی خوبی لمبائی اور چوڑائی پر موقوف نہیں ہے۔ یہ پوچھنا کتنا لمبا تھا؟ اس پر انسان کتنی دیر پڑا رہا۔ اس بات پر نیند کا دارومدار نہیں ہے۔ کنواں جتنا گہرا ہوگا اسی قدر اس کا پانی زیادہ صاف اور شیریں ہوگا۔ اسی طرح نیند چاہے تھوڑی ہو، اگر گہری ہے تو اس کا اچھا اثر ہوتا ہے۔ دل لگا کر آدھے گھنٹے کی پڑھائی پریشان خیالی کی تین گھنٹے کی پڑھائی سے زیادہ مفید ہوتی ہے۔ یہی حالت نیند کی ہے۔ ایسا نہیں کہہ سکتے کہ لمبی نیند بالآخر مفید ہوتی ہے۔ بیمار چوبیس گھنٹے بستر پر پڑا رہتا ہے۔ ہر وقت بستر سے ملاقات رہتی ہے لیکن نیند سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ سچی نیند وہی ہے جو گہری اور سپنوں سے مبرا ہو۔ مرنے کے بعد جو تکالیف درپیش آتی ہوں، سوتے ہوں لیکن جیسے اچھی نیند نہ آتی ہو اور جیسے بڑے سپنے نظر آتے ہوں اس کی

پریشانیوں کا عالم نہ پوچھیے۔ وید میں رشی پریشان ہو کر کہتے ہیں "بُرے خواب مجھے نہیں آنے چاہئیں" ایسی خراب نیند مجھے نہیں چاہیے۔ نیند آرام کے لئے ہوتی ہے لیکن اگر اس میں بھی طرح طرح کے سپنے اور خیال پیچھا نہ چھوڑتے ہوں تو پھر وہاں آرام کہاں؟

تو پھر گہری اور گاڑھی نیند آئے کیسے؟ جو ترکیب کاہلی کے بارے میں بتائی ہے وہی نیند کے لئے بھی ہے۔ جسم سے برابر کام لیتے رہنا چاہیے پھر بچھونے پر جاتے ہی انسان مُردے کی طرح سو جائے گا۔ نیند ایک مختصر سی موت ہی تو ہے۔ ایسی عمدہ موت آنے کے لئے دن میں پہلے ہی سے تیاری اچھی ہونی چاہیے۔ جسم تھک کر چور ہو جانا چاہیے۔ انگریز شاعر شکسپیئر نے کہا ہے "راجہ کے سر پر تو تاج ہے مگر سر میں فکر گھسی ہے"۔ اس راجہ کو نیند نہیں آتی۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ جسمانی محنت نہیں کرتا۔ جو جاگنے کے وقت سوتا ہے وہ سونے کے وقت جاگتا رہے گا۔ دن میں جسم دماغ کا صحیح استعمال نہ کرنا نیند نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر نیند کے وقت دماغ سوچتا پھرتا ہے اور جسم بھی اصلی نیند کے لطف سے محروم رہتا ہے۔ پھر دیر تک سوتے پڑے رہتے ہیں۔ جس زندگی میں کوشش بلیغ کرنی ہے اسے نیند نے کھا ڈالا تو محنت کی نوبت آئے گی کب؟ آدمی زندگی اگر نیند ہی میں ختم ہو گئی تو پھر ہم کیا حاصل کر سکیں گے؟

جب بہت سا وقت نیند ہی میں چلا جاتا ہے، تو پھر تموگن کے تیسرے عیب یعنی بادہ غفلت کی شروعات خود بخود ہونے لگتی ہے۔ خواب آلود انسان کا دماغ مطمئن و حاضر نہیں رہ سکتا۔ اس سے غفلت پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ نیند سے کاہلی بڑھتی ہے اور کاہلی سے نسیان جو نیک کرداری کے لئے قاتل ہے۔ روزمرہ کے کاروبار میں بھول سے نقصان ہوتا ہے لیکن ہمارے سماج میں بھول ایک فطری بات بن گئی ہے۔ کوئی یہ محسوس نہیں

کرتا کہ نسیان بڑا بھاری عیب ہے۔ کسی سے ملنے کا وعدہ کر لیا لیکن اسے پورا نہ کیا۔ پوچھنے پر کہتے ہیں "ارے بھائی بھول گیا" ایسا کہنے والے کو محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی بڑی بھول ہو گئی ہے اور سُننے والا بھی مطمئن ہو جاتا ہے۔ لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ نسیان کا کوئی علاج ہی نہیں ہے، لیکن یہ غفلت کیا دین کیا دنیا، دونوں کے لئے مضر ہی ہے۔ دراصل نسیان ایک بڑا مرض ہے۔ اس سے عقل کو گھن لگ جاتا ہے۔ زندگی بے کیف ہو جاتی ہے۔

دماغ کی کاہلی نسیان کا سبب ہے۔ دماغ اگر بیدار رہے تو وہ بھولیگا نہیں۔ کاہل مزاج والے کو مرض نسیان لازمی ہے۔ اسی لئے بھگوان بدھ نے کہا ہے۔ "غفلت اور نسیان موت ہی ہے"۔ اس علت پر فتح پانے کے لئے آلس اور نیند کو زیر کیجئے۔ جسمانی محنت کیجئے اور ہمیشہ ہوشیار رہیئے۔ ہر کام سوچ سمجھ کر کیجئے۔ یونہی بلا سوچے سمجھے کبھی کوئی کام نہیں کرنا چاہیئے۔ کام سے پہلے بھی غور و فکر اور بعد میں بھی۔ آگے پیچھے سبھی جگہ عقل و فہم کے اینشور کو محیط رہنا چاہیئے۔ جب ایسی عادت ڈال لیں گے تو پھر غفلت کا مرض خود بخود دور ہو جائے گا۔ سارے وقت کو ٹھیک طرح سے منظم رکھیئے۔ پل پل کا حساب رکھئے۔ پھر کاہلی کو گھسنے کی جگہ نہ رہے گی۔ اس طرح تموگن کو جیتنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۷۸) رجوگن اور اس کا علاج: سودھرم کی حد میں رہنا

اسکے بعد رجوگن کی سوچ لینا ہے۔ رجوگن بھی ایک خوفناک دشمن ہے۔ یہ تموگن کا ہی دوسرا نام ہے بلکہ دونوں کو ہم معنی ہی کہنا چاہیئے۔ جب جسم بہت سو چکتا ہے تو وہ ہل جل کرنے لگتا ہے اور جو جسم بہت دوڑ دھوپ کر چکتا ہے وہ بستر پر لیٹنا چاہتا ہے۔ تموگن سے رجوگن اور رجوگن سے تموگن پیدا ہوتا ہے جہاں ایک ہوتا ہے وہاں دوسرا آیا ہی

سمجھو جس طرح روٹی ایک طرف آگ اور دوسری طرف بھوبھل میں پھنس جاتی ہے اسی طرح انسان کے آگے پیچھے رجوگن اور تموگن لگے ہی رہتے ہیں۔ رجوگن کہتا ہے "ادھر آؤ نہیں تموگن کی طرف اُڑاتا ہوں۔" تموگن کہتا ہے "میری طرف آ، تجھے رجوگن کی طرف ڈھکیلوں۔" اس طرح یہ رجوگن و تموگن ایک دوسرے کے معاون ہو کر انسان کو تباہ کر ڈالتے ہیں جس طرح فٹبال چاروں طرف سے ٹھوکریں کھانے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے، اسی طرح انسان کی زندگی بھی رجوگن اور تموگن کی ٹھوکریں کھانے ہی سے گزرتی ہے۔

رجوگن کی خاص علامت ہر طرح طرح کے کام کرنے کی ہوس، طاقت سے باہر کام کرنے کی لامحدود خواہش، رجوگن کے باعث کام میں بے انتہا اوٹ پیدا ہو جاتا ہے۔ طمع آمیز افعال میں وابستگی پیدا ہوتی ہے، ہر نفسانی عیوب کا زور سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ ادھر کا پہاڑ اُدھر لیجا کر اُدھر کا کھڈ بھر ڈالنے کی خواہش ہوتی ہے۔ ادھر سمندر میں مٹی ڈال کر اُسے پاٹ ڈالے اور اُدھر صحرا اور ریگستان میں پانی چھوڑ کر سمندر بنانے کی تحریک زور پکڑتی ہے۔ ادھر سو کر نہر کھودوں تو اُدھر پتا ماہر بناؤں ایسی ادھیڑ بن شروع ہو جاتی ہے، جوڑ توڑ کے سوا چین نہیں پڑتا۔ چھوٹا بچہ جیسے ایک کرن کو لیکر اُسے پھاڑتا ہے اور اس سے کچھ بناتا ہے ایسا ہی یہ کام بھی ہے اس میں یہ ملاؤ وہ دبا دو، اُسے یوں اُڑا دو، اسے یوں بنا دو۔ ایسے ہی بے انتہا کرشمے رجوگن سے ہوتے ہیں۔ پرندہ آسمان پر اُڑتا ہے تو ہم بھی آسمان پر کیوں نہ اُڑیں، مچھلی پانی میں رہتی ہے، تو ہم بھی پن ڈبی بنا کر پانی میں کیوں نہ رہیں؟ اسی طرح انسان قالب میں آکر چوپایوں و پرندوں کی برابری کرنے میں ہمیں کامیابی محسوس ہوتی ہے۔ دیگر اجسام میں داخل ہونے اور انکے عجائبات کا تجربہ کرنے کی ہوس اسے قالب انسانی میں رہ کر دامنگیر ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے چلو مریخ کی سیر کرائیں، وہاں کی آبادی دیکھ آئیں، بس مسلسل چکر

لگاتا رہتا ہے۔ گویا انواع و اقسام کی آرزوؤں کا بھوت ہی ہمارے قالب میں جا بیٹھا ہے جو جہاں ہے وہ وہاں دیکھا ہی نہیں جاتا۔ الٹ پلٹ ہونا چاہیئے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ میں اتنا بڑا ذی روح میرے زندہ رہتے ہوئے یہ مخلوق جیوں کی تیوں کیسے رہے؟ جیسے کوئی پہلوان ہوتا ہے، طاقت اس کے روئیں روئیں سے پھوٹ کر نکلنا چاہتی ہے۔ اسے ہضم کرنے کے لئے وہ کبھی دیوار سے ٹکر لیتا ہے اور کبھی پیڑ کو دھکا مارتا ہے۔ رجوگن کی ایسی ہی امنگیں ہوتی ہیں۔ اس کے زیر اثر انسان زمین کو گہرا کھودتا ہے، اس کے پیٹ میں سے کچھ پتھر نکالتا ہے، انہیں ہیرا، مانک، جواہر نام دیتا ہے۔ اسی امنگ کے تابع ہو کر وہ سمندر میں غوطہ لگاتا ہے اور اس کی تہ کا کوڑا کرکٹ اوپر لا کر اسے موتی نام دیتا ہے لیکن موتی میں سوراخ نہیں ہوتا، اس لئے اس میں سوراخ کرتا ہے۔ اب وہ موتی پہنیں کہاں؟ تو سنار سے ناک کان چھدوا تے ہیں۔ انسان یہ سب ادھیڑ بن کیوں کرتا ہے؟ یہ سب رجوگن کے ہی باعث ہے۔

رجوگن کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان میں استقامت نہیں رہتی۔ رجوگن فوری نتیجہ چاہتا ہے۔ اس لئے ذرا سی رکاوٹ پڑتے ہی وہ مقبول راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ رجوگنی انسان ہمیشہ اِسے لے، اُسے چھوڑ کرتا رہتا ہے۔ اس کا انتخاب روز بدلتا رہتا ہے اس کا نتیجہ آخر میں یہ ہوتا ہے کہ اس کے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا ۔

"رجوگن چنچل و غیر مستقیم ہے"

رجوگن کے سارے افعال مضطرب و غیر یقینی ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچے گیہوں بوتے ہیں اور فوراً زمین کھود کر دیکھتے ہیں۔ یہی حالت رجوگنی کی ہوتی ہے۔ جھٹ پٹ سب کچھ اس کے پلے پڑ جانا چاہئے۔ وہ بے صبر ہو جاتا ہے بے ضبط کھو دیتا ہے۔ ایک جگہ پاؤں جمانا وہ جانتا ہی نہیں۔ یہاں ذرا سا

کام کیا۔ وہاں کچھ شہرت ہوئی کہ تیسری جگہ کو چلا۔ آج مدراس میں سپاسنامہ ملا۔ کل کلکتہ میں اور پرسوں بمبئی میں۔ ناگپور میں جتنی میونسپلٹیاں ہوں اتنے ہی سپاسنامے پانے کی اُسے ہوس رہتی ہے۔ وفاداری اُسے سب جگہ دکھائی پڑتا ہے۔ ایک جگہ جم کر کام کرنے کی اسے عادت ہی نہیں ہوتی۔ اسی لئے رجوگنی انسان کی حالت بڑی خوفناک ہوتی ہے۔

رجوگن کے باعث انسان مختلف دھندوں اور بکھیڑوں میں پھنسا رہتا ہے

سودھرم کی بھی چیز اس کے لئے کچھ نہیں رہتی۔ حقیقی سودھرم آچرن کا مطلب ہے طرح طرح کے دیگر افعال کا ترک کرنا۔ گیتا کا کرم یوگ۔ رجوگن کا عملی علاج ہے۔ رجوگن میں مکمل اضطراب رہتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر گرا ہوا پانی اگر مختلف سمتوں میں بہنے لگتا ہے تو پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ سارے کا سارا منتشر ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہی پانی ایک سمت میں بہے گا تو آگے چل کر اس کی ایک ندی بن جائیگی۔ اس میں ایک طاقت پیدا ہوگی۔ ملک کو اس سے فائدہ پہنچیگا۔ اسی طرح انسان اگر اپنی ساری طاقت مختلف دھندوں میں نہ لگا کر اُسے مجموعی طور پر باقاعدہ ایک ہی کام میں لگائے تب ہی اس کے ہاتھوں کچھ کام ہوگا۔ اسی لئے سودھرم کی بڑی اہمیت ہے۔

سودھرم کا ہمیشہ خیال رکھتے ہوئے اس میں ساری قوت لگانی چاہیئے۔ دوسری چیز کی طرف دھیان ہی نہ جانے پائے۔ یہی سودھرم کی کسوٹی ہے۔ کرم یوگ کوئی بڑا اجاری کام نہیں ہے۔ گیتا کا کرم یوگ کچھ اور ہی چیز ہے۔ اس کی خصوصیت ہے نتیجہ عمل کی طرف دھیان نہ دیتے ہوئے محض فطری و مقررہ سودھرم کا انجام دینا اور اس کے ذریعہ صفائی قلب کرتے رہنا ورنہ یوں مخلوق میں مسلسل کاموں کی افراط ہوتی ہی رہتی ہے۔ "کرم" کے معنی خاص توجہ سے سارا کام کرنا۔ کھیت میں بیج بونا اور یونہی مٹھی بھر اناج لیکر کہیں پھینک دینا، دونوں بالکل جداگانہ باتیں ہیں۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اناج بونے سے کتنا پھل ملتا ہے اور یونہی اُسے پھینک دینے سے کتنا نقصان ہوتا ہے۔ گیتا جس "کرم" کا سبق دیتی ہے کہ وہ بوائی کی طرح ہے۔ ایسے سودھرم کے کرم میں بے پایاں طاقت ہوتی ہے وہاں تمام محنت و مشقت ناکافی رہتی ہے اس لئے اس میں بھاری دوڑ دھوپ کے لئے موقع ہی نہیں ہے۔

(۷۹) سودھرم کا تعیّن کیسے کیا جائے؟

تو اس دھرم کا تعین کیسے کیا جائے؟ جب ایسا سوال درپیش ہو تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ "وہ فطری اور آسان ہوتا ہے" اس کے تلاش کرنے کا تصور ہی انوکھی بات ہے۔ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کا سودھرم بھی پیدا ہوتا ہے۔ بچّہ کے لئے جیسے اس کی ماں تلاش نہیں کرنی پڑتی ویسے سودھرم بھی کسی کو تلاش نہیں کرنا پڑتا، وہ تو پہلے ہی سے حاصل ہے ہماری پیدائش سے پہلے بھی دنیا تھی اور ہمارے بعد بھی رہے گی۔ ہمارے پیچھے بھی ایک بڑا تسلسل تھا اور وہ آگے بھی رہے ہی گا۔ ایسے تسلسل میں ہمارا جنم ہوا ہے۔ جن ماں باپ کے یہاں میں نے جنم لیا ہے ان کی خدمت۔ نیز اڑوسی، پڑوسیوں کی خدمت جن کے بیچ میرا گھر ہے۔ یہ دو کام مجھے قدرتاً ملے ہیں۔ پھر رجحانات تو میرے روزمرہ کے ذاتی تجربات کے باعث ہی ہیں۔ مجھے بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے۔ اس لئے بھوکے کو کھانا کھلانا، اور پیاسے کو پانی پلانا یہ دھرم مجھے خود بخود حاصل ہو گیا ہے اس طرح خدمت گذاری و ہمدردی خلق کا سودھرم ہمیں تلاش نہیں کرنا پڑتا جہاں کہیں سودھرم کی تلاش ہو رہی ہو، وہاں بلاشبہ سمجھ لینا چاہئے کہ کچھ نہ کچھ پردھرم (دوسرے کا دھرم) یا ادھرم ہو رہا ہے۔

سیوک کو سیوا کی تلاش میں کہیں جانا نہیں پڑتا وہ خود بخود اس کے

پالس آجاتی ہے لیکن ایک بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ایسا نہیں کہہ سکتے کہ جو آسانی سے حاصل ہو وہ ہمیشہ دھرم ہی ہوگا۔ کسی کسان نے آکر مجھ سے بات میں کہا "ابھی کوئی نہیں ہے چلو وہ باڑہ چار پانچ ہاتھ آگے بڑھا دیں، میرے کھیت کی حد بڑھ جائے گی۔ بنا غل غپاڑے کے ہی کام بن جائے گا۔" اگرچہ یہ کام پڑوسی نے میرے سپرد کر دیا اور آسانی سے انجام بھی دیا جا سکتا ہے، پھر بھی چونکہ اس میں ناحق کی حمایت ہے، اس لئے وہ میرا فرض نہیں ہو سکتا۔

چتُر ورن (سماج کے ۴ طبقات برہمن، چھتری، ویش اور شودر) کا نظام جو مجھے پیارا لگتا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ اس میں فطرت اور دھرم دونوں ہیں۔ اس سودھرم کو چھوڑ کر ہی کام نہیں چل سکتا۔ جو ماں باپ مجھے ملے ہیں، وہی میرے ماں باپ رہیں گے۔ اگر میں کہوں کہ وہ مجھے پسند نہیں تو کیسے کام چلے گا۔ ماں باپ کا پیشہ فطرتاً ہی لڑکے کو وراثت میں ملتا ہے جو کام آبا و اجداد سے ہوتا چلا آ رہا ہے، وہ اگر اخلاقاً برا نہ ہو تو اسی کو کرنا، اسی کام یا دھندے کو جاری رکھنا بہتر۔ ورن کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ ورن کا نظام آج درہم برہم ہے۔ اس پر عمل درآمد بہت مشکل ہو گیا ہے لیکن اگر اسے ٹھیک راستے پر لایا جا سکے، تو بہت اچھا ہوگا۔ ورنہ شروع کے ۲۵-۳۰ سال تو نئے کام و نئے پیشے سیکھنے میں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ کام سیکھ لینے کے بعد انسان اپنے لئے میدان خدمت تلاش کرتا ہے۔ اس طرح شروع کے ۲۵ سال تک تو وہ سیکھتا ہی رہتا ہے۔ اس تعلیم کا اس کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ آئندہ زندگی کی تیاری کرتا ہے۔ تعلیم حاصل کرتے وقت گویا وہ بیدار ہی نہ ہو اور گویا زندگی حصول تعلیم کے بعد حاصل ہوگی۔ کہتے ہیں "پہلے سب سیکھنا اور بعد میں جینا۔" گویا جینا اور سیکھنا دو الگ الگ چیزیں کر دی گئی ہیں، جہاں جینے سے مطلب نہیں ہے، اسے مرنا ہی تو کہیں گے۔ ہندوستانیوں

کی اوسط عمر ۲۳ سال ہے اور ۲۵ سال تک وہ تیاری ہی کرتا رہتا ہے۔ اس طرح زیادہ حصہ سیکھنے ہی میں دن نکل جاتے ہیں۔ تب کہیں اس کام کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس طرح ذوق و اہمیت کا زمانہ بیکار ہی ضائع جاتا ہے جو ذوق و شوق خدمت خلق کر کے زندگی کو کارآمد بنا سکتا ہے وہ یوں ہی فضول برباد ہو جاتا ہے۔ زندگی ہنسی کھیل نہیں ہے، مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ زندگی کا ابتدائی بیش قیمت حصہ زندگی کا کام دھندا تلاش کرنے میں ہی چلا جاتا ہے۔ ہندو دھرم نے اسی لئے ورن دھرم کا نظام قائم کیا ہے۔

لیکن چتروَرن کے نظام سے قطع نظر سب ہی ملکوں میں سب جگہ، جہاں یہ نظام قائم نہیں ہے وہاں بھی سودھرم سب کو حاصل ہی ہے۔ ہم سب اس تسلسل میں کسی ایک حالت کو ساتھ لے کر پیدا ہوئے ہیں، اس لئے سودھرم کا کام ہمیں خود بخود ہی حاصل رہتا ہے اس لئے دور کے لبھانے والے افعال کو فرض کہنا ٹھیک نہیں وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ دکھائی دیں انہیں قبول نہیں کرنا چاہیے۔ دور کے ڈھول اکثر سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ انسان دور کی باتوں پر لٹو ہو جاتا ہے۔ انسان جہاں کھڑا ہے وہاں بھی ہرا بھرا پھیلا رہتا ہے لیکن پاس کا گھنا ہرا اسے دکھائی نہیں پڑتا۔ وہ دور انگلی دکھا کر کہتا ہے کہ وہاں بڑا ہرا پھیلا ہے۔ ادھر کا آدمی اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہتا ہے کہ تو ادھر گھنا ہرا ہے۔ ہرا سب جگہ ہے لیکن پاس کا دکھائی نہیں دیتا۔ انسان کو دور کی باتوں میں کشش معلوم ہوتی ہے نزدیک والا کونے میں پڑ جاتا ہے اور دور کا خواب میں دکھائی پڑتا ہے لیکن یہ موہ ہے اسے چھوڑنا ہی چاہیئے سو حاصل شدہ دھرم اگر معمولی ہو تو ناکافی معلوم ہوتا ہے، بے کیف محسوس ہوتا ہے تو بھی جو مجھے حاصل ہے وہی ٹھیک ہے وہی میرے لئے شُدھ ہے۔

انسان سمندر میں ڈوب رہا ہو اُسے کوئی ٹیڑھا میڑھا اور بھدا سا لکڑی کا ٹکڑا ہاتھ آجائے تو وہ پالش کیا ہوا چکنا اور خوبصورت نہ ہو تاہم وہی اسکا بچانے والا ہوگا۔ بڑھئی کے کارخانے میں بہت سے بڑھیا چکنے اور بیل بوٹے والے ٹکڑے پڑے رہتے ہیں لیکن وہ تو ہیں کارخانہ میں اور یہ یہاں سمندر میں ڈوب رہا ہے۔ جس طرح وہ بے ڈھنگا لکڑی کا ٹکڑا ہی اُسے پار لگانے والا ہے اور اسی کو اسے پکڑ لینا چاہئے اسی طرح جو خدمت میرے ہاتھ لگ گئی ہے، اگرچہ وہ کم درجہ کی کیوں معلوم ہوتی ہے، تو بھی وہی میرے کام کی ہے اسی میں محو رہنا مجھے زیب دیتا ہے۔ اسی میں میری نجات ہے۔ اس کو چھوڑ کر اگر میں دوسری خدمت تلاش کرنے کی چکر میں پڑوں گا تو یہ پہلی بھی چلی جائیگی اور دوسری ہاتھ لگنے کی نہیں۔ اس سے انسان جذبۂ خدمت سے دور ہو جاتا ہے۔ اس لئے سودھرم کے کاموں ہی میں ہمیں مگن رہنا چاہئے۔

جب ہم سودھرم میں مگن رہنے لگتے ہیں، تو رجوگن پھیکا پڑ جاتا ہے، کیونکہ من میں یکسوئی قائم ہو جاتی ہے۔ سودھرم کو چھوڑ کر وہ کہیں بھی جاتا نہیں۔ اس سے چنچل رجوگن کا سارا زور ہی کم پڑ جاتا ہے۔ ندی جب پرسکون اور گہری ہوتی ہے تو کتنا ہی پانی اس میں بڑھ جائے تو بھی وہ اُسے اپنے پیٹ میں سمو لیتی ہے۔ اسی طرح سودھرم کی ندی انسان کی ساری طاقت ساری تیزی اور ساری صلاحیت ہضم کر سکتی ہے۔ سودھرم میں جتنی طاقت خرچ کرو گے کم ہے۔ جب آپ سودھرم میں ساری طاقت لگا دیں گے تو پھر رجوگن کی دوڑ دھوپ کرنے والا رجحان غائب ہوتا نظر آئے گا۔ گویا آپ نے اپنی چنچلتا کا منہ ہی کچل دیا۔ رجوگن کو فنا بھی اسے ... ... ہے۔

(۸۰) ستوگن اور اس کی تدبیر

اب رہا ستوگن، اس سے بہت سنبھل کر رہنا چاہیئے اس سے آتما کو الگ کیسے کریں یہ بڑا نازک خیال ہے۔ ستوگن کو ایک دم اُجاڑ نہیں دینا ہے۔ رجوگن اور تموگن کو تو پورے طور سے منہدم کرنا پڑتا ہی لیکن ستوگن کی کیفیت جداگانہ ہے۔ جب بڑا بھیڑ اکھٹی ہوگئی ہو اور اُسے منتشر کرنا ہو تو سپاہیوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کمر سے نیچے پاؤں کی طرف گولی چلاؤ۔ اس سے آدمی مرتا نہیں گھائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ستوگن کو گھائل کر دینا ہے مار ڈالنا مقصد نہیں ہے۔ رجوگن اور تموگن کے چلے جانے پر جو ستوگن رہے گا اس سے الگ رہنے کے معنی آخر کیا ہیں؟

جب ستوگن کا انسان کو غرور ہو جاتا ہے تو وہ آتما کو پاکیزہ حالت سے نیچے کھینچ لاتا ہے۔ لالٹین کی روشنی کو صاف طرح سے باہر پھیلا دینا ہو تو اس کے اندر کی ساری سیاہی پونچھ ہی دینی پڑتی ہے۔ لیکن اگر کانچ پر دھول جم گئی ہو تو اسے بھی دھو ڈالنا پڑتا ہے۔ اس طرح آتما (روح) کی روشنی کے آس پاس جو تموگن کی سیاہی جمی رہتی ہے اسے اچھی طرح دور کر دینا چاہیئے پھر رجوگن کی دھول کو بھی صاف کر دینا چاہیئے۔ اس طرح جب تموگن کو دھو ڈالا اور رجوگن کو صاف کر ڈالا تو ستوگن کا کانچ باقی رہ گیا۔ اس ستوگن کو بھی دور کرنے کا منشا کیا ہے کہ کانچ کو بھی پھوڑ ڈالیں؟ نہیں، اگر کانچ ہی پھوڑ ڈالیں گے تو پھر لالٹین سے کام نہ لیا جا سکے گا شعلہ کی چمک پھیلانے کے لئے کانچ کا ہونا تو لازمی ہی ہے اس لئے اس صاف چمکدار کانچ کو پھوڑنا نہیں چاہیئے۔ لیکن اس کے سامنے کاغذ کا ایک ایسا چھوٹا سا ٹکڑا ضرور لگا دیں کہ آنکھیں چکا چوند نہ ہو جائیں۔ ضرورت صرف آنکھوں کو چکا چوند سے بچانے کی ہے۔ ستوگن پر فتح پانے کا مطلب

یہ ہے کہ اسکے متعلق ہمارا گھمنڈ ہمارا موہ دُور ہو جائے۔ ستوگن سے کام تو لے لینا ہے لیکن ترکیب سے۔ ستوگن کو نخوت سے پاک رہنا چاہیئے۔

تو اب اس ستوگن کے غرور کو کیسے زیر کیا جائے؟ اس کی ایک ترکیب کہ ستوگن کو اپنے اندر مستحکم کرے۔ دائمی مشق سے اس کا غرور دور ہو جاتا ہے۔ ستوگنی کاموں کو بھی ہم برابر کرتے رہیں، اسے اپنی فطرت میں داخل کریں۔ ستوگن ہمارا گھڑی بھر کا مہمان ہی نہ رہ جائے بلکہ وہ اپنے گھر کا ہی ہو جائے۔ جو فعل ہم کبھی کبھی کرتے ہیں اس پر ہمیں ناز ہوتا ہے۔ سوتے ہم روز ہیں لیکن اس کی چرچا دوسروں سے نہیں کرتے لیکن جب کسی بیمار کو پندرہ دن نیند نہ آئی ہو اور پھر ذرا سی نیند آ جائے تو سب سے وہ کہتا ہے "کل ذرا جھپکی لگی تھی!" اسے یہ بات بڑی اہم معلوم ہوتی ہے۔ اس سے بھی اچھی مثال سانس لینے کی ہے۔ ہم ۲۴ گھنٹے سانس لیتے ہیں لیکن کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتے۔ کیا کبھی کوئی کسی سے غرور کے ساتھ کہتا ہے "میں سانس لینے والا جاندار ہوں"؟ ہردوار میں گنگا سے بہتا بہتا ایک تنکا اگر ۱۵۰۰ میل دور کلکتہ پہنچ جائے تو کیا اس پر ناز کرے گا؟ وہ بہاؤ کے ساتھ آسانی سے بہتا چلا آیا ہے لیکن اگر طغیانی کے تیز ریلے، بہاؤ میں کوئی دس بیس ہاتھ تیز گیا تو وہ کتنی شیخی بگھارتا ہے۔ مختصر یہ کہ جو بات قدرتی ہے اس پر ہمیں غرور نہیں ہوتا۔ جب کوئی اچھا کام ہم سے ہو جاتا ہے تو ہمیں اسکا غرور ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بات فطری طور پر نہیں ہوئی۔ بچے کے ہاتھ سے کوئی کام اگر اچھا ہو گیا تو ماں اس کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دیتی ہے ورنہ یوں تو ماں کی چھڑی سے ہی اس کی پیٹھ کی ملاقات ہوتی ہے۔ رات کے گھنے اندھیرے میں کوئی ایک آدھ جگنو ہو تو پھر دیکھیئے اس کی اکڑ۔ تو وہ یکبارگی اپنی ساری چمک نہیں دکھاتا۔ وہ رہ رہ کر ٹمک ٹمک کرتا ہے پھر چھپتا اور پھر نمودار

ہوتا ہے لیکن اگر اس کی روشنی متواتر قائم رہے تو پھر اس کی اکڑ غائب ہو جائے گی۔ مداومت کے باعث خصوصیت معلوم نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر ہمارے افعال میں ہمیشہ ستوگن ظاہر ہونے لگے تو وہ ہماری عادت ثانیہ میں داخل ہو جائے گا۔ شیر کو اپنی شجاعت کا ناز نہیں ہوتا بلکہ احساس بھی نہیں رہتا۔ اسی طرح اپنی ستوگنی رجحان کو اتنا فطری ہو جانے دو کہ ہمیں اس کی یاد بھی نہ آئے۔ روشنی بخشنا آفتاب کی فطرت ہے آفتاب اس کے لئے غرور نہیں کرتا۔ اس کے لئے اگر کوئی آفتاب کو سپاسنامہ پیش کرے تو وہ کہے گا کہ اس میں میری خصوصیت کیا ہے؟ میں روشنی دیتا ہوں تو اس میں خاص بات ہی کیا ہے؟ روشنی دینا تو میرا کام ہے۔ روشنی نہ دوں تو مر جاؤں گا۔ میں دوسری کوئی چیز ہی نہیں جانتا۔ یہی کیفیت ستوگنی انسان کی ہو جانی چاہیئے۔ ستوگنی اوصاف اس کے روئیں روئیں میں پیوست ہو جانے چاہئیں۔ جب ہماری فطرت ہی اس طرح ستوگنی ہو جائے تو ہمیں اس کا گھمنڈ نہ ہوگا۔ ستوگن کو غیر اہم کرنے کی، اسے جھیلنے کی یہ ایک ترکیب ہوئی۔

اب دوسری ترکیب ہے ستوگن کے تعلق خاص کو بھی چھوڑ دینا غرور اور تعلقِ خاص یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ فرق دونوں میں قدرے باریک ہے، اس لئے مثال سے جلدی سمجھ میں آجائے گا۔ ستوگن کا غرور مٹ جانے پر بھی تعلقِ خاص باقی رہ جاتا ہے۔ سانس کی ہی مثال لے لیجئے۔ سانس لینے کا غرور تو نہیں ہوتا لیکن اس سے ایک تعلقِ خاص ہوتا ہے۔ اگر کہو کہ پانچ منٹ تک سانس روکے رہو تو ممکن نہیں۔ ناک کو سانس کا غرور نہ بھی ہو تو بھی وہ ہوا برابر لیتی رہتی ہے۔ سقراط کی ایک پر لطف کہانی ہے اس کی ناک چپٹی تھی اس لئے لوگ اسے دیکھ کر ہنسا کرتے۔ لیکن سقراط مذاقاً کہتا کہ "میری ناک سب سے حسین ہے جس ناک کے نتھنے بڑے

ہوں وہ بھرپور ہوا لے سکتی ہے اس لئے دنیا میں سب سے حسین ہے"۔
مطلب یہ کہ ناک کو سانس لینے کا غرور تو نہیں مگر خصوصی تعلق ضرور ہے۔
ستوگنوں سے بھی اسی طرح خصوصی تعلق پیدا ہوجاتا ہے مثلاً ذی روح سے ہمدردی
یہ وصف نہایت درجہ مناسب ہے لیکن اس کی بھی چپیدگی سے دور رہنا چاہیئے۔
ہمدردی مخلوق ضروری تو ہے لیکن اس کی چپیدگی نہ ہونا چاہیئے۔

سنت لوگ اسی ستوگن کی بدولت دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں
ان کا جسم ہمدردی مخلوق کے باعث عوام کا ہوجاتا ہے۔ مکھیاں جس طرح
گڑ کی بھیلی کو ڈھانک لیتی ہیں، اسی طرح ساری دنیا سنتوں پر اپنی پریم
کی چادر اوڑھاتی ہے سنتوں کے اندر پریم اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ
سارا عالم ان سے پریم کرنے لگتا ہے۔ سنت اپنے جسم سے لگاؤ ترک
کردیتے ہیں اس لئے سارا عالم کا لگاؤ ان سے ہوجاتا ہے۔ ساری
دنیا ان کے جسم کی فکر کرنے لگتی ہے لیکن یہ لگاؤ بھی سنتوں کو ترک
کردینا چاہیئے۔ یہ سنسار کا پریم جو عظیم ہے اس سے بھی آتما، روح کو الگ
رکھنا چاہیئے۔ میں کوئی مخصوص ہستی ہوں ایسا انہیں کبھی بھی محسوس نہ ہونا چاہیئے۔
اس طرح ستوگن کو جسم میں ختم کردینا چاہیئے۔

پہلے گھمنڈ کو زیر کرو پھر لگاؤ کو عبادت سے غرور جیت لیا جائے گا
اور الفت ترک کرکے ستوگن کے حاصل شدہ ثمرہ کو بھی نذر خدا کردینے سے
لگاؤ پر فتح پائی جاسکتی ہے۔ زندگی میں جب ستوگن قائم ہوجاتا ہے
تو کبھی کامیابی کے روپ میں اور کبھی نیک نامی کی شکل میں پھل سامنے
آتا ہے لیکن اس پھل کو کبھی حقیر سمجھے ۔ آم کا پیڑ اپنے ایک بھی پھل کو
خود نہیں کھاتا چاہے وہ کتنا ہی میٹھا، رسیلا اور بڑھیا کیوں نہ ہو

لیکن کھانے کی بہ نسبت نہ کھانا ہی اسے زیادہ شیریں لگتا ہے۔ لطف لذات کی بہ نسبت ترک لذات زیادہ شیریں ہے - دھرم راج بدھشٹر نے اپنی ذات کی ساری نیک کرداری کے ثمرہ عیش بہشت کو بھی بالآخر ٹھکرا دیا اور زندگی کی ساری قربانیوں پر چار چاند لگا دیے۔ ان شیریں پھلوں کو چکھنے کا انہیں حق تھا لیکن اگر وہ انہیں چکھ لیتے تو وہ پھل ضائع جاتے۔ "نیکی کے ختم ہونے پر وہ اس دنیائے فانی میں واپس آتے ہیں"۔ یہ سلسلہ پھر ان کے پیچھے لگ جاتا۔ بدھشٹر کی اتنی بڑی قربانی ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے۔ اس طرح ستوگن کے مسلسل عمل سے اس کے غرور جیت لینا چاہیئے اور بے تعلق رہ کر سب پھل ایشور کی نذر کر کے اس کے لگاؤ سے الگ ہو جانا چاہیئے تب کہہ سکتے ہیں کہ ستوگن پر فتح حاصل ہو گئی۔

(۸۱) آخری بات: آتم گیان اور بھگتی کی پناہ

اب آخری بات، آپ بھلے ہی ستوگنی ہو جائے غرور کو جیت لیجئے، پھل کی چاہ بھی چھوڑ دیجئے، پھر بھی جب تک یہ جسم قائم ہے تب تک وقتاً فوقتاً رجوگن اور تموگن کے حملے ہوتے ہی رہیں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر ہمیں محسوس بھی ہوا کہ ہم نے ان گنوں کو جیت لیا، تو بھی وہ باربار زور مارتے اس لئے ہر وقت چوکنا رہنا چاہیئے۔ سمندر کا پانی تیزی سے اندر گھس گھس کر جس طرح بڑی کھاڑیاں بنا لیتا ہے، اسی طرح رجوگن و تموگن کا تیز سیلاب ہمارے ارض قلب میں گھس کر کھاڑیاں بنا لیتے ہیں، اس لئے ذرا بھی سوراخ نہ رہنے دیجئے۔ پکا انتظام و پہرہ رکھئے۔ خواہ کتنی ہی احتیاط و ہوشیاری برتئے، جب تک آتم گیان حاصل نہیں ہوا، آتم درشن نہ ہو تب تک خطرہ ہی سمجھئے۔

اس لئے کوشش کرکے آتم گیان حاصل کر لیجیے۔

آتم گیان محض جاگنے کی ورزش سے حاصل نہ ہو گا تو پھر ہو گا کیسے؟ کیا مشق سے؟ نہیں اس کی ایک ہی ترکیب ہے یعنی "صدق دلی و قلبی اضطراب سے ایشور کی بھگتی کرنا"۔ آپ رجوگن و تموگن کو جیتیں، ستوگن کو قائم کرکے اس کی خواہش ثمرہ کو بھی چھوڑ دیں۔ لیکن اتنے سے بھی کام نہیں چلے گا۔ جب تک آتم گیان' عرفان روح حاصل نہ ہو گا مقصد پورا نہ ہو گا اس لئے بالآخر ایشور کا فضل چاہیئے ہی! صدق دلی سے بھگتی کرنے پر ہی ایشور کے رحم و کرم کے ہم مستحق بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی دوسری ترکیب نظر نہیں آتی۔ اس باب کے آخر میں ارجن نے یہی سوال پوچھا ہے اور بھگوان نے جواب دیا ہے "انتہائی یکسوئی و سکون قلب سے بے غرض ہو کر میری بھگتی و سیوا کرو۔ جو اس طرح میری عبادت کرتا ہے وہ مایا کے اُس پار جا سکتا ہے نہیں تو اس گہری دنیاوی الفت کو تیر جانا آسان نہیں ہے" یہی بھگتی کا آسان طریقہ ہے اور اس کے لئے یہی ایک اکیلا راستہ ہے۔

اتوار ۲۲-۵-۳۲

پندرھواں باب

مکمل یوگ : ہر جگہ خدا کا دیدار

(۸۲) بھگتی مجاہدہ کی راہ سے مختلف نہیں

آج ایک لحاظ سے ہم گیتا کے کنارے پر آپہنچے ہیں۔ پندرھویں باب میں جملہ تصورات کی تکمیل ہو گئی ہے۔ سولہویں و سترہویں باب بطور تتمہ ہیں اور آخری اٹھارواں باب خلاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھگوان نے پندرہویں باب کو "شاستر" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ "کہا نشیا پ جے میں نے گوڑھ اتینت ساشتر یہہ" ایسا آخر میں بھگوان نے کہا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ یہ آخری باب ہے بلکہ اس لئے کہ اب تک زندگی کے جو اصول اور آئین بتائے گئے ہیں ان کی تکمیل اس باب میں کی گئی ہے اور نیک عملی کو کمال حاصل ہو گیا ہے۔ ویدوں کا سارا خلاصہ اس میں آگیا۔ نیکی کا تصور انسان میں پیدا کر دینا ہی ویدوں کا کام ہے وہ اس باب میں کیا گیا ہے۔ اسی لئے ویدوں کا خلاصہ ہی عظیم مرتبہ اسے عطا کیا گیا ہے۔

تیرہویں باب میں جسم سے آتما کو علیحدہ کرنے کی ضرورت دکھلائی گئی۔ چودہویں میں اس سے متعلق آئین و تدابیر کی چھان بین کی گئی۔ رجوگن اور تموگن کو ضبط کے ساتھ ترک کریں۔ ستوگن کو عروج دے کر اس کے ارتباط و اختلاط پر فتح

حاصل کریں۔ اسکے پھل کا تیاگ کریں، اس طرح یہ کوشش کرنی ہے۔ آخر میں بتایا کہ ان کوششوں کی پوری کامیابی کیلئے آتم گیان (عرفان نفس) لازمی ہے اور آتم گیان بلا بھگتی کے ممکن نہیں ہے، لیکن بھگتی کا یہ راستہ راہ سعی سے علیحدہ نہیں ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے اس باب کے آغاز میں ہی عالم کو ایک بڑے پیڑ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سہ گانہ صفات سے پالی پوسی بڑی شاخیں اس پیڑ کی ہیں۔ شروع ہی میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ تیاگ (ترک) اور ویراگ (بے تعلقی) ان آلوں سے اس پیڑ کو کاٹنا چاہیئے یہ عیاں ہے کہ پچھلے باب میں جو طریقہ عمل بتایا گیا ہے وہی یہاں پھر آغاز میں دہرایا گیا ہے۔ رجوگن و تموگن کو مٹانا اور ستوگن کی مدد سے اپنی ترقی کر لیتا ہے۔ ایک کام تخریبی اور دوسرا تعمیری۔ دونوں ملا کر راستہ ایک ہی بنتا ہے۔ گھاس پھوس کاٹنا اور بیج بونا، دونوں ایک ہی عمل کے جداگانہ رخ ہیں۔ ویسی ہی بات ہے۔ رامائن میں راون، کمبھ کرن، وبھیشن تین بھائی ہیں۔ کمبھ کرن تموگن ہے، راون رجوگن ہے وبھیشن ستوگن ہے۔ ہمارے جسم میں ان تینوں کی رامائن نمودار ہو رہی ہے۔ اس رامائن میں راون اور کمبھ کرن کا تو خاتمہ ہی ٹھیک ہے۔ باقی رہی وبھیشن والی حقیقت۔ وہ بھی اگر پناہ ایزدی میں آجائے تو موجب ترقی و تقویت ہو سکے گی۔ اس لئے وہ اختیار کئے جانے کے لائق ہے۔ چودھویں ادھیائے میں ہم نے اس بات کو سمجھ لیا ہے۔ اس پندرھویں باب کے شروع میں پھر وہی بات کہی گئی ہے۔ ستوگن رجوگن اور تموگن سے آلودہ سنسار کو آلہ بے لوثی سے چھید ڈالو تموگن و رجوگن کو زیر کر کے ستوگن کو ترقی دے کر پاکیزہ ہو اور اس کی محبت پر فتح حاصل کر کے بے لوث ہو جاؤ۔ کنول کے پھول کا یہ نصب العین بھگوت گیتا

پیش کر رہا ہے ہندوستانی تہذیب میں زندگی کی ممتاز و اعلیٰ ترین اشیاء کی تشبیہ کنول سے دی گئی ہے۔ کنول ہندوستانی تہذیب کی علامت ہے۔ اعلیٰ و بلند خیالات کو ظاہر کرنے کی علامت کنول ہے۔ کنول پاک صاف ہوتے ہوئے بھی بے تعلق رہتا ہے پاکیزگی اور بے تعلقی دونوں اوصاف کنول میں ہیں بھگوان کے مختلف اعضا کی تشبیہ کنول سے دیتے ہیں۔ کنول جیسی آنکھیں، کنول جیسے پاؤں، کنول کنول جیسے ہاتھ، کنول جیسا چہرہ، کنول جیسی ناک، کنول جیسا دل، کنول جیسا سر وغیرہ تشبیہوں کے ذریعہ یہ جذبہ ہمارے دل میں نقش کیا ہے کہ تمام جگہ حسن اور پاکیزگی کے ساتھ ہی بے لوثی رہنی چاہیے۔

پچھلے باب میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے اس کی تکمیل کے لئے ہی یہ لکھا گیا ہے صحیح عمل میں جب آتم گیان (عرفان روح) اور بھگتی مل جائیں گے تب کمال حاصل ہو جائے گا بھگتی سچی عمل کا ہی ایک جزو ہے۔ عرفان روح اور بھگتی یہ اسی طریقۂ عمل کے حصے ہیں۔ دیدوں میں رشی کہتے ہیں۔

"جو بیدار رہتے ہیں اُن سے وید پریم کرتے ہیں ان سے ملاقات کے لئے وہ آتے ہیں" مطلب یہ کہ جو بیدار رہتے ہیں ان کے پاس وید نارائن آتے ہیں۔ ان کے پاس گیان آتا ہے۔ بھگتی آتی ہے۔ سچی عمل سے گیان (عرفان) اور بھگتی الگ نہیں ہیں۔ اس ادھیائے میں یہی دکھاتا ہے کہ یہی دونوں عادتیں سچی عمل کو شیریں بناتی ہیں اسلئے یکسوئی قلب سے بھگتی و گیان کی اس شکل کو ملاحظہ فرمایئے۔

(۸۴) بھگتی سے مجاہدہ آسان ہو جاتا ہے

میں زندگی کے ٹکڑے نہیں کر سکتا۔ کرم گیان اور بھگتی کو میں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا: نہ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ مثال کے طور پر اس جیل کے باورچی خانے کے کام کو لیجئے۔ پانچ سات سو آدمیوں کا کھانا

پکانے کا کام ہم میں کچھ لوگ کرتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسا شخص ہو گا جسے کھانا پکانے کا صحیح علم نہ ہو تو وہ کھانا خراب کر دے گا۔ روٹیاں کچی رہ جائیں گی یا جل جائیں گی۔ لیکن ہم یہاں مان لیں کہ کھانا پکانے کا علم بہت عمدہ ہے، پھر بھی اگر اس شخص کو قلبی محبت اس کام سے نہ ہو جذبہ بھگتی نہ ہو کہ یہ روٹیاں میرے بھائیوں کو یعنی بھگوان کو ملیں گی یعنی بھگوان کو ہی پہنچنے والی ہیں انہیں اچھی طرح بیلنا و سینکنا چاہیے، یہ ایشور کی ہی خدمت ہے۔ ایسا جذبہ اگر اس کے دل میں نہ ہو تو علم مذکور ہوتے ہوئے بھی وہ اس کام کے لئے ٹھیک نہ ثابت ہو گا۔ اس باورچی خانہ کے کام کے لئے جس طرح گیان یا علم کی ضرورت ہے۔ اس طرح پریم یا محبت کی بھی ضرورت ہے۔ جذبۂ خدمت کی شیرینی ملی ہوئی نہ ہو، تو کھانا لذیذ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے تو بجز ماں کی رسوئی پھیکی رہتی ہے۔ ماں کے سوا دوسرا کون اس کام کو اتنی لگن اور محبت سے کرے گا؟ پھر اس کے لئے ہرا صحت بھی چاہیے۔ بلا گرمی برداشت کئے، بلا تکلیف اٹھائے یہ کام کیسے ہو گا؟ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی بھی عمل کو کامیاب بنانے کے لئے پریم گیان اور کرم تینوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ زندگی کے سارے اعمال انہی تین گنوں (صفات) پر منحصر ہیں۔ تپائی کا اگر ایک پایہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ تینوں پائے ضروری ہیں۔ اس کے نام ہی میں اس کی شکل موجود ہے یہی حال زندگی کا ہے۔ علم، خدمت اور عمل یعنی دائمی محنت؛ یہ زندگی کے تین پائے ہیں۔ انہیں تین پایوں پر زندگی کی عمارت کھڑی کرنی ہے۔ انہیں تین پاؤں سے مل کر ایک ہی شے بنتی ہے۔ تپائی کی مثال لفظ بہ لفظ اس پر صادق آتی ہے۔ بحث مباحثہ کے لحاظ سے آپ چاہے بھگتی، گیان اور کرم کو جدا جدا مانیں لیکن بدیہی طور پر ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تینوں کو ملا کر ایک ہی عظیم شے بنتی ہے۔

ایسا ہونے پر بھی یہ بات نہیں کہ بھگتی میں خاص وصف نہ ہو کیونکہ کسی بھی کام میں جب بھگتی کی روح بھی شامل ہو گی تب ہی وہ آسان معلوم ہوگا۔ آسان معلوم ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ تکلیف نہیں ہوگی بلکہ یہ کہ وہ تکلیف تکلیف نہیں معلوم ہوگی۔ برخلاف اس کے بشاشت معلوم ہوگی۔ کانٹے پھول کی طرح معلوم ہونگے۔ بھائی انو راہ بھگتی آسان ہے اس کا مطلب کیا؟ یہی کہ جذبۂ بھگتی کے باعث کام کا بوجھ نہیں معلوم ہوتا۔ دشواری بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ کتنا ہی کام کرو معلوم ہوتا ہے کہ گویا کیا ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰ ایک جگہ کہتے ہیں اگر تو روزہ رکھتا ہے تو چہرہ پر اس کی تکان نہ معلوم ہونا چاہیئے۔ برخلاف اس کے تیرا چہرہ و تیرے رخسار خوشنودار، بشاش و شگفتہ دکھائی دینے چاہیئے ایسا نہ دکھائی دینا چاہیئے کہ فاقہ سے تکلیف ہو رہی ہے۔

مختصر یہ کہ ہماری عادتیں اس قدر خدمت کے جذبات سے لبریز اور غرق ہوجانی چاہئیں کہ ہم تکلیفوں کو بھول جائیں۔ ہم کہتے ہیں نا کہ فلاں بہادر دیس بھگت ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ گیا۔ منھ سے کرشن، وشنو، کی آواز نکل رہی تھی۔ اسکا اتنا ہی مطلب ہے کہ بے پایاں مصیبت آجانے پر بھی بھگتی کے زور کے باعث وہ کچھ بھی نہ معلوم ہوئی۔ پانی پر پڑی ناؤ کو دھکیلنا مشکل نہیں ہے لیکن اگر اس کو زمین اور چٹانوں پر سے کھینچ کر لے جانا پڑے تو کتنی محنت پڑے گی؟ ناؤ کے تلے اگر پانی ہوگا تو ہم بآسانی پار کر جائیں گے سہولت سے تیرا نے جائیں گے۔ اسی طرح ہماری کشتی حیات کے تلے اگر آب بھگتی ہوگا تو وہ آنند کے ساتھ کھیئی جا سکے گی لیکن اگر زندگی خشک ہوگی راستہ میں ایٹ کنکر، پتھر، کھڈ اور خار ہوں گے تو اس کشتی کو کھینچ کر لے جانا بڑا ہی مشکل ہوجائیگا۔ بھگتی کی طرح ہماری کشتی حیات کے لئے آب سہولت بہم پہنچاتی ہے۔

بھگتی کے ذریعہ عمل آسان ہو جاتا ہے۔ مگر آتم گیان (معرفت) کے بغیر

دوامی طور پر صفات سہ گانہ (تموگن، رجوگن اور ستوگن) کا عبور کر لینے کی امید نہیں نہیں ہے۔ تو پھر آتم گیان کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ یہی کہ ستوگن کی مدد اور متواتر ستوگن کو باطن میں جذب کر کے اس کے گھمنڈ و تشٹ کی چادر کو بھگتی کے ذریعہ زیر کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طریقۂ عمل کے ذریعہ لگاتار و مسلسل کوشش کرتے ہوئے ایک دن آتم درشن (عرفان) حاصل ہو جائے گا۔ اس وقت تک ہماری کوششوں کا خاتمہ نہ ہوگا۔ یہ بہترین سعی کی بات ہے۔ آتم درشن کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ راستہ چلتے یونہی آتم درشن ہو جائے گا، ایسا نہیں ہے۔ اس کے لیے مسلسل ریاضت کرنی پڑے گی۔ راہِ معرفت کے لیے شرط ہے کہ "میں ناامیدی کو قطعی جگہ نہ دوں ایک لمحہ کبھی مایوس ہو کر نہ بیٹھوں" اس کے سوا پرمارتھ کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ کبھی کبھی عامل تھک جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے "بھگوان! تمہارے لئے کہاں تک ریاضت کروں؟" لیکن ایسا کہنا اہمیت نہیں رکھتا۔ ریاضت اور تقویٰ کی ہم کو اتنی مشق کرنی چاہیئے کہ وہ ہماری عادت بن جائے۔ "کہاں تک کوشش کرتے رہیں"؟ یہ بات راہ بھگتی میں زیب نہیں دیتی بے صبری اور مایوسی کو بھگتی کبھی پیدا ہی نہ ہونے دے گی۔ بزدلیٔ قلب کی وہاں کوئی گنجائش نہیں۔ بھگتی میں درجہ بدرجہ افزونیٔ ذوق و ہمت کا احساس ہوتا رہنا چاہیئے۔ اسکے لئے اس باب میں بہت ہی اعلیٰ تصور کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۸۴) سیوا کی تثلیث: مخدوم، خادم، ذریعۂ خدمت

اس عالم میں ہمیں بے انتہا چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے تین حصے کیجئے جب کوئی بھگت سویرے اٹھتا ہے تو تین ہی چیزیں آپ کی آنکھوں کے

کے سامنے آتی ہیں پہلے اس کا دھیان خدا کی طرف جاتا ہے تب اسکی عبادت کی تیاری کرتا ہے۔ میں خادم اور عابد اور وہ مخدوم ایشور مالک یہ دو چیزیں اسکے پاس رہتی ہیں۔ باقی رہی کائنات جو اس کی عبادت کا وسیلہ ہے گل شمیم عود و چراغ ان کے لئے یہ ساری کائنات ہے تین ہی چیزیں ہیں بھگت، مخدوم، پرماتما اور تسبیل خدمت کی شکل میں یہ کائنات! یہی تعلیم اس باب میں دی گئی ہے لیکن جو سیوک ایک مورت کی پوجا کرتا ہے اسے دنیا کی ساری چیزیں تسبیل عبادت نہیں معلوم ہوتیں وہ باغ سے چار پھول توڑ کر لاتا ہے۔ کہیں سے اگر کی بتی لے آتا ہے کچھ چڑھاوا بھی لگا دیتا ہے وہ چن کر منتخب کرکے ہی چیزیں لینا چاہتا ہے لیکن پندرہویں باب کی اعلیٰ تعلیم کے پیش نظر اس انتخاب کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے جتنے بھی طریقے ہیں اور عمل کے جو وسیلے ہیں وہ سب خدمت خدا کے ذریعہ ہیں! ان میں کچھ کو ہم گل کہیں گے کچھ کو شمیم اور کچھ کو نذر نیاز۔ اس طرح جتنے بھی اعمال ہیں ان کو سامان عبادت بنا دینا چاہیئے۔ ایسا ہی یہ نظریہ ہے۔ عالم میں صرف یہی تین چیزیں ہیں۔ گیتا جس بے لوث طریقہ عمل کو ہمارے دل پر نقش کرنا چاہتی ہے اسی کو وہ بھگتی آمیز شکل دے رہی ہے، اس طریق عمل سے احساس عمل کو مٹا کر سہولت بہم پہنچاتی ہے۔

آشرم میں اگر کسی کو بہت زیادہ کام کرنا پڑا تو اس کے من میں یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ میں ہی کیوں زیادہ کام کروں؟ اس بات میں بڑا وزن ہے پجاری کو اگر دو گھنٹے کے بجائے چار گھنٹے عبادت کرنی پڑے تو کیا وہ اکتا کر ایسا کہے گا "ارے رام! آج تو چار گھنٹے پوجا کرنی پڑی"؟ بلکہ اس میں اسے زیادہ مسرت حاصل ہوگی۔ آشرم میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے اور یہی احساس ہمیں زندگی میں ہر جگہ ہونا چاہیئے۔ زندگی میں خدمت خلق صرف کر دینا چاہیئے۔ وہ مخدوم اعلیٰ ترین ہستی۔ اس کی خدمت گذاری کے لئے

ہردم مستعد "میں" "اکچھر پرش" ہوں۔ "اکچھر پرش" کا مطلب ہے کبھی بھی نہ تھکنے والا اور ابتدائے آفرینش سے مسلسل خدمت کرنے والا جس طرح ہنومان جی ہمیشہ ہاتھ جوڑ کر رام کے سامنے مستعد کھڑے رہتے ہیں جن میں سُستی نام کو کبھی نہیں ہے انہیں ہنومان جی کی طرح ہی یہ خادم بھی ہمیشہ مستعد ہے۔

ایسے دائمی خادم کا ہی نام "اکچھر پرش" ہے "ایشور" یہ آئین قائم ہے اور میں اس کا خادم بھی ہمیشہ قائم ہوں۔ پربھو قائم ہے تو میں بھی قائم ہوں.... دیکھئے وہ خدمت لیتے ہوئے تھکتا ہے یا میں خدمت کرتے ہوئے۔ اگر اس نے دس اوتار لئے، تو میرے بھی دس اوتار ہوئے ہیں۔ وہ رام ہوا ہے تو میں ہنومان؛ وہ کرشن ہے، تو میں اودھو۔ جتنے اس کے اوتار اتنے ہی میرے ابھی باری لگ رہی ہے۔ ایشور کا قدیم خادم زمانہ بزمانہ خدمت کرنے والا اور کبھی نہ فنا ہونے والا یہ انسان "اکچھر پرش" ہے۔ وہ مخدوم اعلیٰ ترین ہستی اور میں اس کا ناچیز بندہ اور خادم۔ یہ تصور مسلسل دل میں رہنا چاہیئے اور ہر لحظہ تغیر پذیر اور لا انتہا شکلیں اختیار کرنے والی اس کائنات کو ذریعہ عبادت اور ذریعہ خدمت بنانا ہے ہر فعل گویا اس اعلیٰ ترین ہستی کی عبادت ہی ہے۔

مخدوم ایشور ہستئ عظیم و خادم ہستئ روح جاوید! لیکن یہ سارا محض روپ عالم فانی ہے اس فنا میں بھی بڑا راز ہے۔ کائنات کا یہ عیب نہیں ہے بلکہ اس کی زینت ہے اس سے عالم میں ہر محدود تجدید ہوتی رہتی ہے۔ کل کے پھول آج کام نہیں دے سکتے۔ وہ بیکار ہو گئے۔ عالم فانی ہے۔ یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ یہ خدمت گزاری کی عظمت ہے۔ روزانہ نیا پھول خدمت کے لئے نیا ملتا ہے اسی طرح میں بھی نئے نئے قالب اختیار کر کے خدمت ادا کروں گا اور اپنے وسیلوں کو نئی شکلیں دوں گا۔

اور انہیں کے ذریعہ اسکی عبادت کرنا ہوگا۔ اس دنیا کی ہی بدولت یہ لطف ہے۔ رونق مہتاب۔ جو آج ہے وہ کل نہیں۔ چاند کے روزانہ نئے حسن اور دوج کے بڑھتے ہوئے چاند کو دیکھ کر کتنی مسرت حاصل ہوتی ہے شنکر جی کی پیشانی پہ دوج کا چاند کیسا چمکتا ہے۔ اشٹمی کے چاند کی خوبصورتی کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ اس وقت رات میں چندہ موتی ہی دکھائی دیتے ہیں۔ پورنماشی کو تابندگی ماہتاب سے تارے دکھائی نہیں پڑتے۔ اس رات میں پرمیشور کا روئے قمر نظر آتا ہے۔ اماوس کا لطف تو بڑا ہی سنجیدہ ہوتا ہے اس رات کو کتنا سکوت طاری رہتا ہے ماہتاب کی ظالم روشنی کے ہٹ جانے سے چھوٹے بڑے بیشمار ستارے بڑی آزادی سے کھل کر چمکتے ہیں اماوس کو آزادی پورے طور پر آنند لیتی ہے۔ اپنے نور کی شان رکھنے والا ماہتاب آج وہاں نہیں ہے آج وہ اپنے منبع نور آفتاب سے یک رو ہو گیا ہے وہ پرمیشور میں مل گیا ہے۔ آج وہ سمجھا جاتا ہے کہ ذی بندہ اپنے کو حوالۂ خدا کر کے کیسے عالم کی ایذا رسانی سے باز آئے۔ ماہتاب تغیر پذیر ہے لیکن وہ مختلف شکلوں میں لطف دیتا ہے۔

عالم کی فنا ہی اس کی بقا ہے۔ حُسن عالم چھل چھل آ رہا ہے۔ یہ دریا ہے حُسن عالم اگر رواں نہ رہے تو ایک مجموعہ آب استادہ بن جائے گا۔ آب دریا مسلسل رواں رہتا ہے اور ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ ایک بوند گیا دوسرا آیا۔ اسی سے اس پانی کی زندگی ہے کیسی چیز میں۔ جو لطف محسوس ہوتا ہے وہ اسکے نئے پن کی وجہ سے گرمیوں میں پرماتما کو اور قسم کے پھول چڑھائے جاتے ہیں برسات میں ہری دوب چڑھائی جاتی ہے اور جاڑوں کے موسم میں خوبصورت کنول کے پھول ہمیشہ موسم اور وقت کے لحاظ سے پھول پھلوں سے ایشور کی پوجا کی جاتی ہے اسی سے وہ پوجا ہمیشہ دلکش و نئی معلوم ہوتی ہے اس سے جی نہیں اکتاتا۔ چھوٹے بچے کو جب "ک" لکھ کے کہتے ہیں اس پہ [illegible]

اُسے موٹا بناؤ تو یہ حرکت اُسے اُکتا دینے والی معلوم ہوتی ہے اور وہ نہیں سمجھ سکتا کہ اُسے موٹا کیوں بنایا جاتا ہے۔ وہ پنسل آڑی کر کے اسے جلدی سے موٹا بنا دیتا ہے بعد میں وہ نئے نئے حرفوں کو اور ان کے مختلف مرکبات کو دیکھتا ہے اور طرح طرح کی کتابیں پڑھنے لگتا ہے اور ادب و لٹریچر کی لاتعداد کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اور بے انتہا لطف اُٹھاتا ہے یہی بات دائرۂ خدمت میں ہر طریقہ کار کی تجدید کے باعث جذبۂ محبت ترقی کرتا ہے اور سیوا کی خواہش زور پکڑتی ہے۔

عالم کی یہ فنائیت ہمیشہ نئے نئے پھول کھلا رہی ہے۔ گاؤں کے قریب قبرستان ہے اس سے گاؤں اچھا لگتا ہے۔ پرانے لوگ جا رہے ہیں اور نئے بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ عالم روز افزوں ترقی پر ہے۔ باہر کا وہ قبرستان مٹا دو گے، تو وہ گھر میں آ بیٹھے گا اور تم اُنہیں ان اشخاص کو روز روز یکساں دیکھ کر گھبرا اُٹھو گے۔ گرمیوں میں گرمی پڑتی ہے۔ زمین تپ جاتی ہے لیکن اس سے گھبراؤ نہ۔ یہ حالت بدل جائے گی۔ برسات کا سکھ لینے کے لئے یہ تپش ضروری ہے اگر زمین خوب تپی نہ ہو گی تو پانی پڑتے ہی وہ کیچڑ ہو جائے گی اور اناج اور گھاس پھوس اس میں اُگنے نہ پائیں گے۔ میں ایک بار گرمیوں میں گھوم رہا تھا سر تپ رہا تھا۔ بڑا آنند آ رہا تھا۔ ایک دوست نے کہا "سر گرم ہو جائیگا پھر تکلیف ہو گی"۔ میں نے جواب دیا "نیچے زمین بھی تو تپ رہی ہے؟ اس مٹی کے پتلے کو بھی ذرا تپنے دو۔ آہا! ادھر سر تپتا ہوا ہو ادھر پانی کی پھوہاریں پڑنے لگے، تو کیسی بہار ہو! لیکن جو گرمیوں میں تپتا نہیں وہ پانی برسنے پر بھی اپنے کتاب ہی میں سر دیئے بیٹھا رہے گا۔ اپنے کمرے کی قبر میں ہی گھُسا رہے گا۔ باہر کے اس ابر باراں کے ظرف عظیم کے نیچے کھڑا ہو کر خوشی سے ناچ

نہ لگے گا۔ لیکن ہمارے بزرگ منوجی جیسے خوش طبع گورودیو اس خطرات کے لکھتے ہیں "جب پانی برسنے لگے تو چھٹی کر دو"۔ جب بارش ہو رہی ہو تو کیا آشرم میں رہ کر رونا گانا کرتے رہیں۔ بارش میں تو ناچنا گانا چاہیئے۔ کائنات سے ہم آہنگ ہو جانا چاہیئے۔ بارش میں زمین اور آسمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ خوشگوار منظر کتنا لطف انگیز ہے یہ دنیا خود ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ سنسار عالم سے مطلب ہے، ذرائع کی تجدید۔ اس طرح یہ نئی نئی طریقوں کو جنم دینے والی اور تجدید کرنے والی کائنات اور کرم کس کرنے کے لئے ہمیشہ مستعد خادم اور وہ مخدوم پرمیشور اب چلنے دو کھیل۔ وہ عظیم ترین پرشوتم، اعلیٰ ہستی، عجیب و غریب نئے نئے ذرائع خدمت دے کر مجھ سے محبت آمیز خدمت لے رہا ہے مختلف اقسام کے ذرائع بہم پہنچا کر مجھے کھلا رہا ہے اور طرح طرح کے اعمال مجھ سے کرا رہا ہے۔ اگر ہمیں زندگی میں ایسا نظریہ نصیب ہو تو لطف آئے۔

(۸۵) خود ستائی سے پاک خدمت کا ہی مطلب بھگتی

گیتا چاہتی ہے کہ ہمارا ہر کام بھگتی سے لبریز ہو۔ ہم جو گھنٹہ آدھ گھنٹہ خدا کی عبادت کرتے ہیں وہ ٹھیک ہی ہے صبح و شام جب دلکش قدرت کا رنگ نشانی کرتا ہے اس وقت یکسوئی قلب کے ذریعہ تھوڑی دیر کے لئے دنیا کو فراموش کر کے یاد خدا میں مصروف ہو جانا بہت ہی اچھی بات ہے۔ اس نیک کرداری کو کبھی نہ چھوڑنا چاہیئے۔ لیکن گیتا اتنے پر ہی اکتفا نہیں کرتی ہے۔ صبح سے شام تک کے تمام افعال ایشور پوجا کے لئے ہونے چاہئیں۔ جھاڑو دیتے وقت، نہاتے کھاتے، چلتے پھرتے۔ غرض ہر کام میں اس کی یاد رہنی چاہیئے۔ جھاڑو دیتے وقت یہ جذبہ ہونا چاہیئے کہ میں اپنے مالک و خالق کا آنگن صاف کر رہا ہوں۔ ہمارے

تمام کام اس طرح کار عبادت ہونے چاہئیں۔ اگر یہ نظریہ قائم ہو جائے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کے اعمال میں کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ ہم کتنی دلچسپی سے پھول چنتے ہیں اور قاعدے سے ٹوکری میں احتیاط رکھتے ہیں تاکہ وہ دب نہ جائیں، کچل نہ جائیں، کملا نہ جائیں۔ ہم اس کا کتنا دھیان رکھتے ہیں۔ اس خیال سے انہیں ناک کے پاس نہیں لے جاتے کہ کہیں گندے نہ ہو جائیں۔ یہی خیال یہی نظریہ ہماری زندگی کے روزمرہ کے کاموں میں ہونا چاہیئے۔ اپنے گاؤں میں پڑوسی کی شکل میں میرا ایشور، میرا خدا ہی تو نظر آ رہا ہے۔ اس لئے اس گاؤں کو میں صاف ستھرا اور اُجلا رکھوں گا۔ گیتا ہمیں ایسا نظریہ دینا چاہتی ہے۔ گیتا کو بڑا اشتیاق ہے کہ ہمارے تمام افعال عبادت خدا ہی ہو جائیں۔ گیتا جیسی کتاب عظیم کو گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی عبادت سے سیری نہیں ہوتی۔ ساری زندگی وقف خدا اور بہ شکل عبادت ہونی چاہیئے۔ یہی گیتا کی دلی آرزو ہے۔

گیتا پرسوتم یوگ، بتا کر عملیات کی زندگی کو درجہ کمال تک پہنچاتی ہے۔ وہ مخدوم معبود، میں اس کا خادم اور یہ ساری کائنات ذریعہ خدمت۔ اگر ایک دفعہ بھی اس حقیقت کا نظارہ ہو جائے تو پھر اور کیا چاہیئے۔ تکارام کہتے ہیں

"ہو گا درشن تو کروں گا سیوا اور کچھ نہیں چاہوں۔" دیکھو!

پھر تو مسلسل خدمت ہی ہم سے ہوتی رہے گی۔ اس وقت خودی نابود ہو جائے گی۔ خودی و خود رائی سب مٹ جائے گی۔ اب جو کچھ ہے اور آنند ہوگا سب خدا کے لئے "زیست برائے دیگراں" کے سوا، دوسرا کوئی مضمون ہی نہ رہ جائے گا۔ گیتا بار بار یہ کہہ رہی ہے کہ میں اپنے سے خودی کو نکال کر زندگی کو نذر حق کر دوں اور شگفتگی سے سرابور کر دوں۔ مخدوم ایشور۔ میں خادم اور یہ عالم ذریعہ خدمت، اندوختگی کا سوال ہی کہاں رہا؟ زندگی

میں اب کسی بات کی فکر نہیں۔

(۸۶) گیان کی نشانی: "ہمہ اوست" کا انکشاف

اس طرح اب تک ہم نے یہ دیکھا کہ بھکتی برتنی چاہیے لیکن اس میں گیان کی آمیزش کی بھی ضرورت ہے، ورنہ گیتا کو اطمینان نہ ہوگا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ صرف سمجھنے کے لیے ہم نے تینوں الگ الگ نام رکھ دیے ہیں۔ کرم (کام) کا مطلب ہی بھکتی ہے۔ بھکتی کو الگ سے لاکر کرم میں ملانا نہیں پڑتا۔ یہی بات گیان کی ہے۔ یہ گیان ملے گا کیسے؟ گیتا کہتی ہے "ہر جگہ دیدار خدا ہے" تم خدمت گزار دائمی خادم خدمت کرنے والی ہستی اور وہ مخدوم اعلیٰ ہستی اور یہ مسلسل مختلف شکلیں اختیار کرنے والی اور مختلف ذریعہ فراہم کرنے والی کائنات وہ بھی پرش ذی روح ہی ہے۔

ایسا نظریہ رکھنے کا مطلب کیا؟ ہر جگہ بے عیب و باخلوص خدمتگزاری کا جذبہ رکھنا چاہیے۔ تمہارے پاؤں کی جوتی "چرچوں" آواز دیتی ہو تو اُسے ذرا سا تیل دیدو۔ اس میں بھی پرماتما کا وجود ہے اس لیے اُسے سنبھال کر اچھی حالت میں رکھنا چاہیے۔ وہ ذریعۂ خدمت چرخہ، اس میں تیل ڈالو۔ دیکھو وہ آواز دے رہا ہے "ننتی نیتی" وہ کہتا ہے "سوت نہیں کاتوں گا" یہ چرخہ! یہ ذریعۂ خدمت یہ بھی پرش ہی ہے۔ اس کی مال۔ اس کی یہ جنیو اُسے اچھی طرح رکھو۔ ساری خلقت کو ذی روح سمجھو۔ جامد وہ نہیں۔ ادم کی عمدہ دُھن سُنانے والا وہ چرخہ کیا جامد ہے۔ وہ تو پرماتما کی مورتی ہی ہے ساون کی اماوس کو انکساری کے ساتھ بیلوں کی پوجا کرتے ہیں[1] یہ بہت بڑی بات ہے اس تیوہار کا روزانہ دھیان کرکے بیلوں کو اچھی حالت میں رکھو کر ان

[1] مہاراشٹر کا خاص تیوہار

سے مناسب کام لینا چاہیئے۔ تیوہار کے دن کی بھگتی اسی دن ختم نہ ہو جانا چاہیئے۔ بیل بھی پرماتما کا ظہور ہے " میں اس بیل اور کھیتی باڑی کے تمام آلات کو اچھی حالت میں رکھوں گا۔" خدمت کے تمام ذرائع پاک ہوتے ہیں کتنا دلچسپ ہے یہ نظریہ۔ پوجا کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گلال، خوشبودار پھول چڑھائے ان برتنوں کو کانچ کی طرح صاف ستھرا رکھنا برتنوں کی پوجا ہے۔ چراغ کو شفاف چراغ کی پوجا ہے۔ ہنسیئے کو تیز کر کے گھاس کاٹنے کے لئے تیار رکھنا اس کی پوجا ہے۔ دروازے کا قبضہ زنگ کھا جائے تو اسے تیل لگا کر مطمئن کر دینا اسکی پوجا ہے زندگی میں ہر موقع پر اسی نظریہ سے کام لینا چاہیئے۔ خدمت کا سامان پاک و صاف رکھنا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ یہیں اکچھر پرش (لافانی ذات)، وہ پرشوتم (اصلی ہستی) اور یہ عالم ذریعہ۔ یہ بھی ذی روح ہی۔ پرماتما ہی۔ سب جگہ ایک ہی ذی شعور پرماتما موجود ہے۔ جب یہ نتیجہ حاصل ہو گیا، تو سمجھو کہ ہمارے کرم میں یگیہ بنا گیا کرم میں بھگتی کی آمیزش کر دا اب گیان کو بھی جوڑ دیا تو اس طرح ایک لاجواب آب حیات بن گیا۔ گیتا نے بالآخر خدائے واحد کی خدمت کے راستہ پر لا کر چھوڑا۔ ساری خلقت میں جدھر دیکھئے تینوں ہی ہستی جلوہ نما ہیں ایک ہی پرشوتم نے یہ تین شکلیں اختیار کر رکھی ہیں۔ یہ تینوں مگر حقیقتاً ایک ہی ہستی ہے وہ واحد مطلق ہے۔ یہاں گیتا نے ہمیں سب سے اونچی چوٹی پر لا بٹھایا ہے۔ کرم بھگتی اور گیان سب یک ذات ہو گئے۔ جیو، شبو، سرشٹی یعنی مخلوق، خالق اور خلقت سب ہم آہنگ و یک رنگ ہو گئے۔ کرم، بھکتی اور گیان میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا۔ گیاندیو نے امرت انوبھو میں اپنی پسندیدہ مثال دی ہے۔

"دیو۔ مندر۔ پریوار بنایا کاٹ۔ پربت ایسا بھگتی کا آچار کیوں نہ ہوئے؟ یعنی ایک ہی پتھر کو تراش کر کے اس کا مندر بنایا اس مندر میں پتھر کی ہی زاتی

ہوئی ایک بھگوان کی مورتی اور اس کے سامنے پتھر کا ہی ایک بھگت اور اس کے پاس پتھر کے ہی بنائے ہوئے پھول جس طرح یہ سب ایک ہی پتھر کی چٹان میں سے کھود کاٹ کر بناتے ہیں یعنی ایک ہی مسلم پتھر مختلف شکلوں میں آراستہ کر دیا جاتا ہے اسی طرح اعمال بھگتی میں کیوں نہ ہونا چاہیئے؟ خادم مخدوم کا تعلق ہوتے ہوئے بھی توحید کیوں ممکن نہیں ہے؟ یہ خارجی کائنات، یہ سامان عبادت جدا رہ کر بھی آتم روپ کیوں نہ ہو جائے؟ تینوں ہستیاں ایک ہی تو ہیں گیان، کرم اور بھگتی۔ ان تینوں کو ملا کر زندگی کا ایک بحر عظیم بنا دیا جائے۔ ایسا مکمل پرشوتم یوگ ہے۔ مخدوم خادم اور سامان خدمت سب ایک شکل ہیں۔ اب صرف بھگتی کے پریم کا کھیل کھیلنا ہے۔

یہ پرشوتم یوگ جس کے قلب نشین ہو جائے وہی سچی بھگتی کرتا ہے۔

ایسا آدمی گیانی ہو کر بھی سولہ آنہ بھگت رہتا ہے۔ جس میں گیان ہے اس میں پریم تو ہے ہی۔ ایشور گیان اور ایشور پریم دونوں الگ الگ نہیں ہیں۔ "کریلا کڑوا" ایسا گیان اگر پیدا ہوا تو پھر پریم پیدا نہیں ہو سکتا ایک آدھ استثنا بھی ہوگا مگر جہاں کڑواہٹ کا احساس ہوا کہ جی اُکتایا لیکن مصری کا احساس ہوتے ہی وہ کھلنے لگتی ہے۔ یکدم سرچشمۂ محبت اُمنڈ آتا ہے۔ پرمیشور کے متعلق گیان ہونا اور پریم کا پیدا ہونا دونوں ایک ہی ہیں۔ عشق خدا کے میٹھا پن کی تشبیہ کیا ناچیز شکر سے دی جائے؟ اس دلکش پرماتما کا گیان ہوتے ہی اسی لمحہ پریم کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے گا۔ یہ بات سمجھئے کہ گیان ہونا اور پریم پیدا ہونا دو جداگانہ فعل نہیں ہیں۔ وحدانیت میں بھگتی کی گنجائش ہے، یا نہیں؟ اس بحث میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ گیانیشور کہتے ہیں۔

"سچی بھگتی سوہی گیان ایک وصل ہی جان"

بھگتی اور گیان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

اب جبکہ ہماری زندگی میں عظیم بھگتی سرایت کر گئی تو پھر جو فعل ہوگا وہ بھگتی اور گیان سے الگ نہیں رہ سکتا۔ کرم بھگتی اور گیان مل کر ایک ہی دلکش صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس خوبصورت شکل سے ایک عجیب مہر آلود وعرفان آمیز خدمت وجود میں آتی ہے۔ ماں سے پریم ہے تو اس کا اظہار عمل سے ہونا چاہیئے۔ پریم ہمیشہ مرتا کھپتا رہتا ہے۔ خدمت گزاری کی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ پریم کی بیرونی شکل خدمت ہے۔ پریم لا انتہا کا رہائے خدمت سے مرتفع ہوکر رہتا ہے۔ جب پریم ہوگا تو گیان خودبخود وہاں آجائے گا۔ جس کی خدمت مجھے کرنی ہے اسے کونسی خدمت پسند ہے اور کونسی نہیں اس کا علم مجھے ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہ خدمت یا تو خدمت ہی نہ ہوگی یا اس کے خلاف ہوگی۔ مخدوم کون ہے اس کا علم پریمی کو ہونا چاہیئے۔ پریم کا اتم ذریعہ عمل پھیلانے کے لئے گیان کی ضرورت ہے۔

لیکن گیان کی جڑ بنیاد میں پریم کا ہونا لازمی ہے اس کے بغیر گیان بیکار ہو جاتا ہے۔ پریم سے کیا ہوا کام معمولی کام سے مختلف ہوتا ہے۔ کھیت سے تھکے ماندے آئے لڑکے پر ماں فطری محبت کی نگاہ ڈالتی ہے اور کہتی ہے "بیٹا تھک گئے ہو"؟ غور تو کیجیے کہ اس ذرا سی بات میں کتنی قوت ہے۔ زندگی کے جملہ اعمال میں گیان اور بھگتی کو سرایت کیجئے۔ بس یہی پرشوتم یوگ کہلاتا ہے۔

(۸۷) ویدوں کا خلاصہ میرے ہی ہاتھوں میں

یہ سب ویدوں کا خلاصہ ہے۔ وید لا انتہا ہیں لیکن ان سب کا مختصر نچوڑ پرشوتم یوگ ہے جو ویدوں میں کہاں؟ ویدوں کی بات عجیب ہے۔ ویدوں کا نچوڑ ہے

کہاں؟ اِس باب کے شروع میں ہی کہا ہے "پتے ہیں جس کے وید، وید تو اِس پیڑ کے پتے پتے میں بھرے پڑے ہیں۔ ویدان کتابوں و تصنیفات میں پوشیدہ نہیں ہیں بلکہ تمام عالم میں پھیلے ہوئے چھائے ہوئے ہیں۔ شکسپیر کا قول ہے "بہتے ہوئے جھرنوں میں سینکڑوں، اعلیٰ تصنیفات ظہور پذیر ہیں۔ پتھروں اور چٹانوں میں سے پند و نصیحت سنائی دیتے ہیں"۔ مطلب یہ کہ وید نہ سنسکرت زبان میں ہیں اور نہ تصنیفات میں ہیں بلکہ وہ کائنات میں ہیں۔ سیوا کرو تو وہ نظر آئیں گے"۔ صبح اُٹھتے ہی اپنی ہتھیلی میں دیکھنا چاہیئے۔ سارے وید اسی ہاتھ میں بھرے ہیں۔ وید کہتا ہے "سیوا کرو"۔ یہ دیکھ لیجیے کہ کل ہاتھ نے کام کیا تھا یا نہیں۔ آج کرنے کے لائق ہے یا نہیں۔ اس میں کام کے نشانات موجود ہیں یا نہیں۔ سیوا کرتے کرتے جب ہاتھ گھس جاتا ہے، تو نوشتۂ تقدیر کھلتا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ یہی مطلب ہے۔

پوچھتے ہیں، وید کہاں ہیں؟ ارے بھائی، تمہارے ہاتھوں ہی میں تو ہیں۔ کہتے ہیں شنکراچاریہ کو آٹھویں برس ہی میں سارے ویدوں کا گیان ہو گیا تھا۔ بیچارے شنکراچاریہ تو تھے کند ذہن کہ انہیں آٹھ سال لگ گئے۔ لیکن ہمیں اور تمہیں تو پیدا ہوتے ہی وید حاصل ہو جاتے ہیں۔ آٹھ سال کی بھی کیا ضرورت ہے۔ میں خود جیتا جاگتا وید ہوں۔ آپ تک کی ساری روایات مجھ میں بھری ہیں اور میں ان کا نتیجہ ہوں۔ اُس وید بیج کا جو پھل ہے وہی تو میں ہوں۔ اپنے پھل جب میں نے لاتعداد ویدوں کا بیج اکٹھا کر رکھا ہے میرے اندر وید کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ویدوں کا نچوڑ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ سیوا، پریم اور گیان کی بنیادوں پر ہی تعمیر زندگی کرنی ہوگی۔ یہ مطلب ہے وید ہاتھوں میں ہے۔ میں جو مطلب

بتلاؤں گا وہی وید ہوگا۔ وید کہیں باہر نہیں ہے سیوا مورتی سنت کہتے ہیں۔ ویدوں کا جو اکھنڈ جانیہ ایک ہیں "یعنے ہم سیوا کرنے والے ہی ویدوں کا مفہوم جانتے ہیں بھگوان کہہ رہے ہیں کہ سارے وید مجھے ہی جانتے ہیں میں ہی سب ویدوں کا نچوڑ پرشوتم ہوں یہ جو ویدوں کا خلاصہ پرشوتم یوگ (طریقت ایزدی) ہے اُسے ہم اپنی زندگی میں پیوست کرلیں، تو کیا لطف ہو۔ پھر ایسا انسان جو کچھ کرے گا، گیتا کہتی ہے کہ اس میں سے گویا ویدی خود اظہار ہو رہا ہے ۔ اس باب میں ساری گیتا کا نچوڑ آگیا ہے۔ گیتا کی تکمیل مکمل طور پر اس میں ظاہر ہوئی ہے۔ لازم ہے کہ اسے اپنی زندگی میں رات دن ہم عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔

اتوار ۲۹-۵-۳۲

سولہواں باب

ضمیمہ ۱- خیر اور شر کے رجحانات کی کشمکش

(۸۸) پریم یوگ کی شغف : دولت ایزدی

گیتا کے پہلے پانچ بابوں میں ہم نے یہ غور کیا کہ زندگی کی تنظیم و ترتیب کس ڈھنگ پر کر اور ہم اپنی زندگی کو کس طرح کامیاب بنا سکتے ہیں۔ اس کے بعد چھٹے باب سے گیارہویں باب تک ہم نے بھکتی کے بارے میں مختلف طور سے بحث کی۔ گیارہویں میں بھکتی کا دیدار ہوا۔ بارہویں میں سگن اور نرگن بھکتی کا موازنہ کر کے بھگت کے اعلیٰ اوصاف کو جانا۔ بارہویں باب کے آخر تک کرم اور بھکتی کی پہچان بنی ہوئی۔ تیسرا جزو گیان تھا اس پر ہم نے تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں باب میں غور کیا۔ آتما کو جسم سے الگ کرنا اور اس لئے تینوں گنوں کو جیت کر آخر میں ہر جگہ ایشور کو دیکھنا پندرہویں باب میں مکمل علم زندگی پر غور کیا۔ پرشوتم یوگ، طریقت ایزدی میں زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔

کرم گیان بھکتی کی تقسیم میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ بعض اہل طریقت کا ذاتی اعتقاد ایسا ہوتا ہے کہ انھیں صرف کرم ہی سوجھتا ہے۔ بعض لوگ بھکتی کے آزاد راستہ کا تصور کرتے ہیں اور اسی پر سارا زور دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا رجحان گیان کی طرف ہوتا ہے۔ زندگی کے معنی اگر محض کرم یا محض بھکتی یا محض گیان لئے جائیں — ایسی "محض پرستی" کو میں نہیں مانتا جاتا۔ برخلاف اس کے کرم، بھکتی اور گیان کے ملاپ سے

بنے مجموعہ کے اصول کو بھی میں نہیں مانتا۔ کچھ گیان کچھ کرم، کچھ بھگتی کے مفاد مرکب
کی منطق کا بھی میں قائل نہیں۔ پہلے کرم، پھر بھگتی، پھر گیان، اس طرح کے نظریہ ترتیب
کو بھی میں نہیں مانتا۔ تینوں چیزوں کا میل ملایا جائے ایسی دلیل موافق بھی منظور نہیں۔
بلکہ میں یہ محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ جو کرم ہے وہی بھگتی ہے اور وہی گیان ہے۔ برفی کے ایک
ٹکڑے کی مٹھاس اس کی شکل اور اس کا وزن جداگانہ چیزیں نہیں ہیں۔ جس لمحہ ہم برفی
کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہیں اسی گھڑی ہم نے اس کی شکل کھالی اس کا وزن ہضم کر لیا اور
اس کی مٹھاس بھی چکھ لی۔ یہ تینوں باتیں اکٹھا ایک ساتھ ہیں۔ برفی کے ہر ذرہ میں شکل
وزن اور مٹھاس ہے یہ نہیں کہ اس کے ایک ٹکڑے میں صرف شکل دوسرے میں صرف
مٹھاس اور تیسرے میں صرف وزن ہو۔ اسی طرح زندگی کے ہر عمل میں وحدانیت
بھری رہنی چاہیئے۔ ہر کام سیوا پریم اور گیان سے پُر ہونا چاہیئے۔ زندگی کے ہر شعبہ
میں کرم بھگتی اور گیان بھرا رہنا چاہیئے۔ اسے پرشوتم یوگ یا کیفیت ایزدی کہتے ہیں۔ ایک
ساری زندگی کو خیر و فلاح کے لئے ہی وقف کر ڈالئے ایسا کہنا بہت آسان ہے
لیکن اس قول میں جو جذبہ ہے اس پر اگر غور کیا جائے تو محض بے لوث خدمت
کے لئے خالص گیان بھگتی کا دلپسند جوش گرمیں ہونا ماننا پڑے گا اس لئے کرم بھگتی اور
گیان لفظ بہ لفظ ایک شکل ہیں۔ اس اعلیٰ کیفیت کو پرشوتم یوگ کہتے ہیں۔ ایسی
حالت میں زندگی درجہ کمال کو پہنچتی ہے۔

اب سولہویں باب میں کہا گیا ہے کہ جس طرح طلوع آفتاب سے پہلے
اس کا اجالا پھیلنے لگتا ہے، اسی طرح زندگی میں کرم، بھگتی اور گیان سے لبریز پرشوتم
یوگ کے نمودار ہونے سے پہلے نیک صفات کا اجالا ظاہر ہونے لگتا ہے۔ مکمل زندگی
کی اس آنے والی رونق کا تذکرہ اس سولہویں باب میں کیا گیا ہے کس ظلمت
کو فنا کر کے یہ روشنی نمودار ہوتی ہے اس کا ذکر بھی اسی میں کیا گیا ہے۔ کسی غائب چیز

کو ثابت کرنے کے لئے ہم کوئی موجود چیز کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ سیوا، بھگتی، اور گیان ہماری زندگی میں پیوست ہیں، یہ کیسے معلوم ہو؟ کھیت میں ہم محنت کرتے ہیں، اس کا ثمرہ بہ شکل اناج ہم وزن کر کے گھر لے آتے ہیں۔ اسی طرح ہم جو عمل کرتے ہیں، اس سے ہمیں کیا کیا تجربات ہوئے، کتنے نیک اوصاف باطن نشیں ہوئے کتنی عمدہ خصلتیں اختیار کی گئیں۔ اور فی الحقیقت زندگی خدمت سے کس قدر معمور ہوئی ان سب باتوں کی جانچ کے لئے یہ باب اشارہ کرتا ہے۔ زندگی کی اس بڑھتی ہوئی روشنی کو گیتا نے دَیوی سمپتی (دولتِ یزدانی) کہا ہے۔ اور اس کے خلاف جو خصائل ہیں انہیں آسُری سمپتی (سرمایۂ شیطانی) کہا ہے۔ سولہویں باب میں ان دونوں یزدانی و شیطانی دولتوں کی کشمکش کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۸۹) اہنسا اور اہنسا کی فوجیں

جس طرح پہلے باب میں ایک طرف کوروؤں کی فوج اور دوسری طرف پانڈوؤں کی فوج آمنے سامنے کھڑی کی ہے، اسی طرح اس باب میں نیک اوصاف کی فوجِ یزدانی اور بدی کی طاقت شیطانی ایک دوسرے کے خلاف کھڑی کی ہے۔ زمانۂ قدیم سے انسانی دماغ میں نیک و بد خیالات کا جو تصادم چل رہا ہے اسے تمثیلی بیان کے ذریعہ پیش کرنے کی ایک رسم پڑ گئی ہے۔ وید میں جیسے اندر اور ورتر، پرانوں میں دیو اور دانو، ویسے ہی رام اور راون، پارسیوں کی مذہبی کتابوں میں اہرمزد اور اہرمن، عیسائی مذہب میں خدا اور شیطان: اور اسلام میں اللہ اور ابلیس اس قسم کے جھگڑے سب ہی مقدس کتابوں میں ملتے ہیں۔ شاعری میں موٹے مضامین کا تذکرہ لطیف اشیاء کی تمثیل سے کیا جاتا ہے۔ مگر مقدس کتابوں میں لطیف جذبات کا تذکرہ دلکش کثیف مثالوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ شاعری میں کثیف کو لطیف کے ذریعہ اور یہاں لطیف کو کثیف کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔

اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ گیتا کی ابتدا میں جو تذکرۂ جنگ ہے، وہ محض قیاسی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایک تاریخی واقعہ ہو۔ لیکن شاعر یہاں اس کا استعمال اپنے دلی مقصد کو پورا کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ ادائے فرض کے بارے میں جب من میں لالچ پیدا ہو جاتی ہے، تب آدمی کو کیا کرنا چاہیئے ؟ یہ بات تمثیل کے ذریعہ سمجھائی گئی ہے۔ اس سولہویں باب میں نیکی اور بدی کا جھگڑا بتایا گیا ہے۔ گیتا میں جنگ کی تمثیل بھی دی گئی ہے۔

کورکشیتر باہر بھی ہے اور ہمارے اندر بھی ہے۔ باریکی سے دیکھا جائے تو جو جھگڑا ہمارے من میں ہوتا ہے یا رہتا ہے، وہی ہمیں باہری دنیا میں موجود نظر آتا ہے۔ باہر جو مجھے اپنا دشمن دکھائی پڑتا ہے، وہ میرے ہی خیالاتِ فاسد کی مجسم شکل اختیار کئے کھڑا ہے۔ آئینہ میں جس طرح میرا ہی بھلا بُرا عکس مجھے دکھائی دیتا ہے، اسی طرح میرے من کے بھلے بُرے خیالات مجھے باہر دوست دشمن کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرح ہم بیداری کے وقت کی باتیں خواب میں دیکھتے ہیں اسی طرح جو ہمارے دل میں ہے، وہی ہم باہر دیکھتے ہیں۔ اندر اور باہر کی جنگ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو اصلی جنگ تو اندر ہی ہوتی ہے ہمارے باطن میں ایک طرف اوصافِ حمیدہ تو دوسری طرف کیفیاتِ فاسدہ کھڑے ہیں۔ انہوں نے اپنا اپنا مورچہ صحیح طور پر قائم کر رکھا ہے۔ فوج میں جس طرح سپہ سالار ضروری ہے، اسی طرح یہاں بھی اوصافِ حمیدہ نے ایک سپہ سالار بنا رکھا ہے۔ اس کا نام ہے "ابھے" یعنی بے باکی یا بے خوفی! اس باب میں "ابھے" کو سب سے آگے رکھا گیا ہے۔ یہ محض اتفاقیہ امر نہیں ہے۔ دیدہ و دانستہ ہی اس "ابھے" لفظ کو اولین جگہ دی گئی ہوگی۔ بلا "ابھے" کے کوئی بھی صفتِ حمیدہ نشوونما نہیں پا سکتی۔ راستی کے بغیر کسی صفتِ حمیدہ کی کوئی

وقعت نہیں ہے۔ لیکن راستی کے لئے بے باکی ضروری ہے۔ خوفزدہ ماحول میں اوصافِ حمیدہ پھیل نہیں سکتے، بلکہ ان میں وہ بھی خصائلِ فاسدہ بن جائیں گے، نیک رجحان بھی کمزور پڑ جائیں گے۔ بے باکی جملہ اوصافِ حمیدہ کی خاص سواد ہے۔ لیکن فوج کو آگے پیچھے دونوں طرف سنبھالنا پڑتا ہے۔ سیدھا حملہ تو سامنے سے ہوتا ہے، لیکن عقب سے چھپ چاپ چور حملہ بھی ہوسکتا ہے۔ اوصافِ حمیدہ کے سامنے "ابھے" خم ٹھونک کر کھڑا ہے تو پیچھے سے نمرتا (انکساری) حفاظت کررہی ہے۔ اس طرح یہ عمدہ محافظت کی گئی ہے۔ یہاں کل ۲۶ اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ اگر ان میں سے ۲۵ اوصاف حاصل ہو گئے، لیکن اگر کہیں اس کا غرور ہو گیا، تو پیچھے سے لیکایک چور حملہ ہو کر ساری کمائی کھو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے عقب میں صفتِ حمیدہ کو رکھا گیا ہے۔ انکساری نہ ہو تو یہ فتح کب شکست میں تبدیل ہو جائے گی، اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ اس طرح سامنے نربھیتا (بےخوفی) اور عقب میں "نمرتا" کو تعینات کر کے کل اوصافِ حمیدہ کو ترقی دی جاسکے گی۔ ان دو بڑی صفات کے درمیان جو ۲۴ اوصاف رکھے گئے ہیں، وہ تقریباً سب اہنسا کے ہی ہم معنی ہیں۔ ایسا کہنا غیر مناسب نہیں ہے۔ شفقتِ عالم، ہمدردی، عفو، امن، غصہ نہ کرنا، اہنسا، اودروہ (عدم بغاوت) یہ سب اہنسا کے ہی دوسرے نام ہیں۔ اہنسا اور ستیہ ان دونوں صفات میں اوصافِ حمیدہ شامل ہیں۔ اگر جملہ اوصافِ حمیدہ کو مختصر کیا جائے، تو بالآخر اہنسا اور ستیہ ہی دو باقی رہ جائیں گے۔ بقیہ دیگر اوصافِ حمیدہ انہیں میں سما جائیں گے۔ لیکن بےباکی اور انکساری کی بات جدا گانہ ہے۔ بےباکی کے ذریعہ ہم آگے بڑھتے ہیں اور انکساری ہماری حفاظت کرتی ہے۔ بےباکی راستی کی اور انکساری اہنسا کی علامت ہے۔ ستیہ اور اہنسا کی پونجی لے کر

بیبا کی سے آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔ زندگی عظیم شے ہے۔ اس میں ہمیں بلا جھجک آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔ کہیں قدم ڈگمگا نہ جائیں۔ اس کے لئے انکساری کے ساتھ رہنے سے پھر کوئی خطرہ نہیں رہ جاتا۔ شوق سے ستیہ اور اہنسا کی آزمائش سب جگہ کرتے چلے جانا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ ستیہ اور اہنسا کی ترقی بیباکی اور انکساری کے ذریعہ ہوتی ہے۔

اس طرح اگرچہ ایک طرف اوصافِ حمیدہ کی فوج کھڑی ہے تو دوسری طرف خصائلِ فاسدہ کی بھی۔ غرور اور جہل وغیرہ خصائل فاسدہ کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے تو ہماری روزمرّہ کی ملاقات ہے۔ غرور کے تو گویا ہم عادی ہو گئے ہیں۔ ہماری تمام زندگی کی عمارت ہی غرور کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ "اگیان" (جہل و لاعلمی) کے بارے میں کہا جائے تو وہ ایسی دل کش دلیل ہے جسے ہم قدم قدم پر پیش کر دیتے ہیں۔ گویا جہالت کوئی بڑا گناہ نہیں ہے۔ لیکن بھگوان کہتے ہیں ـــ اگیان (جہل) پاپ ہے۔ "سقراط نے اس کے برخلاف کہا تھا۔ اپنے مقدمہ کے دوران میں اُس نے کہا۔ "جسے تم پاپ سمجھتے ہو وہ جہل ہے اور جہل قابلِ معافی ہے۔ جہل کے بغیر پاپ ہو کیسے سکتا ہے؟ جہل کو کیسے سزا دو گے؟" لیکن بھگوان کہتے ہیں:" جہل ہی پاپ ہی ہے۔" قانون کہتا ہے کہ "قانون کی ناواقفیت صفائی کی دلیل نہیں ہو سکتی" الغرض قانون کی ناواقفیت بھی گناہِ عظیم ہے۔ بھگوان اور سقراط کے اقوال کا مطلب ایک ہی ہے۔ اپنے جہل کو کس نگاہ سے دیکھنا چاہیئے، یہ بھگوان بتاتے ہیں اور دوسروں کے گناہوں کو کس نگاہ سے دیکھنا چاہیئے، یہ سقراط بتاتا ہے۔ دوسرے کا گناہ معاف کرنا چاہیئے۔ لیکن اپنے جہل کو معاف کرنا گناہ ہے۔ اپنا جہل تو ہمیں ذرا بھی باقی نہ رکھنا چاہیئے۔

(۹۰) اہنسا کے ارتقاء کی چار منزلیں

اس طرح ایک طرف اوصافِ ایزدی اور دوسری طرف کیفیاتِ شیطانی کی دو فوجیں کھڑی ہیں ۔ ان میں سے کیفیاتِ شیطانی کو چھوڑنا اور اوصافِ ایزدی کو اختیار کرلینا چاہیئے ۔ سچائی اور عدم تشدد وغیرہ صفاتِ حمیدہ کی ترقی زمانۂ ازل سے ہوتی چلی آئی ہے ۔ درمیانی جو زمانہ گذر چکا ہے' اس میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے یا۔ تو بھی ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے ۔ ترقی کی حد ختم ہو گئی ہو، ایسی بات نہیں ۔ جب تک نہیں اجتماعی زندگی حاصل ہے اس وقت تک ترقی کے لئے بے حد گنجائش ہے ۔ انفرادی عروج ہو جانے پر بھی سماجی، قومی اور عالمی ترقی باقی ہی رہتی ہے ۔ ہر فرد کو اپنی ترقی کی مدد دے کر سماج اور ملک کے لاکھوں افراد کی ترقی کی ابتدا کرنی چاہیئے ۔ جیسے انسان کے ذریعہ اہنسا کی ترقی زمانۂ ازل سے ہوتی چلی آئی ہے' اسی طرح آج بھی ترقی کا سلسلہ جاری رہے ۔

اہنسا کی ترقی کس طرح ہوتی گئی' یہ قابلِ غور ہے ۔ اس سے سمجھ میں آجائے گا کہ روحانی زندگی کی ترقی درجہ بدرجہ کس طرح ہو رہی ہے۔ اور ابھی کتنی گنجائش ہے ۔ پہلے اہنسا کا عامل یہ خیال کرنے لگا کہ تشدد پسند انسان کے حملے سے کیسے بچیں ؟ شروع میں سماج کی حفاظت کے لئے چھتریوں کی جماعت قائم کی گئی ۔ مگر وہ بعد میں سماج ہی کو کھانے لگے' تب اہنسا کے عامل برہمن اس بات پر غور کرنے لگے کہ ان متوالے چھتریوں سے سماج کی حفاظت کیسے کی جاسکے ؟ پرشرام نے خود اہنسا کا پیرو ہوتے ہوئے بھی ہنسا کا سہارا لیا اور چھتریوں کا قلع قمع کرنے لگے ۔ چھتریوں کو ہنسا سے باز رکھنے کے لئے خود

بھی ہنسا کرنے لگے۔ یہ اہنسا کا ہی تجربہ تھا، لیکن ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اکیس بار انہوں نے چھتریوں کا قتل عام کیا مگر چھتری پھر بھی بچے رہے کیونکہ یہ تجربہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ جن چھتریوں کو وہ مٹانے چلے تھے ان میں ایک اور چھتری کا اضافہ ہوگیا تو وہ چھتری خونریزی کیسے نیست و نابود وہ خود ہی تشدد پسند چھتری بن گیا۔ وہ بیج تو قائم ہی رہا۔ بیج کو قائم رکھو کر جھاڑ جھنکاڑ توڑتا رہے اسے وہ پیڑ بار بار اگتے ہی دکھائی دیں گے۔ پرشرام تھے بھلے آدمی لیکن ان کا یہ تجربہ عجیب و غریب ثابت ہوا۔ تو د چھتری بن کر دنیا سے چھتریوں کو معدوم کرنا چاہتے تھے۔ دراصل ان کو خود اپنے اوپر سے ہی شروعات کرنی چاہئے تھی۔ انہیں لازم تھا کہ پہلے وہ اپنا سر قلم کر دیتے۔ لیکن میں جو یہاں پرشرام کی غلطی دکھا رہا ہوں، وہ اس خیال سے نہیں کہ میں ان سے عقلمند ہوں میں تو بچہ ہوں لیکن ان کے کندھے پر کھڑا ہوں اس لئے مجھے بآسانی کافی دور تک دکھائی دیتا ہے۔ پرشرام کی آزمائش کی بنیاد ہی غلط تھی۔ تشدد پسند ہو کر تشدد کا مٹانا ممکن نہیں ہے برخلاف اس کے تشدد پسندوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں یہ بات دھیان میں نہیں آئی، اس وقت کے نیک آدمیوں اور عظیم عدم تشدد پسند لوگوں نے اپنی سمجھ کے مطابق آزمائش کی۔ پرشرام اس زمانے کے بڑے اہنسا پسند تھے۔ تشدد کے خیال سے انہوں نے مارکاٹ نہیں کی بلکہ اہنسا قائم کرنے کی غرض سے انہوں نے اہنسا کا سہارا پکڑا تھا۔

مگر وہ آزمائش ناکامیاب رہی۔ بعد میں رام کا زمانہ آیا۔ اس وقت پھر برہمنوں نے سوچنا شروع کیا۔ انہوں نے ہنسا چھوڑ دی تھی انہوں نے کہا کہ ہم خود تو ہنسا کریں گے نہیں تو پھر راکشسوں کے حملوں سے بچاؤ کیسے ہو۔ انہوں نے سوچا کہ یہ چھتری ہنسا کرنے والے تو ہیں ہی، ان ہی سے

راکشسوں کا قتل کرانا چاہئے۔ کانٹے سے کانٹا نکال ڈالنا چاہئے۔ ہم خود الگ رہیں۔ اس لئے وشوامتر نے یگیہ کی حفاظت کے لئے رام لکشمن کو لے جا کر اس نے راکشسوں کا قتل کرا دیا۔ آج ہم سوچتے ہیں کہ جو اہنسا خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتی۔ جس کے اپنے پاؤں نہیں ہیں، ایسی لنگڑی، لولی اہنسا کھڑی کیسے رہے گی لیکن بششٹ وشوامتر وغیرہ جیسے لوگوں کو چھتریوں کے بل پر اپنی حفاظت کرانے میں کوئی خامی یا عیب نہیں معلوم ہوا۔ لیکن اگر رام جیسا چھتری نہ ملا ہوتا تو؟ وشوامتر نے کہا ہوتا "میں بھلے ہی مر جاؤں گا مگر ہنسا نہیں کروں گا کیونکہ ہنسا کرنے والوں کی ہنسا کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اب اتنا تو طے ہو ہی چکا تھا کہ خود اہنسا نہیں چھوڑیں گے کوئی چھتری اگر نہ ملا تو اہنسا پر رہ کر مر جانا قبول کریں گے۔ یہ بنیاد اب تیار ہو چکی تھی۔ وشوامتر کے ساتھ جاتے ہوئے رام پوچھتے ہیں "یہ ڈھیر کس چیز کے ہیں؟" وشوامتر نے جواب دیا۔ یہ برہمنوں کی ہڈیوں کے ڈھیر ہیں۔ اہنسا کے حامل برہمنوں نے تشدد پسند راکشسوں کے حملوں کا مقابلہ نہ کیا اور مر مٹے انکی ہڈیوں کے ہی ڈھیر ہیں۔" اس اہنسا میں برہمنوں کا تیاگ تو تھا ہی لیکن پھر بھی اپنی حفاظت دوسروں سے کرانے کی وہ خواہش رکھتے تھے۔ ایسی کمزوری رہتے ہوئے، اہنسا درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اس کے بعد میرا تجربہ سنتوں نے کیا۔ انہوں نے طے کیا کہ "اپنے بچاؤ کے لئے دوسروں کی مدد نہیں لیں گے۔ ہماری اہنسا ہی ہمارا بچاؤ کرے گی۔ ایسا بچاؤ ہی سچا بچاؤ ہوگا" ان کی یہ آزمائش انفرادی تھی۔ اس انفرادی آزمائش کو انہوں نے تکمیل تک پہنچا دیا۔ لیکن پھر بھی رہا تو انفرادی ہی۔ سماج پر اگر تشدد پسندوں کے حملے ہوتے اور وہ سماج سنتوں سے پوچھتا کہ اب کیا کریں؟ تو شاید سنت اس کا کوئی یقینی جواب نہ

دے سکتے۔ انفرادی طور کی زندگی میں پورے طور سے اہنسا لے آنے والے وہ سنت سماج کو یہی جواب دے پاتے کہ: بھائی! ہم لاچار ہیں! سنتوں کی اس طرح کی خامی کا تذکرہ کرنا میرا لڑکپن ہے، لیکن ان کے کندھے پر بیٹھ کر جو کچھ مجھے دکھائی دیتا ہے، وہی میں بتا رہا ہوں۔ وہ مجھے اس کے لئے معاف کریں اور امید ہے کہ وہ معاف کر بھی دیں گے، کیونکہ ان کی بخشش عظیم ہے۔ اجتماعی طور پر اہنسا کی آزمائش کی رغبت انہیں نہ ہوئی ہو، ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس زمانہ کا ماحول شاید انہیں موافق نہ آیا ہو۔ انہوں نے اپنے لئے الگ الگ آزمائشیں کیں لیکن ایسی انفرادی آزمائشوں سے ہی شاستر کی ترتیب ہوتی ہے، مجموعی آزمائشوں سے ہی شاستر بنتے ہیں۔ سنتوں کی انفرادی آزمائشوں کے بعد آج ہم چوتھی آزمائش کر رہے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ سارا سماج اجتماعی طور پر اہنسا پر عامل ہو کر ہنسا کا مقابلہ کرے۔ اس طرح چار آزمائشیں اب تک ہوئی ہیں۔ ہر آزمائش نا مکمل تھی، اور ہے۔ ترقی کے سلسلہ میں یہ امر ناگزیر ہے لیکن یہ ماننا ہی پڑے گا کہ ان زمانوں کے لئے وہ آزمائشیں ہی پوری تھیں۔ اور دس ہزار سال کے بعد آج کی ہماری اس اہنسائی جنگ میں بھی بہت کچھ ہنسا کا جز دکھائی دے گا۔ خالص اہنسا کی دیگر آزمائشیں ہوتی ہی رہیں گی۔ گیان، کرم، اور بھگتی کی نہیں، بلکہ تمام اوصاف حمیدہ کی ترقی ہو رہی ہے۔ مکمل شے تو ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا! بھگوت گیتا کا پرشوتم یوگ مکمل ہے۔ لیکن انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ابھی ان کی پوری ترقی ہونا باقی ہے۔ اقوال کی بھی ترقی ہوتی ہے۔ رشی منتروں کے اہل بصیرت سمجھے جاتے ہیں — موجد نہیں؛ کیوں کہ ایسا نہیں ہے کہ منتروں کا جو مطلب انہوں نے سمجھا وہی ان کا اصل مطلب [illegible] ایک دیدار ہوا۔

اس کے بعد ہمیں ان کا مطلب کچھ اور وسیع تر دکھائی دے سکتا ہے۔ اگر ہمیں ان سے کچھ زیادہ دکھائی دے گیا تو یہ ہماری فوقیت نہیں ہے۔ کیوں کہ انہیں کے سہارے ہم آگے بڑھتے ہیں۔ میں یہاں جو اہنسا کی ہی ترقی کا ذکر کر رہا ہوں کہ اگر ہم تمام اوصاف حمیدہ کا معمولی طور سے جوہر نکالیں، تو وہ اہنسا ہی نکلے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم آج اہنسا کی جنگ میں ہی پڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں نے بتایا کہ اس حقیقت کی ترقی کیسے ہو رہی ہے۔

(۹۱) اہنسا کا ایک عظیم تجربہ: ترک گوشت خوری

اب تک ہم نے اہنسا کا ایک یہ پہلو دیکھا ہے کہ اگر تشدد پسندوں کے حملے چلیں، تو عدم تشدد کے حامی اپنا بچاؤ کیسے کریں؟ اب تک ہم نے غور کیا کہ افراد کے باہمی جھگڑوں میں اہنسا کی ترقی کس طرح ہو رہی ہے مگر جھگڑا تو انسان اور جانور میں بھی ہو رہا ہے۔ انسان ابھی تک اپنے آپس کے جھگڑے مٹا نہیں پایا ہے۔ جانور کو اپنے پیٹ میں ٹھونس کر وہ جی رہا ہے۔ اپنے جھگڑے وہ ابھی تک مٹا نہیں پاتا۔ اپنے سے کمزور درجہ کے جانور کو کھائے بغیر وہ جی نہیں سکتا ہے۔ ہزارہا سال جی کر بھی کس طرح زندگی بسر کی جائے، اس پر ابھی تک حضرت انسان نے غور نہیں کیا ہے۔ انسان انسان کی طرح جی نہیں سکتا۔ لیکن اس کی ترقی ہو رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ انسان صرف جانوروں پر ہی اپنا گذر کرتا تھا۔ لیکن ان میں جو اچھے اور عقل مند انسان تھے، انہیں یہ بات پسندیدہ خاطر نہ ہوئی۔ انہوں نے یہ پابندی لگائی کہ اگر گوشت ہی کھانا ہو تو یگیہ میں قربان کئے گئے جانوروں کا ہی گوشت کھانا چاہیئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہنسا کی روک ہو۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بہت لوگوں نے گوشت کھانا بالکل چھوڑ دیا۔ لیکن جو لوگ پورے طور سے گوشت نہیں چھوڑ سکتے تھے، انہیں یہ اجازت دی گئی کہ وہ اس یگیہ میں پرمیشور کی نذر کر کے کچھ ریاضت کریں اور تب کھائیں۔ اس وقت یہ کہا گیا کہ اگر یہ پابندی لگا دیا کہ یگیہ میں ہی کھا سکتے ہیں، تو ہنسا کی روک ہو جائے گی۔ لیکن بعد میں یگیہ روزمرہ کی چیز بن گیا۔ جس کے جی میں آیا وہی یگیہ کرنے لگا اور گوشت کھانے لگا۔ اس وقت مہاتما بدھ کچھ آگے بڑھے۔ انہوں نے کہا تمہیں گوشت کھانا ہے تو کھاؤ مگر بھیکار بھگوان کا نام لے کر تو مت کھاؤ۔" ان دونوں اقوال کی غرض ایک ہی تھی کہ ہنسا کی روک ہو۔ گاڑی کسی نہ کسی طرح ضبطِ نفس کی راہ پر آ گئی۔ یگیہ وغیرہ کر دیا نہ کرو، دونوں سے ہم نے گوشت خوری ترک کرنا ہی سیکھا۔ اس طرح ہم آہستہ آہستہ گوشت خوری سے پرہیز کرنے لگے۔

تاریخ عالم میں اکیلے ہندوستان ہی میں یہ عظیم تجربہ کیا گیا ہے کہ کروڑوں لوگوں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے۔ اور آج جو ہم گوشت نہیں کھاتے ہیں، اس میں ہماری کوئی بڑائی نہیں ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کی نیک کرداری کے باعث ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ لیکن پہلے زمانہ کے رشی گوشت کھاتے تھے۔ اگر ایسا ہم کہیں پڑھیں یا سنیں تو تعجب معلوم ہوتا ہے "کیا بکتے ہو! رشی اور گوشت کھاتے تھے؟ ہرگز نہیں! مگر گوشت کھا کر بھی انہوں نے ضبط سے کام لے کر اس کو ترک کر دیا۔ اس کا سہرا ان کے سر ہے۔ ان تکلیفوں کا احساس آج ہمیں نہیں ہوتا۔ ان کا تقویٰ ہمیں مفت ہی مل گیا۔ بھوبھوتی کے "اُتر رام چرتر" میں ایک واقعہ کا تذکرہ ہے۔ بالمیک کے آشرم میں بششٹ رشی آئے۔ ان کے خیر مقدم میں گائے کا ایک چھوٹا بچھڑا مارا گیا، تو ایک چھوٹا لڑکا بڑے لڑکے سے پوچھتا ہے "آج ہمارے آشرم میں ایک داڑھی والا شیر آیا ہے۔ اس نے ہمارا بچھڑا کھا ڈالا نا؟" بڑا لڑکا جواب

دیتا ہے۔ خاموش! وہ بشنشٹ رشی ہیں۔ الیسا مت کہو۔" پہلے وہ بزرگ گوشت کھاتے تھے اور آج ہم نہیں کھاتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم آج ان سے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کے تجربہ کا فائدہ ہمیں بلا محنت ہی مل گیا ہے۔ ہمیں ان کے اس تجربہ کو ترقی دینا چاہیئے۔ اور دودھ بالکل ہی چھوڑ دینے کا تجربہ کرنا چاہیئے۔ انسان کے لئے دوسرے جانوروں کا دودھ پینا بھی تو نامناسب ہی ہے۔ اب سے دس ہزار سال بعد کے لوگ ہمارے بارے میں کہیں گے "کیا ہمارے مورثوں کو دودھ نہ پینے کا تہیہ کرنا بُرا تھا۔؟ توبہ توبہ! وہ کیسے دودھ پیتے رہے ہوں گے؟ کیا وہ ایسے جنگلی تھے؟" مطلب یہ ہے کہ ہمیں بے خوف لیکن انکساری کے ساتھ اپنی آزمائش کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے جانا چاہیئے۔ شفقِ راستی وسیع کرتے رہنا چاہیئے۔ ترقی کے لئے ابھی بہت گنجائش ہے۔ کسی بھی صفت حمیدہ کی ابھی پوری ترقی نہیں ہو سکی ہے۔

(۹۲) شرکی ٹھہری ہوئی: اقتدار، تہذیب اور ثروت

ہمیں دولتِ ایزدی کو بڑھانا ہے۔ اور سرمایۂ شیطانی سے دور رہنا ہے۔ سرمایۂ شیطانی کا ذکر بھگوان نے اسی لئے کیا ہے کہ ہم ان سے دور رہ سکیں۔ اس میں تین خاص علامات ہیں۔ شیطانی خصلت کا نچوڑ ــــ اقتدار۔ تمدن اور ثروت میں ہے۔ شیطان منش کہتے ہیں " ہماری ہی تہذیب اعلیٰ ترین ہے"۔ ان کی بڑی آرزو ہے کہ وہی سارے عالم پر لاد دی جائے ــــ وہی تہذیب کیوں لاد دی جائے؟ تو کہتے ہیں کہ وہ سب سے افضل اور ممتاز ہے۔ اور اچھی کیسے ہے؟ کیوں کہ وہ ہماری ہے۔ خواہ شیطان منش افراد ہوں، خواہ ان کی سلطنتیں ہوں، ان کے لئے یہ تین چیزیں لازمی ہیں

برہمن بھی تو ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ "ہماری تہذیب سب سے اعلیٰ ہے۔ سارا گیان ہمارے ویدوں میں بھرا ہوا ہے۔ ویدک تہذیب کی سارے عالم میں فتح ہونی چاہیئے۔" اس طرح مسلح ہو کر ساری دنیا میں اپنی تہذیب کا جھنڈا لہراؤ۔ لیکن اگر پیڈ پر تیر کمان مسلط رہا تو پھر ہاتھ میں رکھے ہوئے بیچارے ویدوں کا خاتمہ ہی سمجھئے۔ مسلمان بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، کہ قرآن شریف میں جو کچھ لکھا ہے، صرف وہی سچ ہے۔ عیسائی بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔ دوسرے مذہب کا آدمی چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو جب تک وہ حضرت عیسیٰ مسیح پر یقین نہیں لاتا تب تک اسے بہشت نصیب نہیں ہو سکتی۔ بھگوان کے مندر کا انہوں نے صرف ایک ہی دروازہ رکھا ہے اور وہ ہے حضرت عیسیٰ مسیح والا الشان۔ اپنے اپنے گھروں میں تو مختلف دروازے اور کھڑکیاں لگاتے ہیں، لیکن بے چارے بھگوان کے مندر کا صرف ایک ہی دروازہ رکھتے ہیں۔ میں ہی اشرف ہوں، میں ہی عزت مآب ہوں، میرے جوڑ کا کہیں کوئی نہیں۔ یہی سب مانتے ہیں۔ میں کون؟ بھردواج کے خاندان کا۔ میری یہ روایت ازلی ہے۔ یہی کیفیت اہل مغرب کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ہماری رگوں میں نارمن کا خون بہتا ہے۔ ہمارے یہاں گرو کی روایات ہیں نا؟ ہمارے گرو تھے شنکر جی۔ پھر برہما جی، یا کوئی اور پھر نارد، ویاس پھر کوئی اور رشی۔ پھر بیچ میں دس پانچ نام آتے ہیں۔ بعد میں اپنے گرو کا نام، اور پھر میں! ایسا سلسلہ بتایا جاتا ہے۔ اس شجرہ سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ہم بڑے، ہماری تہذیب اونچی۔ جناب! اگر آپ کی تہذیب واقعی افضل ہے، تو اسے اپنے کردار میں ظاہر ہونے دیجئے۔ اس کو اپنی زندگی میں پھیلنے دیجئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ جو تہذیب خود ہماری زندگی میں نہیں ہے ہمارے گھر میں نہیں ہے اسے دنیا بھر میں پھیلانے کی تمنا کتنا خیال خام ہے۔ اسی خیال کو آسُری (شیطانی) کہتے

پھر جس طرح میری تہذیب اعلیٰ اور افضل ہے، ویسے ہی یہ خیالات بھی ہیں کہ ساری دولت کائنات کے رکھنے کا میں ہی مستحق ہوں۔ ساری دنیا کی دولت مجھے چاہیئے اور میں اسے حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ یہ دولت حاصل کس لئے کروں؟ سب میں مساوی طور پر بانٹنے کے لئے۔ اس لئے میں خود اپنے گرد دولت کا انبار لگاتا ہوں۔ اکبر نے بھی تو کہا تھا۔ "یہ راج پوت میری سلطنت میں شامل کیوں نہیں ہوتے؟ ایک بڑی سلطنت ہو جائے، تو دنیا میں امن وامان قائم ہو جائے گا۔" وہ درحقیقت ایمان داری سے ایسا یقین کرتا تھا۔ فی زمانہ شیطانی منش لوگوں کا بھی یہی خیال ہے دنیا بھر کی دولت کیوں جمع کی جائے؟ سب میں بانٹنے کے لئے۔ اس کے لئے مجھے اقتدار چاہیئے۔ سارا عالم میرے زیر اقتدار آ جانا چاہیئے۔ تمام کاموں کا نظام میرے حکم کے ماتحت چلنا چاہیئے۔ جو میرے ماتحت ہو گا، میرے نظام کے مطابق چلے گا، وہی سوتنتر (آزاد) نظام ہو گا۔ اس طرح سرمایۂ شیطانی کے سلسلے میں ان تین چیزوں، مورتی پوجا، تمدن، اقتدار اور ثروت پر زور دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب سوسائٹی میں برہمنوں کا بول بالا تھا۔ وہ شریعت تالیف کرتے اور قانون بناتے۔ راجہ ان کے سامنے احترام سے جھکتے۔ وہ زمانہ گیا، تو چھتریوں کا زمانہ آیا۔ گھوڑے چھوڑے جانے لگے۔ چہار سو فتوحات ہونے لگے۔ چھتریوں کی تہذیب بھی آئی اور چلی گئی۔ برہمن کہتا تھا۔ میں گیان دینے والا۔ باقی اس کے لینے والے۔ میرے سوا گرو کون؟ برہمنوں کو اپنی تہذیب کا گھمنڈ تھا۔ چھتریوں کا زور اقتدار پر مبنی تھا۔ آج اسے مارا کل اسے ماروں گا۔ اس بات پر ان کا سارا زور رہتا تھا۔ پھر ویشیوں کا زمانہ آگیا۔ ان کا سارا اصول ہی ایسا ہے کہ پیٹھ پر مارو۔ پیٹ پر مت مارو۔ اس میں ویشیوں کا سارا اصول مضمر ہے۔ پیٹ کی ساری عقل۔ یہ دھن میرا ہے اور وہ بھی میرا ہو جائے گا یہی

دھن اور یہی عقیدہ! انگریز کہتے ہیں۔ سوراج چاہو تو لے لو، مگر ہمارا تیار کردہ مال بیچنے کی سہولتیں دے دو۔ پھر چاہے آپ اپنی تہذیب کا مطالعہ کرتے رہیے بنگوٹی لگائیے اور اپنی تہذیب لئے بیٹھے رہیئے۔ آج کل جو جنگیں ہوتی ہیں وہ بھی تجارت ہی کی خاطر ہوتی ہیں۔ یہ زمانہ بھی چلا جائے گا اور اس کے چلے جانے کی ابتدا بھی ہو چکی ہے۔ اس طرح یہ سب سرمایہ شیطانی قسمیں ہیں۔

(۹۳) نفسانیت اور غصہ سے نجات کی راہِ اعتدال

ہم سرمایہ شیطانی کو دور ہٹاتے ہیں۔ مختصراً سرمایہ شیطانی سے مطلب ہے کام۔ کرودھ۔ لوبھ۔ یہی تینوں سارے عالم کو نچا رہے ہیں۔ اب اس ناچ کو ختم کرو اس سے ہمیں باز آنا ہی چاہیئے۔ غصہ اور حرص خواہشات کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ خواہشات کے موافق حالات پیدا ہونے کے باعث حرص پیدا ہوتا ہے اور ناموافق حالات سے غصہ۔ گیتا میں قدم قدم پر کہا گیا ہے کہ ان تینوں سے بچو۔ سولھویں باب کے آخر میں یہی کہا گیا ہے کہ کام، کرودھ، لوبھ، یہی دوزخ کے تین بڑے پھاٹک ہیں۔ ان کی گذرگاہ سے آمد و رفت بہت ہے۔ بے شمار لوگ آتے جاتے ہیں۔ دوزخ کی سڑک خوب چوڑی ہے۔ اس میں موٹریں چلتی ہیں۔ بہت سے ساتھی بھی راستے میں مل جاتے ہیں۔ لیکن راستی کی سڑک تنگ ہے

تو اب ان کام، کرودھ، لوبھ سے نجات کیسے ملے؟ راہِ تقویٰ اختیار کر کے شاستر کے بتائے ہوئے تقویٰ کا پلہ پکڑ لینا چاہیئے۔ سنتوں کے تجربات ہی شاستر ہیں۔ سنتوں کے جو تجربات اعمال کے ذریعہ حاصل ہوئے انہیں سے شاستر بنتا ہے۔ اس لئے اس اصولِ تقویٰ کو اختیار کرو۔ فضول وہم میں مت پڑو۔ براہ کرم ایسی دلیل اور ایسے شکوک نہ پیدا کیجئے۔ کہ اگر کام، کرودھ غائب ہو گئے، تو پھر دنیا کا کیا حشر ہوگا؟ دنیا کو چلنی ہی چاہیئے۔

کیا کام کرودھ ذرا بھی نہ رہنے چاہئیں ؟ میرے بھائیو! کام کرودھ تو پہلے ہی سے بھرپور ہیں۔ آپ کو جتنے چاہئیں اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ پھر کیوں فضول بحث و مباحثہ میں پڑتے ہیں۔ کام کرودھا لوبھ آپ کی خواہش سے زیادہ ہی اس دنیا میں ہیں۔ آپ اس کی فکر نہ کریں کہ کام دلفس، مرجائے گا تو اولاد کیسے پیدا ہوگی ؟ آپ کتنی ہی اولاد کیوں نہ پیدا کریں، ایک دن ایسا آنے والا ہے جب کہ سطحِ زمین پر سے آدمی کا نام و نشان بالکل مٹ جائے گا۔ سائنس دانوں اور عالموں کا ایسا کہنا ہے کہ زمین دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ زمین نہایت گرم تھی۔ اس وقت اس پر جاندار ہستی بستے تھے۔ جاندار پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ اب ایک زمانہ وہ آنے والا ہے جبکہ زمین بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی اور ساری ذی روح خلقت فنا ہو جائے گی یہ ممکن ہے کہ ایسا ہونے میں لاکھوں سال گذر جائیں۔ آپ اولاد میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ کریں آخر کار یہ قیامت بلا شک آنے ہی والی ہے پرمیشور جو اوتار لیتا ہے تو وہ دھرم کی حفاظت کے لئے نہ کہ تعداد کی محافظت کے لئے۔ جب تک ایک بھی دھرماتما (صاحب ایمان) موجود ہے، جب تک ایک بھی راست باز اور گناہوں سے ڈرنے والا انسان باقی ہے، اس وقت تک کوئی فکر نہیں کیونکہ اس پر خدائی مہر قائم رہے گی جس کا دھرم ضائع ہو چکا ہے ایسے ہزاروں لوگ رہیں تو کیا اور نہ رہیں تو کیا؟ دونوں یکساں ہیں۔

اس بات کا دھیان رکھ کر اس دنیا میں سلیقہ سے رہئے۔ تقویٰ کی زندگی بسر کیجئے، حد سے باہر بے تحاشہ نہ بہا جائیے۔ "لوک سنگرہ" دانسانوں کی یکجہتی) کا مطلب نہیں کہ لوگ جیسا کہیں ویسا کیا جائے۔ آدمیوں کی تعداد

بڑھاتے جانا، دولت کا ڈھیر اکٹھا کرتے جانا یہ اصلاح نہیں ہے جو وج تعداد پر منحصر نہیں ہے۔ سماج اگر یہ اندازہ بڑھنے لگے گا تو لوگ ایک دوسرے کا خون کرنے لگیں گے۔ پہلے چرند و پرند کو کھا کر انسان مست بنے گا پھر اپنے لڑکے بچوں کو کھا کر رہنا پڑے گا۔ کام کرودھ کی اگر کچھ اہمیت ہے تو پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انسان انسان کو پھاڑ کھائے گا۔ لوگ سنگرہ سے مطلب ہے پاکیزہ سیدھی راہ سب کو دکھانا۔ کام کرودھ سے نجات پا کر اگر انسان دنیا سے ناپید ہو جائے تو آپ فکر نہ کریں۔ وہ سیارہ مریخ میں پیدا ہو جائے گا۔ وہ نادیدہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ وہ ہماری فکر کرے گا۔ پہلے ہم نجات تو حاصل کر لیں۔ آگے بہت دور دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ساری خلقت و بنی نوع انسان کی فکر میں مت پڑو۔ تم اپنی اخلاقی طاقت کو بڑھاؤ۔ کام و کرودھ کا دامن جھٹک کر پھینک دو "اپنا گلا تو پہلے چھڑاؤ" تمہاری گردن جو پھنس رہی ہے اسے تو پہلے چھڑا لو۔ اگر اتنا کر لیا تو بہت کام بن گیا۔

بحرِ عالم سے دور کنارے پر کھڑے رہ کر سمندر کی موجوں کو دیکھنے میں لطف ہے جو سمندر میں ڈوب رہا ہو اور جس کی ناک آنکھ میں پانی بھر گیا ہو اسے سمندر میں کیا لطف؟ سنت لوگ ساحل پر کھڑے رہ کر خدا حاصل کرتے ہیں ترک دنیا کے اس درویشانہ رجحان کو معمولی زندگی بنائے بغیر لطف نہیں آ سکتا۔ اس لئے کنول کے پھول کی طرح بے تعلق رہو۔ مہاتما بدھ نے کہا ہے۔ "جب سنت لوگ اونچے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر نیچے دنیا کی طرف دیکھتے ہیں تو انہیں سارا عالم ناچیز معلوم ہوتا ہے" آپ بھی اوپر چڑھ کر دیکھیں تو یہ نیچے پھیلا دہ حقیر

دکھائی دے گا اور سنسار میں من ہی نہ لگے گا۔

خلاصہ یہ کہ بھگوان نے اس باب میں زور دے کر کہا ہے کہ سرمایۂ شیطانی کو ہٹا کر ثروت ایزدی حاصل کرو۔ آیئے ہم ایسی ہی کوشش کریں۔

اتوار ۵-۶-۳۲

سترہواں باب

سادھک کا لائحہ عمل

منضبط اعمال سے ذہن آزاد ہوتا ہے (۹۴)

پیارے بھائیو! ہم دھیرے دھیرے اختتام پر پہنچ رہے ہیں۔ پندرہویں باب میں ہم نے مکمل اصولِ زندگی کے علم کا مطالعہ کیا۔ سولہویں باب میں ایک ضمیمہ دیکھا۔ انسانی قلب اور اس قلب سے معکوس سوسائٹی میں دو رجحان اور دو تمدن کا تصادم چل رہا ہے اس میں سے ہمیں دولت ایزدی کو ترقی دینا چاہیئے۔ یہ تعلیم ہمیں سولہویں ادھیائے میں ملی۔ آج سترھویں ادھیائے میں ہمیں دیگر ضمیمہ دیکھنا ہے۔ ایک طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کاریہ کرم یوگ کہا گیا ہے۔ گیتا اس ادھیائے میں روزمرہ کے لائحہ عمل سے ہمیں آگاہ کر رہی ہے۔ آج کے ادھیائے میں ہمیں روزمرہ کے معمول پر غور کرنا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ آزاد طبع اور خوش و خرم رہیں تو لازم ہے کہ ہم اپنے عملیات کو ترتیب دیں۔ ہمارا روزمرہ کا لائحہ عمل کسی مقررہ اصول پہ چلنا چاہیئے۔ آزادگیِ طبع اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہماری زندگی اس معینہ اصول کے اندر رہے۔ ندی آزادی سے بہتی ہے لیکن اس کا بہاؤ محدود ہے اگر وہ محدود نہ ہو تو اس کی آزادی سے کوئی فائدہ نہیں۔ گیانی عارف کا مثال مجھے سورج گیا ہوں کا مرشد ہے بھگوان نے ابتدا میں کرم یوگ سورج کو سکھایا۔ سورج کے ذریعہ منو تک اور اک انسان کو ملا

سورج آزاد و بے قید ہے۔ مگر وہ پابندِ اصول ہے۔ اسی میں اس کی آزادی کا راز ہے۔ یہ ہمارے تجربہ کی بات ہے، کہ اگر ہمیں ایک خاص راستہ پر ٹہلنے کی عادت ہے، تو راستہ کا خیال کئے بغیر ہی خیالات میں مصروف رہتے ہوئے ہم ٹہل سکتے ہیں۔ اگر ٹہلنے کے لئے ہم روزانہ نئے نئے راستے نکالتے رہیں گے، تو سارا دھیان راستہ کی جستجو ہی میں لگا دینا پڑے گا۔ بغیر من کو آزادی نہ مل سکے گی۔ مطلب یہ کہ ہمیں اپنے اعمال کو پابندِ اصول کر لینا چاہیئے، تاکہ زندگی ایک بوجھ نہ معلوم ہو۔ بلکہ مسرت آگیں معلوم ہو۔

اس لئے بھگوان اس ادھیائے میں لائحہ عمل بتلاتے ہیں۔ ہم پیدا ہوتے ہی تین اداروں کو ساتھ لے کر آتے ہیں۔ انسان ان تینوں اداروں کا کام صحیح طور سے انجام دے کر اپنی دنیا کو خوش حال بنا سکے، اسی لئے گیتا یہ ضابطۂ عمل بتاتی ہے۔ وہ تینوں ادارے کون ہیں؟ پہلا ادارہ ہے ہمارے آس پاس لپٹا ہوا یہ جسم۔ دوسرا ادارہ ہے ہمارے ارد گرد محیط یہ وسیع کائنات، یہ بے پایاں خلقت، جس کے ہم ایک جزو ہیں۔ اور تیسرا ادارہ ہے وہ سماج جس میں ہماری پیدائش ہوئی اور ہماری تولید کا انتظار کرنے والے ہمارے ماں باپ، بھائی بہن، اڑوسی پڑوسی۔ ان تینوں اداروں سے روزمرہ ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ ہمارے استعمال سے ان میں کمزوری آجاتی ہے، گیتا چاہتی ہے کہ ہمارے ذریعہ ان اداروں میں جو کمی واقع ہوتی ہے اسے پورا کرنے کے لئے ہم ہر وقت کوشش کریں اور زندگی کو کامیاب بنائیں۔ ان اداروں کے لئے ہمیں اپنا پیدائشی فرض بلا کسی گھمنڈ کے انجام دینا چاہیئے۔ ان فرائض کو انجام تو دینا ہی ہے مگر ان کی تکمیل کے لئے انتظام کیا ہونا چاہیئے؟ یگیہ، گیان اور تپ۔ ان تینوں کے اشتراک سے ہی وہ انتظام وجود میں آتا ہے۔ اگرچہ ان الفاظ سے ہم واقف ہیں مگر پھر بھی ان کا مطلب ہم

اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ اگر ہم ان کا مطلب سمجھ لیں اور انھیں دینی زندگی میں داخل کریں تو یہ ادارے کامیاب ہو جائیں اور ہم آزادی، خوشی کی زندگی بسر کر سکیں۔

(۹۵) اس کے لیے سہ نکاتی طریق عمل

اس مطالب کو سمجھنے کیلئے پہلے ہمیں یگیہ کا مفہوم سمجھنا چاہیئے مخلوق جماعت سے ہم روزانہ کام لیتے ہیں اگر سو آدمی ایک جگہ رہتے ہیں تو دوسرے دن وہاں کی ساری فضا منت مکدر دکھائی دینے لگتی ہے وہاں کی ہوا ہم خراب کر دیتے ہیں جگہ گندی کر دیتے ہیں اناج کھاتے ہیں اور دنیا کو خسارہ ہو جاتا ہے۔ دنیاوی سلسلہ کے اس خسارہ کو ہمیں پورا کرنا چاہیئے اس لئے یگیہ کا تعین کیا گیا ہے۔ یگیہ کا مقصد کیا ہے؟ دنیا میں جو خسارہ واقع ہو گیا ہو اُسے پورا کرنا ہی یگیہ ہے۔ آج ہزاروں برسوں سے ہم زمین جوتتے چلے آ رہے ہیں اس سے زمین کی طاقت گھٹتی جا رہی ہے۔ یگیہ کہتا ہے "زمین کو اس کی طاقت واپس کر دو زمین جوتو، اسے سورج کی دھوپ کھانے دو، اس میں کھاد ڈالو"۔ خسارہ کو پورا کرنا یہ یگیہ کا منفعت ہوا۔ دوسرا مقصد ہے مستعمل کردہ چیزوں کی صفائی واحتیاط۔ ہم کنوئیں کا پانی استعمال کرتے ہیں جس سے ... پاس گندگی ہو جاتی ہے پانی اکٹھا ہو جاتا ہے۔ کنوئیں کے پاس جو جگہ گندی ہو گئی اسے صاف کرنا چاہیئے وہاں کا گندہ پانی نکال ڈالنا چاہیئے کیچڑ دور کر دینی چاہیئے۔ خسارہ پورا کرنے اور صفائی کرنے کے ساتھ ہی وہاں کچھ تعمیری عمل بھی ظہور میں آنا چاہیئے یہ تیسری بات بھی یگیہ میں شامل ہے۔ ہم کپڑا پہنتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ روزانہ سوت کات کر پھر کچھ تخلیق کریں۔ کپاس اُگانا اناج پیدا کرنا، سوت کاتنا یہ بھی یگیہ کا ہی کام ہے۔ یگیہ میں جو کچھ تعمیر کرنا ہے وہ ذاتی فائدہ کے لئے نہیں بلکہ ہماری وجہ سے جو نقصان ہو گیا ہے اُسے پورا کرنے کا خیال اس میں ہونا چاہیئے گیتا

پر احسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہم تو پہلے سے ہی قرضدار ہیں۔ پیدا ہوتے ہی ہم اپنے سر پر قرض لے کر آتے ہیں۔ اس قرض کو چکانے کے لئے ہمیں جو تعمیری کام کرنے ہیں وہ یگیہ یعنی سیوا ہے۔ کسی دوسرے پر احسان نہیں ہے۔ اس خدمت کے ذریعہ ہمیں اپنا قرض چکانا ہے۔ ہم قدم قدم پر ادارۂ عالم کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ہی کمی کو پورا کرنے کے لئے، اس کی تکمیل کے لئے اور نئی اشیاء پیدا کرنے کے لئے ہمیں یگیہ کی ضرورت ہے۔

دوسرا ادارہ ہے ہمارا انسانی سماج۔ ماں باپ، استاد، دوست؛ یہ سب ہمارے لئے محنت کرتے ہیں۔ سماج کا یہ قرض چکانے کے لئے دان کا تعین کیا گیا ہے۔ دان کا مطلب ہے سماج کا قرض چکانے کی عملی کوشش۔ دان سے مطلب دوسروں پر احسان کرنا نہیں ہے۔ سماج سے میں نے بے انتہا خدمت لی ہے۔ جب میں عالم وجود میں آیا، تو لاغر و بے چارہ تھا۔ اس سماج نے مجھے چھوٹے سے بڑا کیا۔ اس لئے مجھے سماج کی خدمت کرنی چاہیئے۔ کار خیر سے مطلب ہے بلا بدلہ خدمت کرنا۔ لیکن یہاں تو ہم پہلے ہی بھرپور بدلہ لے چکے ہیں۔ سماج کے اس قرض سے سبک دوش ہونے کے لئے جو خدمت کی جائے وہی دان ہے۔ انسانی سماج کی ترقی میں مدد پہنچانا دان ہے۔ دنیا کا خسارا پورا کرنے کے لئے جو محنت و مشقت کی جاتی ہے، وہ یگیہ ہے۔ اور سماج کا قرض چکانے کے لئے تن، من، دھن یا دیگر ذرائع سے جو مدد کی جاتی ہے، وہ دان ہے۔

اس کے علاوہ ایک تیسرا ادارہ اور ہے یا وہ ہے ہمارا جسم۔ جسم بھی دن بدن ضائع ہوتا جاتا ہے۔ ہم اپنے دل، دماغ، اور حواس سے کام لیتے ہیں۔ انہیں بھی کمزور کر دیتے ہیں۔ اس جسمانی ادارہ میں جو عیب یا خامیاں نمودار ہو جائیں ان کو دور کرنے کے لئے تپ بتایا گیا ہے۔

اسی طرح سے خلقت۔ سماج اور جسم ان تینوں اداروں کا کام جس طریقہ سے ٹھیک انجام دیا جا سکے اسی طرح عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔

ہم مختلف قسم کے اچھے اور برے ادارے قائم کرتے ہیں۔ لیکن یہ تینوں ادارے ہمارے قائم کردہ نہیں ہیں۔ یہ تو قدرتاً ہی ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔ یہ مصنوعی نہیں ہیں اس لئے ان تینوں اداروں کی کمی کو یگیہ دان اور تپ کے ذریعہ پورا کرنا ہمارا فطرتی فرض ہے۔ اگر اس طرح ہم عمل پیرا ہوں تو جو کچھ طاقت ہمارے اندر موجود ہے۔ وہ ساری کی ساری اس میں لگ جائیگی۔ دوسرے کاموں کیلئے وہ طاقت باقی نہ رہے گی خلقت سماج۔ اور جسم ان تینوں اداروں کو ٹھیک رکھنے کے لئے ہمیں اپنی پوری طاقت صرف کرنی پڑے گی۔ اگر کبیر کی طرح ہم کبھی کہہ سکیں کہ "پربھو تو نے مجھے جیسی چادر دی تھی، ویسی ہی لوٹا کر جا رہا ہوں۔ تو اسے اچھی طرح سنبھال کر دیکھ لے" تو وہ کتنی بڑی کامیابی کی بات ہے؟ ایسی کامیابی حاصل کرنے کے لئے یگیہ دان اور تپ یہ تینوں لائحہ عمل کام میں لانا چاہیئے۔ یگیہ دان اور تپ کو ہم نے یہاں الگ الگ فرض کر لیا ہے۔ مگر حقیقت ان میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ خلقت، سماج، سمجھدار جسم یہ ادارے ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ یہ سماج خلقت سے باہر نہیں ہے۔ اور نہ یہ جسم ہی خلقت سے باہر ہے۔ یہ تینوں مل کر ایک ہی عظیم ادارہ عالم بنتا ہے۔ اس لئے ہم جو تخلیق محنت و مشقت کریں گے چاہے ان دینگے یا تپ کریں گے۔ ان سب کو وسیع معنوں میں یگیہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ گیتا نے چوتھے باب میں درویہ یگیہ، تپو یگیہ وغیرہ بتائے ہیں۔ گیتا نے یگیہ کے معنے بہت وسیع کر دئے ہیں۔

[illegible] ہم جو کچھ خدمت انجام دیں گے وہ یگیہ [illegible] اس خدمت کو [illegible]

ہونے کی۔ اس میں پھل کی تو تمنا کی ہی نہیں جا سکتی ، کیونکہ پھل تو ہم پہلے ہی لے چکے ہیں ، قرض کا بار تو پہلے سے سر پہ لدا ہوا ہے۔ جو لے چکے ہیں اسے ابھی ہی واپس کرنا ہے۔ یگیہ سے ادارہ عالم میں مساوات قائم ہوتی ہے۔ دان سے سماج میں اور تپ سے جسم میں مساوات و توازن قائم ہوتا ہے۔ اس طرح تینوں اداروں میں توازن قائم رکھنے کا یہ طریقہ ہے۔ اس سے پاکیزگی حاصل ہوگی اور برے خیال مٹ جائیں گے۔

اس طرح جو خدمت کرنی پڑے گی اس کے لئے غذا بھی لینی پڑے گی۔ اس کو گیتا اہار کہتی ہے۔ اس جسمانی مشین کو کوئلہ یعنی غذا کی ضرورت ہے۔ اگرچہ کھانا بذاتِ خود یگیہ نہیں ، لیکن یگیہ کی تکمیل کے لئے ایک وسیلہ ضرور ہے۔ اس لئے ہم کہا کرتے ہیں ، وہ پیٹ بھرنا نہیں اسے یگیہ کا کام جانو۔ باغیچہ سے پھول لاکر دیوتا کے سر پر چڑھانا پوجا ہے۔ لیکن پھول پیدا کرنے کے لئے باغیچہ میں جو محنت کی جاتی ہے وہ بھی پوجا ہی ہے۔ یگیہ کو پورا کرنے کے لئے جو کام کیا جاتا ہے وہ ایک قسم کی پوجا ہی ہے۔ جسم اسی وقت ہمارے کام آسکے گا جب ہم اسے غذا دیں گے۔ یگیہ کو پورا کرنے کے لئے جو بھی کام کئے جاتے ہیں ، وہ بھی یگیہ ہی ہیں۔ گیتا ان کاموں کو اسی کے لئے یعنی یگیہ ہی کے لئے کرم کہتی ہے۔ سیوا کے لئے جسم ہر وقت مستعد رہے ، اس لئے اس جسم کو جو چڑھاوا میں دوں گا ، وہ یگیہ ہی ہے۔ خدمت کرنے کے لئے جو غذا استعمال کی جائے گی وہ متبرک ہے۔ ان سب باتوں کی تہہ میں حسنِ اعتقاد کی ضرورت ہے۔ ساری سیوا کو نذرِ خدا کرنے کا تصور من میں ہونا چاہیئے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ نذرِ خدا کرنے کا خیال بلا جذبۂ خدمت پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس اہم شئے یعنی نذرِ خدا کے تخیل کو فراموش کر دینے سے کام نہیں چل سکتا۔

(۹۶) طریق عمل کو پاک بنانا

لیکن ہم اپنے سارے اعمال نذر خدا کب کر سکیں گے؟ اسی وقت جبکہ وہ ستوگنی ہوں گے۔ جب ہمارے کام ستوگنی ہوں گے اسی وقت ہم انہیں ایشور کی نذر کر سکیں گے۔ یگیہ، دان اور تپ سب ستوگنی ہونے چاہئیں۔ افعال کو کیسے ستوگنی بنایا جائے اس کا راز ہم نے چودھویں باب سے دیکھ لیا ہے اس باب میں گیتا اس کا استعمال بتا رہی ہے۔

ستوگن کی اس تشریح سے گیتا کے دو مقاصد ہیں۔ باہر سے یگیہ دان و تپ کی صورت میں جو خدمت میں کروں اسی کو اندر سے عمل لقب روحانی کہا جا سکے۔ خدمت خلق اور طریق عمل کے الگ الگ عمل نہیں ہونے چاہئیں سیوا اور سادھنا ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں دونوں کے لئے ایک ہی تدبیر ایک ہی عمل! اس طرح جو کام کیا جائے اُسے بھی بالآخر نذر خدا کرنا ہے۔ خدمت عوام دفع اعمال اور نذر خدا کی تکمیل ایک ہی عمل سے ہونا چاہیے۔

یگیہ کو ستوگنی بنانے کیلئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ناکامی کا عدم احساس و ترک خواہشات۔ یہ دو باتیں یگیہ میں ہونی چاہئیں۔ یگیہ میں اگر خواہش ثمر ہوگی وہ رجوگنی کہلائے گا اور اگر ناکامی کا احساس ہوگا تو تموگنی کہلائے گا۔

سوت کاتنا یگیہ ہے لیکن اگر سوت کاتتے وقت ہم نے اپنی آتما اس میں نہیں انڈیلی اور یکسوئی قلب نہ ہوئی تو یہ سوت یگیہ بے جان ہو جائے گا۔ باہر سے ہاتھ کام کر رہے ہیں اس وقت اگر اندر سے قلبی موافقت نہ ہوئی، تو وہ سارا فعل بے قاعدہ ہو جائیگا۔ بے قاعدہ کئے ہوئے افعال بے رونق ہو جاتے ہیں۔ ایسے افعال میں تموگن آ جاتا ہے اُن افعال سے کسی اعلیٰ شئے کا وجود میں لایا جانا ممکن نہیں

اور نہ وہ بار آور ہوں گے۔ یگیہ میں پھل کی خواہش نہ ہو تو بھی اس سے اچھا پھل ملنا چاہیئے اگر کام دل لگا کر نہ کیا گیا، طبیعت سے نہ کیا گیا تو وہ ایک بوجھ ہو جائے گا۔ پھر اس سے عمدہ پھل کہاں؟ اگر باہر کا کام بگڑا تو ماننا پڑیگا کہ اندر سے دلی موافقت نہ تھی اس لئے افعال میں اپنی آتما انڈیل دو قلبی تعاون عمل میں لاؤ۔ ادارہ عالم کے قرض سے سبکدوش ہونے کے لئے ہمیں نیک نتائج پیدا کرنے چاہئیں یا افعال میں نیک نتائج کی کمی نہ آنے پائے اسلئے قلبی تعاون کی ضرورت ہے۔

اس طرح جب ہمارے اندر بے غرضی آجائے گی اور بالسلیقہ افعال نیک انجام سرزد ہونے لگیں گے اسی وقت سے ہماری صفائی قلب ہونے لگے گی تو اب صفائی قلب کی کسوٹی کیا ہے؟ باہری افعال کی جانچ کر کے دیکھو اگر وہ بے عیب و باحسن نہ ہوں تو من کو کبھی گندہ سمجھ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں کیسی فعل میں حسن کب آتا ہے؟ جب صفائی قلب سے پر ندہ وہ وسعی آمیز فعل پر خدا اپنی پسند و رضا کی مہر لگا دیتا ہے خوشی سے جب پرمیشور ہمارے افعال کی پیٹھ پر دست شفقت کی تھپکی دیتا ہے تو وہاں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ حسن کے معنی ہیں سعی بے عیب کو عطا کی ہوئی خدائی برکت۔ کوئی بت ساز جب مورتی بناتے وقت محو ہو جاتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ سندر مورتی میرے ہاتھوں سے نہیں بنی مورتی کی شکل گھڑتے گھڑتے آخری لمحہ میں نہ جانے کہاں سے اس میں خود بخود حسن آجاتا ہے کیا صفائی قلب کے بغیر یہ الوہی کاریگری ظاہر ہو سکتی ہے؟ مورتی میں جو کچھ اندرونی حسن ہے، وہ یہی ہے کہ اپنا سارا باطنی حسن اس میں انڈیل دیا گیا ہے۔ مورتی کے معنی ہیں ہمارے من کا عکس۔ ہمارے تمام کام ہمارے من کی مورتیاں ہیں۔ اگر من سندر ہے تو تعمیر کردہ مورتی بھی سندر ہو گی۔ بیرونی افعال کی پاکیزگی کو من کی پاکیزگی سے اور من کی پاکیزگی کو بیرونی

افعال سے جانچ لینا چاہیئے۔

ایک بات اور کہنا ہے، وہ یہ کہ ان تمام اعمال میں منتر کی بھی ضرورت ہے بلا منتر عمل بے سود ہے۔ سوت کاتتے وقت یہ منتر اپنے دل میں رکھو کہ میں اس سوت سے غریب جنتا کے ساتھ جڑا جا رہا ہوں۔ اگر یہ منتر دل میں نہ ہوا اور گھنٹوں کام کرتے رہے تو بھی وہ سب بے سود ہوگا۔ ایسے کام سے قلبی صفائی نہ ہوسکے گی۔ روئی کی پونی میں سے چھپا ہوا پرماتما سوت کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ایسا منتر اپنے اعمال میں ڈال کر پھر اُن اعمال کی طرف دیکھو تو وہ اعمال نہایت حسین و ستودنی ہو جائیں گے۔ وہ اعمال پوجا ہو جائیں گے۔ یہ شکل یگیہ سیوا بن جائے گی اس چھوٹے سے دھاگہ کے ذریعہ ہم سماج کے ساتھ، عوام کے ساتھ، خدا کے ساتھ بندھ جائیں گے۔ بالکرشن کے چھوٹے سے منہ میں جسودا ماتا کو سارا عالم دکھائی دیا۔ اپنے اس خود سے کبھرے ہوئے سوت میں بھی تم کو وسیع عالم دکھائی دینے لگے گا۔

(۹۷) غذا کی پاکی

ایسی سیوا کے لئے غذا کی صلاحیت بھی ضروری ہے جیسی غذا ویسا ہی من۔ غذا ذی قرینہ اور معتدل ہونی چاہیئے۔ غذا کیا ہو اس کی بہ نسبت یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ کتنی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ غذا کے انتخاب کی اہمیت نہیں ہے لیکن ہم جو غذا لیتے ہیں وہ مناسب مقدار میں ہے یا نہیں یہ اس سے بھی زیادہ اہم بات ہے۔ ہم جو کچھ بھی کھاتے ہیں اس کا اثر ضرور ہوگا۔ ہم کھاتے کیوں ہیں؟ اس لئے کہ اعلیٰ خدمت کر سکیں۔ غذا لینا بھی یگیہ کا ہی ایک جزو ہے سیوا کی شکل میں

جو یگیہ ہوئے اسے کامیاب بنانے کے لئے غذا کی ضرورت ہے۔ غذا کے مسئلہ پر اس نقطہ نظر سے غور کیجئے۔ غذا ٹھیک اور پاک صاف ہونی چاہئے۔ فرد اپنی زندگی کے لئے کس قدر اصلاح غذا میں کر سکتا ہے اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ لیکن ہمارے سماج نے غذا کی اصلاح کے لئے کافی ریاضت کی ہے۔ اصلاح غذا کے لئے ہندوستان میں بہت بھاری کوششیں ہوئی ہیں۔ ان تجربات میں ہزارہا سال گذر گئے۔ کتنی ریاضت ہوئی یہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سطح زمین پر ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں جماعتوں کی جماعتیں گوشت نہیں کھاتیں، جو فرقہ گوشت خور ہے ان کی غذا میں میں بھی گوشت خاص اور روزمرہ کی چیز نہیں ہے اور جو گوشت کھاتے ہیں وہ بھی اس میں کچھ نقص محسوس کرتے ہیں پس دل سے تو وہ بھی گوشت چھوڑ چکے ہیں۔ گوشت خوری ہی کے رجحان کو دور کرنے کیلئے یگیہ جاری ہوا اور اسی کے لئے وہ بند بھی ہو گیا۔ سری کرشن بھگوان نے تو یگیہ کی تعریف ہی بدل دی۔ سری کرشن نے دودھ کا مرتبہ بلند کیا۔ انہوں نے بہت سی عجیب و غریب باتیں کی تھیں۔ لیکن ہندو لوگ کس کرشن کے پیچھے دیوانے ہوئے بیٹھے۔ ہندوؤں کو تو گوپال کرشن ہی کا نام پیارا ہے جس کے چاروں طرف گائیں بیٹھی ہوئی ہیں جس کے ہونٹوں پر بانسری رکھی ہوئی ہے۔ ایسے گایوں کی خدمت کرنے والے گوپال کرشن سے ہی بچے و بوڑھے سب آشنا ہیں۔ اس طرح گائے کے تحفظ کا بہت بڑا کام گوشت خوری بند کرنے میں ہوا۔ گائے کے دودھ کی قدر بڑھی اور گوشت خوری کم ہوئی۔

پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ پورے طور سے غذا کی اصلاح ہو گئی ہو۔ ہمیں اب اس سلسلہ کو آگے بڑھانا ہے۔ بنگالی لوگ مچھلی کھاتے ہیں یہ دیکھ کر

کتنے لوگوں کو تعجب ہوتا ہے لیکن اس کے لئے اکھٹیں ہمارا کہنا ٹھیک نہ ہوگا۔
بنگال میں صرف چاول ہوتا ہے اس سے جسم کی پوری طور سے پرورش نہیں ہو سکتی۔
اس کیلئے تجربات کرنے پڑیں گے پھر لوگوں میں اس بات پر غور و فکر کی مشردعات
ہو گی کہ مچھلی کے بجائے کونسی سبزی کھائیں جس میں مچھلی کے برابر ہی طاقت زیادہ
مل جائے۔ اس کے لئے جب غیر معمولی ایثار سے کام لینے والے انسان پیدا ہوں گے
تب ایسے تجربات ہوں گے ملیسے افرادہی سماج کو آگے لیجا سکتے ہیں۔ آفتاب
صوز ان رہتا ہے تب کہیں زندہ رکھنے کے لائق ۹۸ درجہ کی حرارت ہمارے
جسم میں رہتی ہے جب سماج میں ویراگ کے آفتاب پیدا ہوتے ہیں اور جب
وہ بڑی سرگرمی سے کیفیات زمانہ کی بندشوں کو توڑ کر بلا پرایپنے فلک

مقاصد پر اڑنے لگتے ہیں، تب کسی قدر ایسا ویراگ (جذبہ فقیرانہ)
ہم میں پھیلتا ہے، جو مفید عالم ہو سکے۔ گوشت خوری روکنے
کے لئے رشیوں کو کتنی ریاضت کرنی پڑی ہو گی، کتنی
جانیں قربان کرنی پڑی ہوں گی، اس بات کا تصور ایسے
وقت میرے دماغ میں آتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آج ہماری غذا کی اصلاح مجموعی طور پر اتنی
ہوئی ہے۔ بے انتہا ایثار کے ذریعہ ہمارے بزرگوں نے جو حاصل
کیا ہے، اسے تم گنواؤ نہیں۔ ہندستانی تہذیب کی اس
خصوصیت کو ضائع نہ کرو۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم کو کسی نہ کسی طرح سے
زندگی گذارنی رہی ہے۔ جیسے اس طرح زندہ رہنا
ہے، اس کا کام تو بڑا سیدھا ہے۔ جانور بھی تو کسی نہ کسی طرح

زندگی کاٹ ہی ڈالتے ہیں، تو کیا جیسے جانور ویسے ہی ہم؟ جانور اور انسان میں فرق ہے اس فرق کو وسیع کرتے جانا ہی تہذیب کی ترقی کہلاتی ہے ہمارے ملک نے گوشت چھوڑنے کی بہت بڑی کوشش کی۔ اس کوشش کو اور آگے بڑھا کم سے کم جس منزل تک ہم پہونچ چکے ہیں اس سے پیچھے تو نہ ہٹیں۔

اس امر کے ذکر کا خاص سبب یہ ہے کہ آج کل بہت سے اشخاص گوشت خوری کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ آج مشرقی اور مغربی تہذیب کا ایک دوسرے پر اثر پڑ رہا ہے مجھے یقین ہے کہ آخر میں اس کا نتیجہ اچھا ہی ہوگا مغربی تہذیب کی وجہ سے ہمارے اندھے اعتقادات کی بنیادیں ہلتی جا رہی ہیں اگر اندھے اعتقادات منہدم ہو جائیں تو کوئی ہرج نہیں ہے جو صحیح ہوگا وہ قائم رہیگا مگر جو غلط ہوگا وہ معدوم ہو جائے گا۔ البتہ اندھے اعتقادات کے ضائع ہو جانے پر ان کی جگہ اندھا عدم اعتقاد کبھی نہ پیدا ہو جانا چاہئے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف اعتقاد ہی اندھا ہوتا ہے۔ اعتقاد نے ہی اکیلے اندھی خصوصیت کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ عدم اعتقاد بھی اندھا ہو سکتا ہے۔

گوشت خوری کے متعلق آج پھر سے غور و فکر شروع ہو گئی ہے کچھ بھی ہو مجھے تو جب کوئی نیا تصور سامنے آ جاتا ہے تو بڑا لطف ملتا ہے۔ اس سے کم سے کم ایسا محسوس ضرور ہوتا ہے کہ لوگ بیدار ہو رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔ بیداری کی علامات دیکھ کر مجھے اچھا لگتا ہے لیکن اگر جاگ کر آنکھیں ملتے ہوئے یونہی چل پڑیں گے تو گر پڑنے کا اندیشہ رہے گا۔ اس لئے جب تک پوری طرح بیدار نہ ہو جائیں اور اچھی طرح آنکھ کھول کر دیکھنے نہ لگیں اس وقت تک ہاتھ پیر قابو میں رکھنا بہتر ہے۔ غور و فکر خوب کیجئے۔ موافق۔ مخالف۔

اٹھتے بیٹھتے سب ہی طرف سے غور و فکر کیجئے۔ دھرم پر غور و فکر کی قینچی چلایئے، اس غور و فکر کی قینچی سے جو دھرم کٹ جائے سمجھ لیجئے کہ وہ دو کوڑی کا تھا۔ اس طرح جو کٹ کر کٹ چھوٹ جائیں، انہیں جانے دیجئے۔ آپ کی قینچی سے جو نہ کٹے بلکہ جب الٹی آپ کی قینچی ہی ٹوٹ جائے وہی دھرم سچا ہے۔ دھرم کو غور و فکر سے کوئی اندیشہ نہیں ہے اس لئے غور و فکر تو ضرور کیجئے مگر کام ایکدم نہ کر ڈالئے۔ نیم بیدار ہو کر اگر کچھ کام کیجئے گا تو دھرام سے گر پڑئیے گا۔ اگر خیالات بہت زور پکڑ رہے ہوں تو بھی فی الحال اعمال کو سنبھال کر رکھئے۔ اپنے اعمال پر قابو رکھئے۔ اپنی گذشتہ نیک کرداریوں کو برباد نہ کیجئے

(۹۸) مربوط زندگی کے لئے گیتا کا منصوبہ

پاک غذا سے دماغ پاکیزہ رہے گا۔ جسم کو بھی قوت ملے گی۔ سماج کی خدمت بھی اچھی طرح ہو سکے گی۔ قلبی سکون رہے گا۔ سماج میں بھی سکون پھیلے گا۔ جس سماج میں گیتا کے مطابق یگیہ، تپ اور دان کا معمول سلیقہ سے چلتا رہتا ہے اس میں مخالفت نمودار نہ ہوگی۔ دو آئینے اگر ایک دوسرے کے مقابل رکھے جائیں تو جس طرح اس آئینے کے اندر کا عکس اس آئینے کے اندر اندر اس میں کا اس میں دکھائی دیگا، اس طرح فرد اور سماج میں عکس ہو کر ہیں کے اصول کے بموجب آپس میں اطمینان رہے گا۔ جو میرا اطمینان ہے وہی سماج کا اور جو سماج کا ہے وہی میرا۔ ان دونوں کے اطمینان کی ہم جانچ کر سکیں گے اور ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ دونوں ایک شکل ہیں، ہر طرف وحدانیت کا احساس ہوگا۔ دوئی اور اختلاف ختم ہو جائیں گے ایسا عمدہ نظام جس بندوبست سے قائم کیا جا سکتا ہے اسی کی تفصیل گیتا ظاہر کر رہی ہے اگر ہم روزانہ اپنا لائحہ عمل گیتا کے بنائے

ہوئے بندوبست کے مطابق بنالیں تو کیا ہی لُطف ہو۔

لیکن آج فرد اور سماج کی زندگی میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے، یہ اختلاف کس طرح دُور ہو سکتا ہے، یہی چرچا ہر طرف ہو رہا ہے۔ فرد اور سماج کے حدود کیا ہیں، ان دونوں میں کس کا درجہ اونچا ہے۔ کون افضل تر ہے؟ انفرادیت کے کچھ حامی سماج (سوسائٹی) کو جامد سمجھتے ہیں۔ سپہ سالار کے سامنے اگر کوئی سپاہی آتا ہے تو اس سے بات کرتے وقت وہ شائستہ و مہذبانہ الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ اُسے "آپ" بھی کہے گا۔ لیکن فوج کو جس طرح چاہے گا حکم دے گا۔ گویا فوج بے حس، ہو لکڑی کا لٹھا ہو اسے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہلائے گا۔ فرد ذی ہوش ہے اور سماج غیر ذی ہوش، ایسا احساس یہاں بھی ہو رہا ہے۔ میرے سامنے دو تین سو آدمی ہیں ان کی پسند ہو یا نہ ہو میں تو بولتا ہی جا رہا ہوں۔ مجھے جو خیال آتا ہے وہی کہتا رہتا ہوں گویا آپ جڑ (غیر ذی روح) ہی ہیں۔ لیکن اگر کوئی فرد میرے سامنے آیا تو مجھے اس کی سُننی پڑے گی اور اُسے غور و خوض کر کے جواب دینا پڑے گا۔ لیکن یہاں تو میں نے آپ کو گھنٹہ گھنٹہ بھر یوں ہی بیٹھا رکھا ہے۔

"سماج جڑ ہے اور فرد ذی ہوش" یہ کہہ کر کچھ لوگ ذی ہوش انفرادیت کی علمبرداری کرتے ہیں اور بعض لوگ سماج کو اہمیت دیتے ہیں۔ میرے بال جھڑ گئے، آنکھیں چلی گئیں، ہاتھ ٹوٹ گئے اور دانت گر گئے۔ اتنا ہی نہیں ایک پھیپھڑا بھی بیکار ہو گیا۔ پھر بھی زندہ رہتا ہوں کیونکہ فرداً فرداً ہر عضو جڑ ہے۔ کسی ایک کی تباہی سے سارا تباہ نہیں ہو جاتا۔ مجموعی جسم قائم ہی رہتا ہے۔ اس طرح یہ دو باہم متضاد خیالات جاری ہیں۔ آپ جس نظریہ سے دیکھیں گے ویسا ہی انداز لگائیں گے۔ جس رنگ کا چشمہ اسی رنگ کی خلقت۔

کوئی فرد کو اہمیت دیتا ہے تو کوئی سماج کو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سماج میں زندگی کی کشمکش کا تصوّر پھیل گیا ہے۔ مگر کیا زندگی کشمکش کے لئے ہے؟ اس سے تو پھر ہم مر کیوں نہیں جاتے؟ کشمکش تو مرنے کے لئے ہے۔ اسی کی خاطر ہم اپنی اور عوام کی فلاح میں فرق پیدا کرتے ہیں۔ جس کسی نے بھی پہلے پہل اس تفریق کا تصور کیا اسے عجیب ہی کہنا چاہئے۔ جس شئے کی کوئی حقیقت ہی نہیں اُسے وجود میں لانے کی اہلیت جس کے دماغ میں تھی اسے داد دینے کو جی چاہتا ہے! جو تفریق موجود نہ تھی اسے لاکھڑا کر دیا اور اسے عوام کو سکھایا یہ ایسا ہی حیرت انگیز ہے جیسا کہ دیوار چین۔ یہ ماننا ایسا ہی ہے جیسا کہ افق کو محدود کرنا اور پھر یہ کہنا کہ اس کے دوسری طرف کچھ نہیں ہے۔ ان سب کی وجہ ہے فی زمانہ زندگی میں یگیہ کا عدم وجود۔ اسی سے فرد اور سماج میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔

لیکن فرد اور سماج میں در حقیقت کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کمرے کے دو حصّے کرنے کے لئے اگر بیچ میں کوئی پردہ لٹکا دیا جائے اور پردہ ہوا سے اُڑ کر آگے پیچھے ہونے لگے، تو کبھی ایک حصہ بڑا معلوم ہوگا کبھی دوسرا۔ ہوا کی حرکت پر اس کمرہ کی تقسیم منحصر ہے۔ وہ مستقل نہیں ہے۔ گیتا ان جھگڑوں سے دور ہے۔ یہ جھگڑے محض قیاسی ہیں۔ گیتا تو کہتی ہے کہ صفائی قلب کے اصول پر عمل کرو۔ پھر فرد اور جماعت کے مفاد میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ ایک دوسرے کی بھلائی میں رکاوٹ نہ ہوگی۔ اس رکاوٹ کو اس اختلاف کو دور کرنا ہی گیتا کی خصوصیت ہے۔ گیتا کے اس اصول پر عمل کرنے والا اگر ایک بھی آدمی ہو تو اکیلے اسی کی ذات سے ساری قوم فارغ البال ہو جائے گی۔ قوم کیا ہے؟ اسی کے افراد۔ جس قوم میں ایسے عالم باعمل

انسان نہ ہوں اسے قوم کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کیا ہے؟ ہندوستان راوندر ناتھ ہے۔ ہندوستان گاندھی ہے یا اسی طرح کے پانچ دس نام۔ غیر ممالک کے لوگ ہندوستان کا تصور انہی دس پانچ اشخاص سے کرتے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے دو چار، وسطی زمانہ کے چار پانچ اور زمانۂ حال کے آٹھ دس آدمی لے لیجئے۔ اور ان میں ہمالیہ گنگا وغیرہ کو شامل کر دیجئے۔ بس ہو گیا ہندوستان ۔ یہی ہے ہندوستان کی تعریف ۔ باقی سب ہے اس کی تشریح۔ تشریح یعنی اختصار کی تفصیل۔ دُودھ کا دہی اور دہی کا چھاچھ مکھن۔ جھگڑا دُودھ دہی چھاچھ مکھن کا نہیں ہے۔ دُودھ کی اصلیت جاننے کے لئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں مکھن کتنا ہے۔ اسی طرح سماج کی قوت اس کے افراد سے ظاہر ہوتی ہے۔ فرد اور سماج میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اختلاف ہو ہی کیسے سکتا ہے؟ فرد فرد میں بھی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ایک آدمی دوسرے سے زیادہ امیر ہو جائے تو اس سے کیا نقصان ہوا۔ البتہ کسی کو بھی مفلس اور نادار نہ ہونا چاہئے اور امیر لوگوں کی دولت سماج کے کام آتی ہے۔ بس میری داہنی جیب میں پیسے ہیں تو کیا اور بائیں جیب میں ہیں تو کیا؟ دونوں جیبیں ہیں تو آخر میری ہی۔ اگر کوئی شخص امیر ہو گیا تو اس میں، میں امیر ہوتا ہوں ۔ ملک امیر ہوتا ہے۔ ایسی دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔

لیکن ہم تفریق پیدا کرتے ہیں۔ اگر دھڑ اور سر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو دونوں کی ہی موت ہے، اس لئے فرد اور جماعت میں تفریق نہ کرو۔ اور گیتا بھی سکھاتی ہے کہ ایک ہی عمل اپنی اور عوام کی بھلائی کو کس طرح یکساں بنا دیتا ہے۔ اس کمرے کی اور باہر کی لامحدود ہوا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر میں ان میں اختلاف کا تصور کر کے کمرہ بند کر لوں گا تو دم گھٹنے سے مر جاؤں گا۔ عادم

اختلاف کا تصور کر کے مجھے کمرہ کھولنے دو تو باہر کی لامحدود ہوا اندر آجائے گی۔ جس لمحہ اپنی زمین اور اپنا گھر کا ٹکڑا اوروں سے الگ کرتا ہوں تو اسی لمحہ میں لامحدود دولت سے محروم ہو جاتا ہوں، اگر وہ میرا چھوٹا سا گھر جل گیا۔ گھر گیا تو میں یہ سمجھ کر کہ میرا سب کچھ چلا گیا رونے پیٹنے لگتا ہوں، لیکن ایسا کیوں کیا جائے؟ یہ رونا پیٹنا کس لئے۔ پہلے تو تنگ خیالی کریں اور پھر گریہ وزاری کریں۔ یہ پانچ سو روپے میرے ہیں! ایسا کہا کہ سنسار کی لامحدود دولت سے میں محروم ہو گیا۔ یہ دو بھائی میرے ہیں، ایسا تصور مجھے دُنیا کے بے شمار بھائیوں سے الگ کر دیتا ہے۔ اس کا ہمیں خیال نہیں رہتا۔

افسوس انسان نے اپنے کو کتنا تنگ دل بنا لیا ہے۔ درحقیقت انفرادی مفاد دُوسروں کی بھلائی میں ہی ہونا چاہئے۔ گیتا ایسا ہی عمدہ سیدھا راستہ ہمیں دکھا رہی ہے تاکہ فرد اور جماعت میں پورا پورا تعاون ہو زبان کی معدہ سے کیا مخالفت ہو سکتی ہے۔ معدہ کو جتنی غذا درکار ہو اتنی ہی زبان کو اسے دینا چاہئے۔ معدہ کو آسودگی ہوئی کہ زبان کو کھانا بند کر دینا چاہئے۔ پیٹ ایک ادارہ ہے، تو زبان دوسرا۔ میں ان اداروں کا بادشاہ ہوں اور ان دونوں اداروں میں وحدانیت ہی ہے، کہاں سے لے آئے یہ کمبخت تفریق؟ جس طرح ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء میں حقیقتاً اختلاف نہیں ہے بلکہ موافقت ہے، اسی طرح سماج میں بھی ہے۔ سماج میں اس موافقت کی ترقی کے لئے ہی گیتا صفائی قلب کے ساتھ یگیہ، دان اور تپ کے عملی طریقے کو بتاتی ہے۔ ایسے اعمال سے فرد اور سماج دونوں کا بھلا ہوگا۔

جس کی زندگی یگیہ سے معمور ہے وہ سب کا ہو جاتا ہے۔ ہر بچّے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ماں اسی سے محبت کرتی ہے۔ اسی طرح یہ شخص سب کو

اپنا معلوم ہوتا ہے۔ ساری دُنیا کو وہ پیارا اور مقبول ہوجاتا ہے۔ سبھی کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری جان ہے، رفیق ہے، دوست ہے۔ سمرتھ گرو رام داس نے کہا ہے۔ "ایسا انسان تو خوش قسمت ہے، لوگ اسے بے انتہا چاہتے ہیں۔۔۔"

ایسی زندگی بنانے کا طریقہ گیتا نے بتلایا ہے

(۹۹) نذر کرنے کا منتر

گیتا اتنا اور کہتی ہے کہ زندگی کو یگیہ سے معمور کر کے اسے نذرِ خدا کرنا چاہیئے۔ زندگی معمورِ خدمت ہوجانے پر پھر نذرِ خدا کس لئے؟ ہم یہ بات آسانی سے کہہ تو گئے کہ ساری زندگی معمورِ خدمت ہونا چاہیئے۔ لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ کئی جنموں کے بعد وہ کسی قدر عمل میں آسکتا ہے۔ پھر بھی اگر سارے اعمال حرف بحرف معمورِ خدمت ہوجائیں تو بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ لائق تکریم ہو ہی گئے۔ اس لئے "اوم تت ست" کے منتر کے ساتھ جملہ اعمال نذرِ خدا کرنے چاہیئیں۔

کارِ خدمت یوں تو کلیتاً خدمت سے پُر ہونا مشکل ہے کیونکہ دوسروں کی فلاح میں اپنی فلاح بھی شامل ہے۔ صرف دوسروں کی ہی بھلائی ہو، ایسا ممکن نہیں۔ ایسا کوئی فعل نہیں جس میں اپنا ذاتی مفاد قطعاً نہ ہو۔ اس لئے ایسی خواہش رکھنی چاہیئے کہ دن بدن ہم سے بے غرض و بے لوث خدمت زیادہ سے زیادہ عمل میں آتی رہے۔ اگر یہ خواہش ہو کہ خدمت بتدریج پاک تر ہوتی جائے، تو سارے افعال نذرِ خدا کردو۔ گیان دیو کا قول ہے "وِشنو نام مدھر لگتا ہے، یوگی جیون کلا سادھتے ہیں۔" اسمِ لافانی کی مٹھاس اور فنِ زیست ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں۔ نام کے نعرۂ باطنی اور زندگی کے فنِ بیرونی دونوں میں اتفاق ہے۔ یوگی اور بندۂ خدا ایک ہی ہیں۔ اعمال کو نذرِ خدا کرنے پر اپنا مفاد، دوسروں کا مفاد اور مفادِ کامل سب

یک شکل ہوجاتے ہیں۔ ابتدا میں تو "جو تم" اور "میں" الگ الگ ہیں۔ انہیں ایک کرنا چاہیئے۔ "تم اور میں" مل کر ہم ہوگئے۔ اب 'ہم' اور 'وہ' کو ملا دینا ہے پہلے مجھے اس کائنات عالم سے یگانگت پیدا کرنا ہے۔ پھر پرماتما سے "اوم تت ست" منتر میں اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔

خدا کے بے شمار نام ہیں۔ ویاس جی نے تو ان ناموں کا "وشنو سہسر نام" بنا دیا ہے۔ جو جو نام ہم تصور کرلیں وہ سب اسی کے ہیں۔ جو نام اس کے لئے ہمارے تصور میں آئیں انہی معنوں میں ہم اسے کائنات عالم میں دیکھیں اور اسی کے مطابق اپنی زندگی بنائیں۔ خدا کا جو نام ہمیں پسند آئے اسی کو مخلوق میں دیکھیں اور اسی کے مطابق اپنے آپ کو بنائیں اس کو میں "تری پدا گائتری" کہتا ہوں۔ مثال کے طور پر ایشور کا دیامے (رحیم) نام لے لیجئے۔ ایسا تصور کریں کہ وہ رحیم ہے۔ اب اس بحر رحمت میں خدا کو اس عالم میں بغور دیکھیں۔ خدا نے ہر ایک بچہ کو اس کی خدمت کے لئے ماں دی ہے۔ زندگی کے لئے ہوا دی ہے۔ اس طرح اس خدائے رحیم کی خلقت میں جو نظام رحمت ہے اُسے دیکھیں اور اپنی زندگی بھی رحم آمیز بنا دیں۔ بھگوت گیتا کے زمانہ میں ایشور کا جو نام مشہور تھا وہی بھگوت گیتا نے بتایا ہے، وہ ہے "اوم تت ست" 'اوم' کا مطلب ہے 'ہاں' پرتما ہے۔

اس بیسویں صدی میں بھی پرماتما ہے۔ وہی آج ہے، وہی کل تھا وہی کل ہوگا۔ وہ قائم ہے، دُنیا قائم ہے اور میں بھی کمر کس کر ریاض کے لئے تیار ہوں۔ میں عامل ہوں وہ ایشور ہے اور یہ دُنیا سامان عبادت ہے۔ جب ایسے تصورات سے ہمارا قلب معمور ہوجائے تب ہی کہا جا سکے گا کہ "اوم" ہم میں سرایت کر گیا ہے۔ وہ ہے، میں ہوں اور میرا عمل بھی ہے۔ ایسا یہ "اوم" کا تصور

قلب نشیں ہو جانا چاہیئے ۔ اور عمل کے ذریعہ ظاہر ہونا چاہیئے۔ سورج کو جب کبھی دیکھیئے گا کرنوں کے ہمراہ دکھائی دے گا اُن کے بغیر وہ کبھی رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ کرنوں کو نہیں بھُلاتا ۔ اسی طرح کوئی بھی کسی وقت کیوں نہ دیکھے ہمیں سعی عمل سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ جب ایسی حالت ہو جائے گی تب ہی کہہ سکیں گے کہ " اوم " کو ہم نے اپنے باطن میں پیوست کر لیا ۔

اس کے بعد ہے " سَت " پرمیشور سَت ہے یعنی پاک ہے مبارک ہے اس جذبہ سے معمور ہو کر ایشور کی خوبی کو کائنات میں محسوس کرو۔ ذرا اس سطح آب کو دیکھو۔ پانی میں سے ایک گھڑا بھر لو، اس سے گڑھا بنا کر وہ فوراً ہی بھر جائے گا۔ کتنا مسرت بخش اور رحم آمیز ہے یہ ۔ ندی گڈھوں کو برداشت نہیں کر سکتی ۔ گڈھوں کو بھرنے کے لئے دوڑتی ہے ۔ بحرِ کائنات تیز رفتاری کے باعث پاک ہوتا جا رہا ہے ۔ ساری دُنیا پاک اور مبارک ہے۔ اپنے اعمال کو بھی ایسا ہی ہوتے دو۔ پرمیشور کا یہ "سَت" نام اپنے اندر جذب کر لینے کے لئے سارے اعمال بے عیب اور بھگتی آمیز ہوتے چاہئیں ۔ سوم رس جس طرح پاک صاف چیزوں سے چھانا جاتا تھا، اسی طرح اپنے سارے اعمال اور ان کے طریقوں کو ہمیشہ چھان بین کر کے بے عیب بنانا چاہیئے ۔

اب رہا " تَت " تت کے معنی ہیں " وہ " کچھ نہ کچھ مختلف ۔ اس دنیا سے غیر ملوث اور اُس دُنیا سے الگ ہے یعنی بے تعلق ہے ۔ سورج نکلتے ہی کنول کھلنے لگتے ہیں ۔ پرندے اڑنے لگتے ہیں اور اندھیرا غائب ہو جاتا ہے۔ مگر سُورج تو دُور ہی رہتا ہے ۔ ان سب نتائج سے گویا وہ بالکل الگ ہی رہتا ہے ۔ جب ہم اپنے اعمال سے بے لوث رہیں گے، تو بے تعلقی آ جائے گی۔ اس وقت یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہماری زندگی میں " تَت " داخل ہو گیا ہے ۔

اس طرح گیتا نے یہ "اوم تت ست" جیسا نام لے کر اپنے تمام اعمال کو نذرِ خدا کرنا سکھایا ہے۔ پچھلے نویں باب میں سب اعمال کو نذرِ خدا کرنے کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ اسی بات کو سترہویں باب میں واضح کیا گیا ہے۔ نذرِ خدا کرنے کا فعل ستوگنی ہونا چاہیئے، تبھی وہ نذرِ خدا کیا جا سکے گا۔ یہ بات یہاں خاص طور سے بتائی گئی ہے۔

(۱۰۰) خدا کا نام گناہ کو دھو دیتا ہے

یہ سب درست ہے مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ "اوم تت ست" نام پاک طینت کو ہی ہضم ہو سکتا ہے تو گنہگار انسان کیا کرے؟ گنہگار کے منہ کو بھی زیب دینے لائق کوئی نام ہے یا نہیں؟ "اوم تت ست" نام میں وہ بھی طاقت ہے۔ خدا کے ہر نام میں ناحق سے حق کی طرف لے جانے کی طاقت رہتی ہے۔ وہ عصیاں کی طرف سے معصومیت کی طرف لے جا سکتا ہے۔ زندگی کا سدھار دھیرے دھیرے کرنا چاہیئے۔ خدا ضرور مدد کرے گا۔ تمہاری کمزوری کے وقت وہ تمہیں سہارا دے گا۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ "ایک طرف نیک نہاد مگر تکبر کی زندگی اور دوسری طرف گنہگار مگر انکساری کی زندگی، ان دو میں سے کسی ایک کو پسند کرو۔" تو اگر میں زبان سے نہ بھی بول سکوں، پھر بھی دل سے کہوں گا "جس پاپ سے مجھے پرمیشور کی یاد رہتی ہے، وہی مجھے ملنے دو۔" میرا من یہی کہے گا کہ اگر نیک سیرت زندگی سے خدا کی یاد بھول جاتی ہے، تو جس گناہ آمیز زندگی سے اس کی یاد آتی ہے میں اسی کو قبول کروں گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں گناہگار زندگی کی حمایت کر رہا ہوں، لیکن پاپ اتنا پاپ نہیں ہے جتنا کہ نیک

کرداری کا گھمنڈ گناہ ہے ۔ تکا رام کا قول ہے " کہیں یہ سجان پن روک نہ دے نارائن "! ایسی عظمت کی ضرورت نہیں ہے اس کی بجائے تو پاپی دکھی ہونا ہی بہتر ہے ۔" جو بچے گیانی ہیں انہیں ماں بھی دور رکھتی ہے لیکن نادان بچوں کو ماں اپنی گود میں اٹھائے گی ـــــ میں خود کفیل "نیک کردار" ہونا پسند نہیں کرتا مگر خدا کے سہارے رہ کر پاپی ہونا مجھے قبول ہے ۔ ایشور کی پاکیزگی میرے پاپوں کو ہضم کر کے بھی باقی رہ سکتی ہے ۔ گناہوں کو دور کرنے کی کوشش کریں اگر وہ دور نہ ہوئے تو دل میں گریہ و اضطراب پیدا ہو جائے گا تب خدا کی یاد آجائے گی وہ تو کھڑا کھڑا کھیل دیکھ رہا ہے ۔ اسے پکارو کہ میں پاپی ہوں اس لئے تیرے در پر آیا ہوں ۔ نیک کردار یاد خدا کا مستحق ہے ۔ کیونکہ وہ نیک کردار ہے مگر گنہگار بھی یاد خدا کا مستحق ہے کیونکہ وہ گنہگار ہے ۔

اتوار ۱۲-۶-۳۲

اٹھارہواں باب

اختتامیہ — ترکِ ثمر کی تکمیل — ایشوری تبرک

(۱۰۱) ارجُن کا آخری سوال

میرے بھائیو! خدا کی مہربانی سے ہم آج اٹھارہویں باب تک آ پہنچے ہیں۔ ہر لمحہ تغیر پذیر ہے۔ اس عالم میں کسی بھی عزم کا پورا ہو جانا، ایشور کی مرضی پر ہی موقوف ہے۔ پھر جیل میں تو قدم قدم پر بے ثباتی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں کسی کام کے شروع کرنے کے بعد یہیں اس کے پورا ہو جانے کی امید رکھنا مشکل ہے۔ شروع کرتے وقت یہ اُمید ذرا بھی نہیں تھی کہ ہماری یہ گیتا یہاں پوری ہو سکے گی۔ لیکن خدا کی مرضی سے ہم اس کی تکمیل تک آ پہنچے ہیں۔

چودہویں باب میں زندگی کے یعنی کرم کے تین اقسام یعنی ستوگنی رجوگنی اور تموگنی بتائے گئے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ان تینوں میں سے رجوگنی و تموگنی کو ترک کر کے ستوگنی کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد سترہویں باب میں یہی بات دوسرے طریقے سے کہی گئی ہے۔ یگیہ دان اور تپ یا ایک ہی لفظ میں کہیں تو "یگیہ" ہی عین زندگی ہے۔ سترہویں باب میں ہم نے یہ بھی سُنا کہ یگیہ میں کھلانے وغیرہ کے جو افعال برتنے جاتے ہیں انہیں ستوگنی اور بہ شکل یگیہ بنا کر ہی کرنا چاہیئے۔ صرف وہی افعال اختیار کریں، جو بہ شکل یگیہ اور ستوگنی ہیں باقی افعال کا ترک کر دینا ہی مناسب ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ "اوم تت ست" منتر کو

کیوں ہر وقت یاد رکھنا چاہئے۔ "ادم" کا مطلب ہے "مداومت"۔ "تت" کا مطلب ہے بے تعلقی اور "ست" کا مطلب ہے، پاکیزگی۔ ہمارے اعمال میں مداومت، بے تعلقی اور پاکیزگی ہونی چاہئے تب ہی وہ نذرِ خدا ہو سکیں گے۔ ان سب باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اعمال لازمی ہیں اور کچھ کو ترک کرنا ہے۔

گیتا کی مجموعی تعلیم پر غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ترکِ عمل ٹھیک نہیں ہے۔ گیتا ترک ثمرہ کی تعلیم دیتی ہے۔ گیتا میں ہر جگہ یہی تعلیم دی گئی ہے کہ مسلسل کام میں لگے رہو۔ لیکن پھل کو ترک کر دو۔ لیکن یہ ایک پہلو ہوا۔ دوسرا پہلو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کچھ کام کئے جائیں اور کچھ کو ترک کر دیا جائے۔ اس لئے اٹھارہویں باب کی ابتداء میں ارجن نے پوچھا۔ ایک پہلو تو یہ کہ کوئی بھی کام کرو تو پھل کی تمنا نہ رکھو اور دوسرا یہ کہ کچھ کام تو ضرور ہی متروک ہیں اور کچھ کرنے لائق ہیں ان دونوں میں موافقت کیسے لائی جائے؟ راہ زندگی کو صاف طور پر جاننے کے لئے یہ سوال پوچھا گیا۔ ترکِ ثمر کا راز جاننے کے لئے یہ سوال پیش کیا گیا ہے۔ جسے علمی لحاظ سے ہم سنیاس کہتے ہیں، اس میں عمل کو ظاہرا ترک کرنا ہوتا ہے۔ یعنی عمل کی ظاہری شکل کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ ترکِ ثمر میں حصولِ عمل کو ترک کرنا ہوتا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا گیتا کے ترکِ ثمر کو نمایاں طور پر ترکِ عمل کی ضرورت ہے؟ کیا ترکِ ثمر کے نقطۂ نظر سے سنیاس کی کوئی ضرورت ہے؟ سنیاس کی حد کہاں تک ہے؟ ارجن کا یہی سوال ہے کہ سنیاس اور ترکِ ثمر کی حد کتنی اور کہاں تک ہے؟

(۱۰۲) ترکِ ثمر: عالمگیر کسوٹی

جواب میں بھگوان نے ایک بات صاف کہہ دی ہے کہ ترکِ ثمر کا معیار

ہمہ گیر ہے۔ ترک ثمر کا اصول ہر جگہ صادق ہے۔ سارے اعمال کے اثمار کا ترک اور رجو گنی اور تمو گنی اعمال کا ترک ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کچھ اعمال کی ہیئت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ترک ثمر کی دلیل پیش کرتے ہی وہ اعمال خود بخود ضائع ہو جاتے ہیں۔ ترک ثمر کے نظریہ سے کئے ہوئے اعمال کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ کچھ کام تو چھوڑنے ہی پڑیں گے۔ ترک ثمر کے اصول جو اعمال ہوں گے ان میں صریحاً کچھ اعمال کا ترک شامل ہی ہے۔

اس پر ذرا گہرائی سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جو اعمال نفسانی ہیں اور جن کی تہ میں نفسانیت ہے اگر ان کو ترک ثمر کے نظریۂ سے کرنے کو کہا جائے تو ایسا کہتے ہی ان کی بنیاد مسمار ہو جاتی ہے۔ ترک ثمر کے جذبہ کے سامنے نفسانی اور ممنوع اعمال قائم ہی نہیں رہ سکتے۔ ترک ثمر کے اصول کے ماتحت عمل کرنا کوئی محض بناوٹی جادو یا مشین کا کام تو ہے نہیں۔ اس معیار سے خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سے اعمال کرنے کے لائق ہیں اور کون سے نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گیتا صرف یہی بتاتی ہے کہ ترک ثمر کے اصول پر کام کرو، مگر یہ نہیں بتاتی کہ کون سے کام کرو۔ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے مگر فی الواقع ایسا ہے نہیں۔ کیونکہ اتنا کہنے سے ہی کہ ترک ثمر کے اصول پر کام کرو، یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا کام کریں اور کون سا نہیں۔ تشدد آمیز اور نامناسب اعمال مثلاً چوری وغیرہ ترک ثمر کے جذبہ سے کئے ہی نہیں جا سکتے۔ ترک ثمر کی کسوٹی پر آزماتے ہی یہ اعمال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ سورج کی روشنی پھیلتے ہی سب چیزیں صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہیں، لیکن کیا اندھیرا بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ وہ تو نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت نفسانی اور ممنوع اعمال

کی ہے۔ ہمیں سب اعمال ترک ثمرہ کی کسوٹی پر کس لینا چاہیئے۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو فعل میں کرنا چاہتا ہوں اسے بے لوثی سے ترک ثمرہ کے اصول پر انجام دے سکتا ہوں یا نہیں۔ ترک ثمرہ ہی ہمارے اعمال کا معیار ہے۔ اس معیار کے مطابق نفسانی اعمال خود بخود قابل ترک ثابت ہوجاتے ہیں، ان کا تو سنیاس ہی مناسب ہے۔ بقیہ جو نیک ستوگنی اعمال ہیں، انہیں بلا نخوت بے لوثی سے کرنے چاہیئیں۔ نفسانی اعمال کا ترک کرنا بھی تو ایک فعل ہی ہوا۔ ترک ثمرہ کی قینچی اس پر بھی چلاؤ، پھر نفسانی اعمال کا ترک بھی بہ سہولت ہونا چاہیئے۔

اس طرح تین باتیں ہم نے دیکھیں۔ پہلی تو یہ کہ جو اعمال ہمیں کرنے چاہیئیں وہ ترک ثمر کے جذبہ سے پُر ہوں۔ دوسری یہ کہ رجوگنی تموگنی یعنی ممنوع و نفسانی اعمال ترک ثمرہ کی کسوٹی پر کستے ہی خود بخود ضائع ہوجاتے ہیں۔ تیسری یہ کہ اس طرح جو ترک عمل میں آجائے، اس پر بھی ترک ثمر کی قینچی چلاؤ۔ میں نے اتنا ترک کر دیا، ایسا گھمنڈ نہ ہونے دینا چاہیئے۔

رجوگنی اور تموگنی اعمال کیوں ترک کرنا چاہیئے؟ اس لئے کہ وہ بے عیب نہیں ہیں۔ بے عیب نہ ہونے سے عامل کے دل پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن کافی غور کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ ستوگنی اعمال بھی معیوب ہیں۔ جتنے بھی اعمال ہیں ان سب میں کچھ نہ کچھ عیب تو ہے ہی۔ کھیتی کے ہی فرض منصبی کو لیجئے، یہ ایک بے عیب اور ستوگنی فعل ہے۔ لیکن اس یگیہ سے لبریز کھیتی کے فرض منصبی میں بھی ہنسا تو شامل ہی ہے۔ ہل جوتنے میں بھی کتنے جاندار مرجاتے ہیں۔ کنوئیں کے پاس کیچڑ نہ ہونے دینے کی غرض سے اسے پکا تعمیر کرنے میں بھی کئی جاندار مرجاتے ہیں۔ صبح دروازہ کھولتے ہی آفتاب کی روشنی مکان کے

اندر داخل ہو جاتی ہے، اس سے بے شمار جاندار فنا ہو جاتے ہیں۔ جسے ہم صفائی کرنا کہتے ہیں، وہ بھی ایک مارنے کا ہی کام ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جب ستوگنی فرض منصبی کا عمل بھی معیوب ہو جائے، تب کیا کیا جائے؟

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جملہ صفات کی ترقی تو ہنوز باقی ہے۔ گیان، بھگتی، سیوا اہنسا کا بھی صرف شمہ برابر ہی ہم کو تجربہ ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پورے کا پورا تجربہ ہو چکا ہے۔ دُنیا کو تجربہ ہوتا جاتا ہے اور آگے بڑھتی جاتی ہے۔ وسطی زمانہ میں ایک ایسا خیال پیدا ہو گیا تھا کہ کھیتی میں ہنسا ہوتی ہے، اس لئے غیر متشدد انسان اُسے اختیار نہ کریں، بلکہ تجارت کریں۔ ایسا خیال ہو گیا تھا کہ غلہ پیدا کرنا گناہ ہے مگر کہتے تھے کہ اس کا بیچنا گناہ نہیں ہے، لیکن اس طرح کام ٹالنے سے اپنا بھلا نہ ہوگا۔ اگر انسان اس طرح کوتاہی عمل کرتا رہا تو آخر میں وہ خود معدوم ہو جائے گا۔ اعمال سے چھٹکارا پانے کا جوں جوں خیال انسان کرے گا توں توں علمیات کی توسیع زیادہ ہوتی جائے گی۔ آپ کے اس غلہ کی تجارت کے لئے کیا کسی کو کھیتی نہ کرنی پڑے گی؟ تو کیا اس کھیتی سے ہونے والے تشدد میں آپ کی شرکت نہ ہوگی؟ اگر کپاس پیدا کرنا گناہ ہے، تو اس پیدا شدہ کپاس کو بیچنا بھی گناہ ہے۔ کپاس پیدا کرنے میں کچھ عیب ہے، تو اس لئے اس کام کو ہی ترک کر دینا فتور عقل کہلائے گا۔ سب اعمال کا ترک کر دینا، یہ کام بھی نہیں وہ کام بھی نہیں کچھ بھی نہ کرو، ایسا نظریہ اختیار کر لینے پر یہی کہنا پڑے گا کہ سچا جذبہ ہمدردی باقی نہیں رہا۔ بالکل فنا ہو گیا۔ پتے نوچنے سے درخت نہیں مرتا۔ اس کے برخلاف وہ نئی پتیاں دینے لگتا ہے۔ کوتاہی عمل میں یقیناً کوتاہی روح ہی ہوتی ہے۔

(۱۰۳) عمل سے چھوٹنے کا سچا طریقہ

اب سوال یہ ہے کہ اگر سبھی اعمال میں کچھ نہ کچھ عیب ہے، تو پھر سب کاموں کو چھوڑ ہی کیوں نہ دیں؟ اس کا جواب پہلے ایک بار دیا جا چکا ہے۔ سارے اعمال کا ترک یہ تصور نہایت دلکش دلفریب ہے، مگر یہ بے شمار اعمال آخر ہم ترک کریں کیسے؟ راجسی و تامسی اعمال کے ترک کرنے کا جو طریقہ ہے، کیا وہی ساتوِکی اعمال کے لئے بھی موزوں ہوگا؟ جن ساتوِکی اعمال میں کچھ عیب ہے ان سے کیسے نجات ملے؟ ثمرہ تو یہ ہے کہ "اندر اے تکشکائے" کی طرح جب انسان عمل کرنے لگتا ہے تب غیر فانی ہونے کی وجہ سے اندر تو مرتا ہی نہیں بلکہ تکشک بھی نہ مرتے ہوئے اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ ساتوِک اعمال میں اچھائی زیادہ ہے، خرابی کم ہے۔ لیکن تھوڑی سی خرابی کے باعث اگر اس خرابی کے ساتھ اچھائی کو بھی ضائع کرنا چاہو گے، تو مضبوط ہونے کے باعث نیک کرداری تو ضائع نہ ہوگی، مگر خرابی ضرور بڑھتی چلی جائے گی۔ ایسے مخلوط غیر امتیازی ترک سے نیک کردار اندر تو مرتا ہی نہیں، لیکن بدکردار تکشک جو کہ مر سکتا تھا، وہ بھی نہیں مرتا اس لئے اُن کے ترک کا کیا طریقہ ہو؟ بلی ہنسا کرتی ہے اس لئے اس کو دُور رکھیں گے تو چوہے ہنسا کرنے لگیں گے۔ سانپ ہنسا کرتے ہیں اس لئے اگر انہیں دور کریں تو سینکڑوں جاندار کھیتی کو برباد کر ڈالیں گے۔ کھیتی کا غلہ ضائع ہونے سے ہزاروں آدمی مر جائیں گے۔ اس لئے عمل ترک میں بھی امتیاز ہونا چاہئے۔

گورکھ ناتھ سے مچھندر ناتھ نے کہا ــــ "اس لڑکے کو دھو ڈالو" گورکھ ناتھ نے لڑکے کے پاؤں پکڑ کر اسے پتھر پر پچھاڑ ڈالا اور

کنارے پر سوکھنے ڈال دیا۔ چھندر ناتھ نے پوچھا "لڑکے کو دھولائے"
گورکھ ناتھ نے جواب دیا 'ہاں' دھو دھا کر سوکھنے ڈال دیا ہے۔ لڑکے کو کیا اس طرح دھویا جاتا ہے! کپڑے اور انسان کے دھونے کا طریقہ یکساں نہیں ہے۔ دونوں طریقوں میں بڑا فرق ہے اس لئے رجوگنی اور تموگنی اعمال کے ترک اور ستوگنی اعمال کے ترک میں بڑا فرق ہے۔ ستوگنی اعمال کے ترک کا طریقہ جداگانہ ہے۔

بلا امتیاز کام کرنے سے سب درہم برہم ہو جائے گا۔ نکارام نے کہا ہے
تیاگ سے جو عجیب تر بھوگ آگئے تو تب ہے داتا میں کیا کروں

چھوٹا سا تیاگ کرنے جاتے ہیں تو کوئی دوسرا بڑا عیش آ کر چھاتی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس لئے وہ چھوٹا سا تیاگ بھی فضول ہو جاتا ہے۔ چھوٹے سے تیاگ کی تکمیل کے لئے بڑے بڑے محل بناتے ہیں۔ اس سے تو وہ جھونپڑی ہی اچھی تھی۔ وہی کافی تھی۔ لنگوٹی لگا کر چاروں طرف دولت بٹورنے سے تو کرمنا اور بنڈی ہی اچھی تھی۔ اس لئے بھگوان نے ستوگنی اعمال کے تیاگ کا طریقہ ہی جداگانہ بتایا ہے۔ وہ تمام ستوگنی اعمال تو انجام دیتے ہیں، لیکن ان کے پھلوں کو توڑ ڈالنا ہے۔ کچھ اعمال تو بنیادی اصول سے ہی ترک کرنے کے لائق ہیں اور کچھ کے صرف پھل قابل ترک ہوتے ہیں۔ جسم پر اگر کوئی بدنما داغ پڑ جائے، تو اس کو دھو کر مٹایا جا سکتا ہے لیکن اگر کھال کا رنگ ہی کالا ہے، تو اس پر سفیدہ لگانے سے کیا حاصل۔ وہ کالا رنگ جیوں کا تیوں رہنے دو۔ اس کی طرف دھیان ہی کیوں دیتے ہو۔ اسے منحوس نہ سمجھو۔

ایک آدمی تھا اسے اپنا گھر منحوس لگنے لگا تو وہ ایک گاؤں میں چلا گیا وہاں بھی اسے گندگی دکھائی پڑی تو وہ جنگل میں چلا گیا جنگل میں ایک آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھا ہی تھا کہ ایک پرندہ نے اس کے سر پر بیٹ کر دی "یہ جنگل بھی منحوس ہے" یہ کہہ کر وہ ندی

میں جا کھڑا ہوا۔ ندی میں جب اس نے بڑی مچھلیوں کو چھوٹی مچھلیاں کھاتے دیکھا تب تو اسے بڑی نفرت ہوئی۔ کہنے لگا کہ "اے یہاں سے بھی چلو دنیا ہی منحوس ہے یہاں مرے بغیر نجات نہیں" ایسا ارادہ کر کے وہ پانی سے باہر آیا اور آگ جلائی۔ تب تک ایک نیک مرد ادھر سے گذرے اور پوچھا "بھائی یہ مرنے کی تیاری کس لئے ؟" اس نے جواب دیا "یہ دنیا بڑی منحوس ہے"۔ تو وہ نیک مرد بولا "تیرا یہ گندہ جسم اور چربی جب جلنے لگے گی تو کتنی بدبو پھیلے گی ! ہم یہاں پاس ہی رہتے ہیں تب ہم کہاں جائیں گے ؟ ایک بال کے جلنے سے ہی کتنی بدبو آتی ہے پھر تیری تو ساری چربی جلے گی۔ یہاں کتنی گندگی پھیل جائے گی اس کا بھی تو کچھ خیال کر"۔ تب وہ آدمی پریشان ہو کر گھبرا اٹھا اور بولا "اس دنیا میں نہ جینے کی گنجائش ہے اور نہ مرنے کی ہی تو اب کیا کروں !"

غرض یہ کہ "منحوس ہے نامبارک ہے" ایسا کہہ کر سب کچھ ترک کر دیں گے تو کام نہیں چلے گا۔ اگر تم چھوٹے کام سے بچنا چاہو گے، تو دوسرے بڑے کام سر پہ سوار ہو جائیں گے۔ اعمال باہری طور پر چھوڑ دینے سے نہیں چھوٹتے، جب کام بہت بہاؤ کی روانی میں ہو رہا ہے، اس کے خلاف عمل کرنے میں اگر کوئی اپنی طاقت ضائع کریگا اور بہاؤ کے خلاف جانا چاہے گا تو آخر میں وہ تھک کر بہاؤ کے ساتھ بہہ جائے گا۔ اس لئے بہاؤ کے موافق عمل کر کے ہی اسے پار اترنے کی ترکیب سوچنی چاہیئے۔ اس سے قلبی گندگی کم ہو جائے گی اور صفائی قلب ہوتی جائے گی۔ پھر بتدریج عمل خود بخود ضائع ہوتے جائیں گے۔ ترک افعال نہ ہوتے ہوئے بھی اعمال معدوم ہو جائیں گے۔ افعال ہوتے ہی رہیں گے، مگر اعمال غائب ہو جائیں گے۔

کرم اور کریا دونوں میں فرق ہے، مثلاً کسی جگہ بہت شور وغل مچ رہا ہو اور اسے بند کرانا ہے تو ایک سپاہی بڑے زور سے چلا کر کہتا ہے "شور بند کرو"، وہاں کا شور بند کرنے کے لئے اسے زور سے چلانے کی تیز کریا کرنی پڑی دوسرا کوئی آ کر چپ چاپ کھڑا ہو کر صرف اپنی انگلی اٹھا کر دکھائے گا تو اسی سے لوگ خاموش ہو جائیں گے۔ تیسرے آدمی کے صرف وہاں آ کر موجود ہو جانے سے ہی خاموشی طاری ہو جائے گی۔ ایک کو تیز کریا کرنی پڑی، دوسرے کی کریا نادر معتدل تھی اور تیسرے کی لطیف کریا عمل میں کمی ہوتی چلی گئی، لیکن تینوں میں لوگوں کو خاموش کرنے کا کرم یکساں ہوا۔ جیسے جیسے صفائی قلب ہوتی جائے گی ویسے ویسے کریا کی تیزی میں کمی ہوتی جائے گی۔ کریا تیز سے معتدل، معتدل سے لطیف، لطیف سے نابود ہوتی جائے گی۔ کرم ایک چیز ہے کریا دوسری۔ کرتا کو جو مرغوب ہے وہ کرم ہے ہی کرم کی تعریف ہے کرم صیغہ اول اور صیغہ دوم میں منقسم ہے لیکن کریا کیلئے آزاد مصدر کی علامت لگانی پڑتی ہے۔

کرم اور کریا میں جو فرق ہے اسے سمجھ لیجئے غصہ آنے پر کوئی بہت چلا کر اور کوئی بالکل ہی نہ بول کر اپنا غصہ دکھاتا ہے۔ گیانی کریا کچھ بھی نہیں کرتا۔ لیکن کرم بے پایاں کرتا ہے۔ اس کا وجود محض ہی بے انتہا بہبودی عوام کا موجب ہوتا ہے ایسے انسان کا وجود ہی کافی ہے اس کے ہاتھ پیر وغیرہ بظاہر کچھ کام نہ کرتے ہوں تاہم وہ کام کرتا ہے۔ ایک طرف عمل لطیف ہوتا جاتا ہے، تو اس کے خلاف دوسری طرف افعال بڑھتے جاتے ہیں۔ خیال کی اس روانی کو اور آگے بڑھائیے اسی طرح اگر مکمل طریقہ پر بیکاری کی تاب حاصل ہو گئی، تو ایسا کہہ سکتے ہیں کہ آخر میں عملی شکل معدوم ہو کر بے انتہا

افعال ہوتے رہیں گے۔ پہلے تیز، پھر تیز سے معتدل، پھر معتدل سے لطیف اور لطیف سے نابود۔ اس طرح خود بخود عمل معدوم ہو جائیگا۔ مگر ایسی حالت میں بے انتہا افعال خود بخود ہوتے رہینگے۔ یا یہی افعال ترک کر دینے سے وہ معدوم نہیں ہوں گے۔ ترک خواہش کے جذبہ سے کام کرتے ہوئے بتدریج اس کا تجربہ ہوگا۔ براؤننگ شاعر کی "ڈھونگی پوپ" نامی ایک نظم ہے۔ ایک آدمی نے پوپ سے پوچھا "تم اپنے کو اتنا سجاتے کیوں ہو یہ اچھے کس لئے، یہ اوپری ڈھونگ کیوں؟ یہ سنجیدہ صورت کس لئے؟" اس نے جواب دیا "میں یہ سب کیوں کرتا ہوں سنو، اس لئے کہ ممکن ہے کہ اس ناٹک اس نقل کو کرتے کرتے کسی دن انجان میں ہی ایمان خدا باطن نشین ہو جائے اس لئے ترک خواہش کے جذبہ سے اعمال کرتے رہنا چاہئے۔ پھر دھیرے دھیرے عمل بھی معدوم ہو جائے گا۔

(۱۰۴) سادھک کے لئے سودھرم کا حل

مطلب یہ کہ تامسی ور اجسی اعمال تو بالکل ترک کر دینا چاہیئے اور ساتوک افعال کرنے چاہئیں اور یہ امتیاز ہونا چاہیے کہ جو ساتوک افعال بآسانی وفطری طور سے سامنے آجائیں وہ قدرے باعیب ہوتے ہوئے بھی قابل ترک نہیں ہیں۔ عیب ہو تو ہوا کرے۔ اس عیب سے نجات چاہو گے تو دوسرے بے شمار عیوب آدامن گیر ہوں گے۔ اپنی بھدی ناک جیسی ہے ویسی ہی اسے رہنے دو اسے کاٹ کر اگر خوبصورت بنانے کی کوشش کروگے تو اور بھی خوفناک اور بھدی ہو جائے گی۔ وہ جیسی تھی ویسی ہی اچھی ہے۔ ساتوک افعال قدرے باعیب ہوتے ہوئے بھی فطری طور پر حاصل ہونے کے باعث قابل ترک نہیں۔ انہیں

کرنا ضروری ہے مگر ترک ثمر کے ساتھ۔

ایک بات اور ہے جو کام فطری طور سے سہل الحصول نہ ہوئے ہوں اور تم محسوس کرو کہ وہ اچھی طرح کئے جا سکتے، تو کبھی انہیں نہ کرو۔ اتنے ہی کام کرو جتنے بآسانی ہمیں فطری طور سے انجام دینا چاہیے اکھاڑ پچھاڑ، دوڑ دھوپ کر کے دوسرے سے نئے کاموں کے چکر میں نہ پڑو جن کاموں کو خاص طور پر جوڑ توڑ لگا کر انجام دینا پڑے وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں ان سے دور رہو ان کا لالچ مت کرو جو کام سہل الحصول ہیں انہیں کے پھل کو ترک کیا جا سکتا ہے اگر اس لالچ سے کہ یہ کام اچھا ہے وہ کام بھی اچھا ہے۔ انسان چاروں طرف دوڑنے لگے، تو ترک ثمر کیسے ممکن ہو سکیگا؟ اس سے تو ساری زندگی ہی ایک بلائے عظیم ہو جائے گی۔ پھل کی امید سے وہ غیر مناسب کاموں کو کرنا چاہے گا اور پھل کبھی ہاتھ سے کھو بیٹھے گا۔ زندگی میں کہیں بھی استقلال نصیب نہ ہوگا۔ اس کام کی طمع نقش باطن ہو جائے گی۔ اگر ساتوک افعال کی بھی طمع پیدا ہو تو اسے بھی دور کر دینا چاہیے۔ ان مختلف اقسام کے ستوگنی افعال کو اگر کرنا چاہو گے تو ان میں بھی رجوگن اور تموگن پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے تم وہی کرو جو تمہارا ساتوک فطری اور سہل الحصول فرض منصبی ہے۔

سودھرم میں سودیشی دھرم، قومی دھرم، اور اپنے زمانہ کا دھرم شامل ہیں۔ یہ تینوں مل کر سودھرم بنتے ہیں۔ میری طبیعت کے موافق اور مطابق کیا ہے اور کون سا کام مجھے کرنے کو ملا ہے، سودھرم طے کرتے وقت یہ سب غور کرنا پڑتا ہے۔ تم میں، تم پن، جیسی کوئی چیز ہے اس لئے تم، تم ہو ہر فرد کی اپنی کچھ خصوصیت ہوتی ہے۔ بکری کا عروج بکری بنے رہنے ہی میں ہے۔ بکری رہ کر ہی اسے اپنا عروج مکمل کر لینا چاہیئے۔ بکری اگر گائے بننا چاہے تو ناممکن ہے وہ اپنا قدرتی بکری پن ترک نہیں۔

کر سکتی۔ اس کے لئے اسے جسم چھوڑنا پڑے گا۔ نیا دھرم اور نیا جنم اسے اختیار کرنا پڑے گا۔ مگر اس جنم میں تو اس کے لئے بکری پن ہی مفید ہے۔ بیل اور مینڈک کی کہانی مشہور ہے۔ مینڈک کے بڑھنے کی ایک حد ہے۔ وہ بیل کی برابر بڑھنے کی کوشش کرے گی تو مر جائے گی۔ دوسروں کی صورت شکل کی نقل کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ اسی لئے پر دھرم (دوسرے کا دھرم) اختیار کرنا خطرناک بتایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ سودھرم کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک بدلنے والا اور دوسرا نہ بدلنے والا۔ میں آج ہوں وہ کل نہیں اور جو کل ہوں گا وہ پرسوں نہیں۔ میں مسلسل ہر لمحہ بدل رہا ہوں۔ بالیدگی بچپن کا سودھرم ہے۔ جوانی میں مجھ میں پورے طور سے کام کرنے کی قوت رہے گا تو اس کے ذریعہ میں سماج کی خدمت کروں گا۔ بڑھاپے میں میرے گیان کا فائدہ دوسروں کو ہو سکے گا۔ اس طرح کچھ سودھرم تو بدلنے والا ہے اور کچھ بالکل نہ بدلنے والا۔ انہیں کو اگر ہم اپنے شاستری ناموں سے پکارنا ہو تو ہم کہیں گے کہ انسان کے ورن دھرم ہیں اور آشرم دھرم ہیں۔ ورن، منتخب شدہ دھرم نہیں بدلتا۔ گو آشرم دھرم بدلتے رہتے ہیں۔

آشرم دھرم کے بدلتے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ برہمچاری پن ترک کر کے میں گرہست بن رہا ہوں۔ گرہستی سے بان پرستھ اور بان پرستھ سے سنیاسی ہو جاتا ہوں۔ اس طرح آشرم دھرم بدلتے رہتے ہیں، مگر ورن دھرم بدلے نہیں جا سکتے۔ اپنے قدرتی حدود سے میں تجاوز نہیں کر سکتا۔ اس کی کوشش ہی فضول ہے۔ تم میں جو "تم پن" ہے اسے تم ترک نہیں کر سکتے۔ یہی ورن دھرم کی دیوار ہے۔ ورن دھرم کا تصور بڑا دلکش ہے۔ کیا ورن دھرم بالکل اٹل ہے؟ لوگ پوچھتے ہیں کہ جیسے بکری کا بکری پن، گائے کا گئے پن ہے کیا ویسے ہی برہمن کا برہمن پنا

اور چھتری کا چھتری بنا ہے۔ ہاں میں مانتا ہوں کہ ورن دھرم اتنا پکا نہیں ہے لیکن ہمیں اس کا راز سمجھ لینا چاہیئے۔ ورن دھرم لفظ کا استعمال جب سماجی نظام کی ایک ترکیب کے معنی میں کیا جاتا ہے تو اس کے مستثنیات بھی ضرور ہوں گے۔ ایسے مستثنیات قابل اختیار ماننے ہی پڑتے ہیں۔ گیتا نے بھی ایسے مستثنیات کو تسلیم کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان دونوں طرح کے دھرموں کو پہچان کر دوسرے دھرم کتنے ہی دلکش کیوں نہ ہوں تب بھی ان کے چکر میں نہ پڑو۔

(۱۰۵) ترکِ ثمر کا ماحصل

ترک ثمر کے تخیل کی جو تشریح ہم کرتے آئے ہیں اس سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:۔

۱۔ رجوگنی و تموگنی افعال کا مکمل ترک۔

۲۔ اس تیاگ کا بھی ترک ثمر اس کا بھی گھمنڈ نہ ہو۔

۳۔ ستوگنی کرموں کا ظاہرا تیاگ نہ کرتے ہوئے صرف پھل تیاگ

۴۔ ستوگنی کام قدرے باعیب ہوتے ہوئے بھی ترک ثمر کے ساتھ انجام دینا۔

۵۔ ترک ثمر کے ساتھ ان ستوگنی کاموں کو مسلسل کرتے رہنے سے قلب صاف ہوتا جائے گا اور تیز سے معتدل، معتدل سے لطیف اور لطیف سے نابود۔ اس طرح ہر کریا کا اختتام ہو جائے گا۔

۶۔ عمل معدوم ہو جائے گا لیکن مفاد عام کے کام ہوتے ہی رہیں گے۔

۷۔ وہی ستوگنی کام بھی کریں جو فطری طور پر لازم ہوں لیکن جو بآسانی عمل میں نہ آسکیں وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں ان سے دور ہی رہنا چاہیئے۔ ان کی طمع نہ ہونا چاہیئے۔

۸۔ سہل الحصول سودھرم بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ تغیر پذیر و مستقل

ورن دھرم نہیں بدلتا لیکن آشرم دھرم بدلتا رہتا ہے۔ بدلنے والا سودھرم بدلنا چاہیے اس سے فطرت کی پاکیزگی حاصل ہوگی۔

فطرت مسلسل رواں رہنی چاہیئے۔ چشمہ اگر بہتا نہ رہے گا تو اس سے بدبو آنے لگے گی۔ یہی حال آشرم دھرم کا ہے۔ انسان کو پہلے کنبہ ملتا ہے۔ اپنی ترقی کے لئے وہ خود کو کنبہ کی بندشوں میں باندھ دیتا ہے یہاں وہ طرح طرح کے تجربات حاصل کرتا ہے لیکن اگر وہ کنبے کا ہو کر رہ جائیگا تو تباہ ہو جائیگا۔ کنبے میں رہنا جو پہلے دھرم تھا وہی اب ادھرم ہو جائیگا۔ کیونکہ اب وہ دھرم بندشوں میں ڈالنے والا ہو گیا۔ تغیر پذیر دھرم کو اگر باعث لوٹ ترک نہ کیا تو اس کا انجام خوفناک ہو گا۔ اچھی چیز کے لئے کبھی لوٹ نہ ہونا چاہیئے۔ لوٹ سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ دق کے جراثیم اگر غفلت سے پھیپھڑے میں پہونچ گئے، تو وہاں جا کر اندر ہی اندر زندگی تباہ کر دیتے ہیں اسی طرح لوٹ کے جراثیم بھی اگر غفلت سے ستوگنی اعمال میں پہونچ گئے تو اس سے سودھرم سڑنے لگے گا۔ اس ستوگنی دھرم میں بھی رجوگن وتموگن کی بدبو آنے لگے گی۔ اس لئے یہ کنبے والا تغیر پذیر سودھرم مناسب وقت پر بدل جانا چاہیئے۔ یہی بات ملکی دھرم کے لئے بھی ہے ملکی دھرم میں بھی اگر لوٹ شامل ہو گیا اور صرف اپنے ہی ملک کی بہبودی کا خیال ہونے لگے تو ایسی ملک پرستی بھی بڑی خطرناک شئے ثابت ہو گی۔ اس سے روحانی ترقی رک جائیگی اور دل میں اگر لوٹ نے جگہ کرلی تو باعث تباہی ہو گا۔

(۱۰۶) سادھنا کی معراج ہی تکمیل ہے

خلاصہ یہ کہ اگر ثمرۂ زیست حاصل کرنا چاہتے ہو تو ترک ثمرکے چینتامنی کو اپنا لو۔ وہ تمہاری رہنمائی کریگا۔ ترک ثمر کا اصول اپنی حدود بھی بتاتا ہے۔ اس چراغ کے قریب آنے پر یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ کیسا

کام کریں اور کیا نہ کریں اور کونسا کب بدلیں۔ لیکن اب ایک دوسرے موضوع پر غور کرنا ہے۔ سارے اعمال کے معدوم ہو جانے کی جو آخری منزل ہے اس پر عامل کو دھیان رکھنا چاہیئے یا نہیں؟ کیا عامل کو گیانی کی اس منزل پر نگاہ رکھنا چاہیئے جس میں عمل نہ ہوتے ہوئے بھی بے شمار افعال ہوتے رہتے ہیں؟

نہیں۔ یہاں بھی ترک ثمر کی کسوٹی کا استعمال کرو۔ ہماری زندگی کی کیفیت اتنی اچھی ہے کہ جو چیز ہمارے لئے مناسب ہے، وہ ہمیں حاصل ہو جائیگی خواہ ہمیں اس کی خواہش نہ بھی ہو۔ زندگی کا عظیم ترین ثمرہ موکش (نجات) ہے۔ اس موکش یعنی اعدام عمل کی منزل کی بھی ہمیں طمع نہ رہے۔ وہ کیفیت تو ہمیں خود بخود بلا جانے ہی حاصل ہو جائے گی۔ سنیاس کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں کہ وہ بجکرہ منتر پر یکایک حاصل ہو جائیگی سنیاس کوئی مشینی چیز نہیں ہے تمہارے دور حیات میں اس کی ترقی کس طرح ہوتی جائے گی اس کا تم کو پتہ کبھی نہ چلے گا۔ اس لئے موکش کی فکر چھوڑ دو۔

بھگت تو خدا سے ہمیشہ یہی کہتا ہے "میرے لئے تمہاری بھکتی ہی کافی ہے۔ نجات یعنی آخری ثمر مجھے نہیں چاہیئے۔" مکتی بھی تو ایک طرح کی لذت کی ہی چیز ہے۔ موکش ایک قسم کا عیش ہی تو ہے، ایک ثمرہ ہی تو ہے۔ اس نجاتی ثمرہ پر بھی ترک ثمر کی قینچی چلاؤ۔ مگر ایسا کرنے میں موکش کہیں چلا نہ جائے گا۔ قینچی البتہ ٹوٹ جائے گی اور ترک اور بھی پختہ ہو جائیگا جب موکش کی توقع ہی چھوڑ دو گے، تب ہی بلا جانے موکش کی طرف چلے جاؤ گے۔ محو ریاضت اس قدر ہو جاؤ کہ موکش کی یاد ہی نہ رہے۔ اور وہ خود تمہیں تلاش کرتی ہوئی تمہارے سامنے آ کھڑی ہو۔ عامل کو تو اپنے عمل میں ہی رنگ جانا چاہیئے۔

بھگوان نے شروع میں ہی کہا تھا کہ اعدام عمل کی منزل نجات کا بھی لوبھ نہ آ جائے۔

اب پھر آخر میں کہتے ہیں، میں نجات دے سکتا ہوں، تم اس کی فکر نہ کرو صرف اعمال پر دھیان رکھو۔

موکش کو بھول جانے سے اعمال اعلیٰ و افضل ہوں گے اور موکش تمہاری عاشق بن کر تمہارے پاس آجائیگی۔ موکش کی خواہش نہ رکھو کہ اپنے اعمال میں محو رہنے والے عامل کے گلے میں موکش کی بخشی کامیابی کا ہار پہنائی ہے۔

جہاں کمال اعمال ہے وہیں کامیابی دست بستہ کھڑی رہتی ہے جیسے گھر پہنچنا اگر وہ پیڑ کے نیچے کھڑا رہ کر "گھر گھر" چلاتا رہیگا تو اس سے یقیناً گھر تو دور ہی رہیگا بر خلاف اس کے اسے جنگل میں ہی قیام کرنے کی نوبت آجائیگی۔ گھر کو یاد کرتے ہوئے اگر راستہ میں آرام کرنے لگو گے تو آخری منزل راحت سے دور رہ جاؤ گے یعنی تو چلتے ہی رہنا چاہیئے جس سے ہم ایکدم منزل پر پہنچ جائینگے۔ موکش کی بیکار تکرار سے ہمارے اعمال میں، ہماری ریاضت میں نا اہلی پیدا ہو جائیگی اور موکش مجھ سے دور ہی رہیگی موکش کی پرواہ نہ کر کے مسلسل کام میں مشغول رہنا ہی موکش کو پاس بلانے کا وسیلہ ہے۔

اعدام عمل کی کیفیت یعنی سکون کی ہوس نہ رکھو۔ ریاضت کی محنت سے ہی نجات حاصل ہوگی۔ جواب جواب چلانے سے سوال کا جواب نہیں ملتا اس کا جو طریقہ مجھے دستیاب ہوا ہے اسی سے سلسلہ وار جواب ملے گا۔ وہ طریقہ جہاں ختم ہوتا ہے وہیں اس کا جواب موجود ہے۔ اختتام سے پہلے خاتمہ کیسے ہو سکتا ہے؟ طریقہ سے پہلے جواب کیسے ملے گا؟ منزل ریاضت منزل تکمیل نہیں ہو سکتی۔ پانی میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے اگر دوسرے کنارے کے لطف کا دھیان رہیگا تو کام کیسے چلے گا؟ اس وقت تو ایک ایک ہاتھ مار کر آگے جانے میں ہی سارا دھیان اور ساری طاقت لگانی چاہیئے۔ پہلے عمل کو پورا کرو سمندر کو پار کرو۔ نجات خود بخود حاصل ہو جائے گی۔

(۱۰۷) کامل کی ٹھہری کیفیت

گیانی کے سارے اعمال آخر میں معدوم ہو جاتے ہیں۔ درجہ منتہی کو پہنچ جاتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آخری حالت میں عمل ہوگا ہی نہیں۔ اس کے ذریعہ عمل ہوگا اور نہیں بھی ہوگا۔ آخری کیفیت نہایت ہی دلکش اور عظیم ہوگی۔ اس حالت میں جو کچھ بھی ہوگا اس کی فکر نہیں ہوتی۔ جو کچھ بھی ہوگا وہ اچھا اور بہتر ہی ہوگا۔ ریاضت کی انتہائی بلندی پر وہ کھڑا ہے۔ یہاں سب کچھ کرتے ہوئے بھی وہ کچھ نہیں کرتا۔ مارتے ہوئے بھی وہ نہیں مارتا۔ بھلائی کرتے ہوئے بھی وہ بھلائی نہیں کرتا۔

یہ آخری حالت نجات ہی عامل کے ریاضت کی معراج ہے۔ ریاضت کے معراج کے معنی ہیں سہل العمل کی کیفیت ایسی حالت میں یہ خیال ہی نہیں رہتا کہ میں کچھ کر رہا ہوں۔ ورنہ اس حالت کو عامل کے ریاضت کا عدم اخلاق کہوں گا۔ درجہ کمال میں اخلاقی قواعد کی پابندی نہیں ہے۔ چھوٹا بچہ سچ بولتا ہے، لیکن اخلاقی اصول سے نہیں، کیونکہ وہ جانتا ہی نہیں کہ جھوٹ کیا شئے ہے۔ جھوٹ سے واقفیت رکھ کر سچ بولنا اخلاقی فعل ہے۔ درجۂ کمال میں جھوٹ کا گذر ہی نہیں۔ یہاں تو راستی ہی راستی ہے اس لئے وہاں اخلاق کی سی کوئی چیز نہیں۔ غیر مناسب شئے کو وہاں قیام نہیں جو سننے لائق نہیں ہے، وہ کان کے اندر جاتا ہی نہیں۔ جو دیکھنا نہیں چاہیئے، وہ آنکھیں دیکھتی ہی نہیں۔ جو ہونا چاہیے، وہی ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ اس کے لئے کوشش نہیں کرنی پڑتی جسے ٹالنا چاہیئے، اُسے ٹالنا نہیں پڑتا خود بخود ٹل جاتا ہے۔ یہی کیفیت اخلاق سے مبّرا ہے۔ یہ جو عروج عمل یعنی سہل العمل کی کیفیت ہے اسے عدم اخلاق کہو یا اخلاق سے بالاتر۔ اس بالاتر اخلاق میں ہی

اخلاق کا عروج ہے۔ "اَنی نینکتا" (اخلاق سے بالاتری) لفظ مجھے خوب سوجھا۔
اس کیفیت کو ستوگنی ریاضت کا عدم اقتدار کہہ سکتے ہیں۔

اس کیفیت کو کیسے بیان کیا جائے؟ جس طرح گرہن کے پہلے اس کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح موت کے بعد کی نجات کے آثار قبل از مرگ ہی نمایاں ہونے لگتے ہیں جسمانی حالت میں ہی نجات آئندہ کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس کیفیت کو بیان کرتے زبان لڑکھڑاتی ہے۔ وہ کتنا بھی تشدد کرے پھر بھی کچھ نہیں کرتا۔ اس کا عمل کس پیمانے سے ناپا جائے؟ جو کچھ عمل اسکے ذریعہ ہوگا وہ سب ستوگنی ہی ہوگا۔ جملہ اعمال کے نابود ہو جانے پر بھی ساری دنیا کی بھلائی کرے گا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کیفیت کو کیسے بیان کیا جائے۔

اس آخری حالت میں تین کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ ایک بامدیو کی کیفیت۔ ان کا خاص جذبہ یہ ہے کہ اس عالم میں جو کچھ بھی ہے میں ہی ہوں۔ گیانی بے فکر ہو جاتا ہے اس کا خیال جسم ختم ہو جاتا ہے۔ سارے اعمال نابود ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ایک جذبۂ ممتائی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو ایک قالب میں نہیں سما سکتی۔ ایسے جذبہ کی کیفیت عملی کیفیت نہیں ہے۔ جذبۂ ممتائی کی کیفیت۔ یا یوں کہیے کہ جذبۂ ممتائی کے جوش کی کیفیت۔ اس کیفیت کا تھوڑا سا تجربہ ہم کو ہو سکتا ہے۔ بچے کے عیب کی وجہ سے ماں اپنے کو بھی معیوب سمجھتی ہے۔ اس کے نیک اوصاف کی وجہ سے وہ بھی نیک بنتی ہے۔ اسکے دکھ سے دکھی، اس کے سکھ سے وہ سکھی ہوتی ہے۔ ماں کا یہ جذبۂ ممتائی صرف اولاد ہی تک محدود ہے۔ اولاد کے عیب کو وہ اپنا ہی عیب مان لیتی ہے۔ گیانی (عارف) بھی جذباتِ ممتائی کے جوش میں ساری دنیا کے عیوب کا ذمہ دار اپنے کو ٹھہرا لیتا ہے۔

ہر سہ عالم کے گناہوں کی وجہ سے وہ گنہگار اور ان کی نکوئی کی وجہ سے وہ نیک بنتا ہے اور ایسا ہونے پر بھی ہر سہ عالم کی بدیا نیک کرداری کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ودرسوزمیں رشی کہتے ہیں " یعنی مجھے جو دے، تل دے، گیہوں دے "۔ اس طرح مانگتے ہی رہنے والے رشی کا پیٹ آخر کتنا بڑا ہوگا؟ لیکن وہ مانگنے والا اسار نیتی ہاکھ کے جسم والا نہیں تھا۔ اس کی آتما بشکل عالم بولتی تھی اُسے میں " ویدک وشتو آتم بھاؤ " یعنی ویدوں کے مطابق ساری دنیا کو اپنانے کا جذبہ کہتا ہوں ویدوں میں اس جذبہ کا اوج نظر آتا ہے۔ گجراتی سنت نرسی مہتا کیرتن کرتے ہوئے کہتے ہیں " باپ جی باپ رے کول کیدھا ہشے نام لیتا نارول ندرا آوے " مطلب " اے خدا میں نے کون سے گناہ کئے ہیں جو حمد کرتے ہوئے بھی مجھے نیند آرہی ہے "۔ نیند کیا نرسی مہتا کو آرہی تھی؟ نیند تو سامعین کو آرہی تھی لیکن ان سے ہم آہنگ ہو کر نرسی مہتا پوچھ رہے ہیں۔ یہ ان کے جذبۂ ہمتائی کی کیفیت ہے۔ گیانی کے جذبۂ ہمتائی کی کیفیت اسی طرح کی ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں جملہ نیک و بد اعمال اس کے ذریعہ ہوتے نظر آئیں گے وہ خود بھی یہی کہے گا وہ رشی کہتے ہیں نا۔ " کتنے ہی نامناسب فعل میں نے کئے ہیں کرتا ہوں اور کروں گا "۔ ایسے جذبات کی کیفیت آنے پر آتما پرندہ کی طرح پرواز کرنے لگتی ہے اور تب وہ مادیت سے آگے نکل جاتی ہے۔

اس جذبۂ ہمتائی کی کیفیت کی مانند گیانی کی ایک کیفیت عملی بھی ہوتی ہے۔ گیانی فطرتاً کیا کرے گا، وہ جو کچھ کرے گا ستوگنی ہی ہوگا۔ گو وہ انسانی قالب میں محدود ہے، تاہم اس کا سارا جسم اس کے سارے حواس ستوگنی بن گئے ہیں، جس کے باعث اس کے جملہ اعمال ستوگنی ہوں گے۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے اگر دیکھیں تو انتہائی درجہ کا ستوگن اس کے برتاؤ

میں دکھائی دے گا۔ یعنی اگر "وشو آتم بھاؤ" یعنی عالم کو اپنا بنالنے کے نظریہ سے دیکھیں گے، تو گویا ہر سر عالم کی نیکی و بدی کرنے کے باوجود وہ ان سے علیحدہ رہتا ہے، کیونکہ جسمانی قالب کو اس نے اتار کر پھینک دیا ہے۔ ناچیز جسم کو اتار کر پھینکنے پر ہی وہ سارے عالم کو اپنا سکے گا۔

جذبۂ تنہائی اور عمل کی کیفیت کے علاوہ ایک تیسری کیفیت گیانی کی ہے اور وہ ہے، گیان کی حالت۔ اس حالت میں نہ وہ بدی برداشت کرتا ہے، نہ نیکی۔ سبھی کو دور رکھتا ہے۔ اس سارے عالم کو جلا کر خاک کر ڈالنے کے لئے وہ تیار رہتا ہے۔ کسی فعل کی ذمہ داری وہ اپنے سر نہیں لیتا۔ اس کا چھونا تک اسے گوارہ نہیں۔ گیانی کے "موکش" کی حالت میں اور ریاضت کی حالت میں یہ تین کیفیات ممکن ہیں۔

یہ عدم عمل کی کیفیت، یہ آخری کیفیت کیسے حاصل ہو؟ ہم جو بھی کام کرتے ہیں، ان کے عمل سے بری الذمہ رہنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ ایسا تصور کرو کہ میں محض ایک وسیلہ ہوں، آلۂ کار ہوں۔ فعل کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ سب سے عدم عمل کی تمہید و انکساری اختیار کرو۔ لیکن محض اسی سے ہم جملہ اعمال سے بری ہوجائیں گے، ایسا نہیں ہے۔ دھیرے دھیرے اس جذبہ کی ترقی ہوتی جائے گی۔ ایسا پہلے احساس کرو کہ میں نہایت ہی ناچیز ہستی ہوں، اس کے ہاتھ کا ایک کھلونا، کٹھپتلی ہوں۔ وہ مجھے نچاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ماننے کی کوشش کرو کہ جو کچھ بھی کیا جاتا ہے، اس کی تولید جسمانی ہے، اس سے میرا کوئی لگاؤ نہیں۔ یہ ساری حرکتیں

اس جسمِ فانی کی ہیں، لیکن میں فانی نہیں ہوں۔ میں " شَو" (لاش) نہیں بلکہ "شیو" ہوں، ایسا تصور کرتے رہو۔ جسم کی کثافت سے برائے نام بھی لگاؤ نہ رکھو۔ ایسا ہو جانے پر گویا قالبِ انسانی سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ بس، گیانی کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

ایسی حالت میں مذکورۂ بالا تین کیفیات واقع ہوں گی۔ پہلی اس کی عملی کیفیت، جس میں اس کے ذریعہ انتہائی پاک اور قابلِ تحسین اعمال ہوں گے۔ دوسری جذبۂ ہمتائی کی کیفیت، جسم میں ہر سہ عالم کی بد و نیک کرداری کی ذمہ داری وہ اپنے سر لے لیتا ہے، ایسا وہ محسوس کرے گا؛ لیکن اس سے ذرا بھی لگاؤ نہ ہوگا۔ تیسری، اس کی گیان کی کیفیت، جس میں وہ برائے نام بھی اعمال اپنے نزدیک نہ رہنے دے گا۔ جملہ اعمال کو نیست و نابود کر دے گا۔ ان تینوں کیفیات کے پیشِ نظر گیانی کی کیفیت بیان کی جا سکتی ہے۔

(۱۰۸) "... تو ہی ... تو ہی ... تو ہی ... تو ہی ..."

اتنا سب کہنے کے بعد بھگوان کرشن ارجن سے کہتے ہیں ——

" ارجن! میں نے یہ جو کچھ کہا ہے، اسے تم نے دھیان سے تو سنا ہی ہے نا؟ اب خوب سوچ سمجھ کر جو مناسب ہو، کرو ـــ" اس طرح بھگوان نے فراخ دِلی سے ارجن کو آزاد کر دیا۔ بھگوت گیتا کی یہی خصوصیت ہے۔ لیکن بھگوان کو پھر رحم آگیا اور عطیۂ آزادی کو انھوں نے پھر واپس لے لیا اور کہا ـــ" ارجن! اپنی خواہشات، اپنے اعمال اور اپنی ریاضت کو خیرباد کہہ کر میری پناہ میں آجاؤ ـــ" اس طرح

اپنی پناہ میں آنے کی ترغیب دے کر عطیۂ آزادی کو واپس لے لیا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ "تم اپنی طرف سے کوئی آزادانہ خواہش نہ پیدا ہونے دو، اپنی مرضی نہیں، بلکہ اس کی مرضی چلے، ایسا ہونے دو۔" مجھے آزادانہ طور پر یہی احساس ہونا چاہیئے کہ "یہ آزادی مجھے درکار نہیں۔ میں کچھ نہیں، سب کچھ تو ہی ہے۔" یہی تصور ہو۔ بکری زندہ رہنے کی حالت میں "میں، میں، میں ...." کرتی ہے۔ یعنی مَیں، مَیں، مَیں کہتی ہے، لیکن مرنے پر اس کی تانت بناکر دُھنکی میں لگائی ہے، تب دَادَو کہتا ہے "تُہی .... تُہی .... تُہی ...." توہی، توہی، توہی؛ ایسا وہ کہتی ہے۔ اب تو سب " توہی، توہی، توہی!"

اتوار ۱۹-۶-۳۲ء

تتمہ

شبہ کا ازالہ

●

"گیتا پروچن" کے دوسرے باب میں رجوگن اور تموگن کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر ایک صاحب نے اپنا ایک شبہ ونوباجی سے ظاہر کیا۔ حیدرآباد کے سروودے سفر سے ونوبا جی نے اس کا جواب دیا۔ پڑھنے والوں کے مفاد کے لئے شبہ اور جواب دونوں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

شبہ :- "گیتا پروچن" کے دوسرے باب میں کرم کرنے والوں کا دوہرا رجحان بتاتے ہوئے رجوگن اور تموگن کی تراجمی آپ نے کی ہے۔ "لوں گا تو پھل کے ساتھ ہی" یہ رجوگن کا رجحان بتلایا اور "چھوڑوں گا تو کرم کے ساتھ ہی" یہ تموگن کا رجحان بتلایا۔ دونوں رجحانوں میں فرق نہیں، یہی آپ کہتے ہیں۔ میرے خیال میں دونوں رجحانات رجوگن میں ہی کھپ جاتے ہیں۔ ۱، ۳، ۹ کے حساب سے تموگن، رجوگن اور ستوگن ایک دوسرے سے دور ہیں۔ رجوگن اور تموگن ایک رجحان کے رجحان "اثبات" اور "نفی" (POSITIVE & NEGATIVE) کی شکلیں رہی ہیں۔ کرم کرکے پھل کو چھوڑنا، ستوگن ہے۔ "لوں گا تو پھل کے ساتھ ہی" اور "چھوڑوں گا تو کرم کے ساتھ ہی" یہ دونوں رجوگن میں ہی کھپ

جاننے چاہئیں۔ " صرف پھل لوں گا، لیکن کرم نہیں لوں گا" یہ رجحان تموگن میں جائے گا۔ اس سے بھی مختلف ایک رجحان ہوسکتا ہے، وہ ہے لا پروائی (INDIFFERENCE) کا رجحان۔ کرم کیا تو کیا، ہوا تو ہوا؛ پھل کی امید، پروا، ضرورت، موہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے پھل آیا، لیا تو لیا؛ کرم کی ضرورت، جواب دہی نہیں معلوم ہوئی؛ یہ رجحان قلبی کیفیت کے مطابق شائد تینوں گنوں میں ہوسکتا ہے۔ جہالت کی کیفیت میں یہ رجحان تموگن سے بھی نیچے کا ہوگا اور دھیان مگن (مراقبہ) کی حالت میں ستوگنی رجحان سے بھی بلند ثابت ہوگا۔"

جواب :۔ تمہارا تفکر مجھے اچھا لگا۔ تینوں گنوں کے بارے میں طرح طرح سے سوچا گیا ہے اور سوچا جاسکتا ہے۔ تموگن سے نیچے یا ستوگن سے اوپر کے رجحان کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ساری دنیا کی تقسیم تین گنوں میں کی گئی ہے۔ تین گنوں سے علیحدہ ایک کیفیت ہے۔ اسے "گنا تیت" (گنوں سے بالاتر) انسان کی حالت سمجھنا چاہیئے۔ اس میں کسی قسم کا رجحان نہیں رہتا۔ اسی لئے اسے "نی ورتی" (نجات) کہتے ہیں۔ لیکن "نی ورتی" کا مطلب رجحان کی مخالفت نہیں ہے۔ رجحان کی مخالفت بھی ایک رجحان ہی ہے، اسے تموگن کہنا چاہیئے۔

اتنی تمہید کے بعد اب خاص سوال پر آؤ۔ حقیقتاً تینوں گن "پرکرتی" (مادہ) کے مرکبات ہیں۔ "پرکرتی" (مادہ) میں تینوں کی ضرورت یکساں ہے۔ استقامت، حرکت اور تجلی تینوں مل کر زندگی بنتی ہے۔ یہ مابعد الطبعی نظریہ ہے۔ اس میں اوپر، نیچے کی تفریق نہیں ہے۔

اس سے جدا اخلاقی نظریہ ہے۔ اس نظریہ سے تموگن، رجوگن اور

ستوگن، درجہ بدرجہ اونچے گن ہیں، عموماً لوگ اس نظریہ سے سوچتے ہیں۔
روح خلقت کو سمجھانے والا مادّی یا مابعد الطبعی اور دوسرا اخلاقی،
ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا، طریقت کا نظریہ ہے۔ اس کے مطابق تموگن
اور رجوگن ایک دوسرے کے ردِ عمل یا ممتحن یا معاون ہیں۔ دونوں مل کر
ایک ہی شئے ہیں۔ رجوگن کی تھکاوٹ سے تموگن آتا ہے، تموگن کی تھکاوٹ
سے رجوگن آتا ہے۔ دونوں سے ستوگن مختلف ہے اور وہی عاملوں کا
دوست ہے۔ رجوگن اور تموگن مِل کر ثروتِ شیطانی اور ستوگن سے ثروتِ
ملکوتی — ایسی جدو جہد چل رہی ہے۔
گیتا میں مادّی، اخلاقی و عملی تینوں طرح کی تنقیح کی گئی ہے۔ میں مادی
تصور کو ترک کر کے اخلاقی و عملی نظریہ سے بالخصوص سوچتا رہتا ہوں۔ کبھی
اخلاقی اور کبھی عملی، جب تنقیح کے بارے میں سوال پیدا ہوا ہے، اس لیے
عملی نظریہ ہے۔ اس لئے رجوگن اور تموگن کا یکجائی تصور کیا گیا ہے۔
ترکِ ثمر کے تصور کی زیادہ چھان بین "اِستھت پرگیہ درشن"
اور "گیتائی کوش" میں کی گئی ہے۔

गीता-प्रवचन

विनोबा

मूल्य : डेढ़ रुपया